

AUGUST 2011

ماہنامہ  
شا

PDFBOOKSFREE.PK







248	عین غین	231	فرزانہ سلیم	231	حنا کی محفل	248	حاصل مطالعہ
250	عبداللہ	235	تسلیم طاہر	235	خبرنامہ	250	بیاض
252	شمینہ احتشام	240	بلیس بھٹی	240	حنا کا دسترخوان	252	رنگ حنا
256	فوزیہ شفیق	244	صائمہ محمود	244	کس قیامت کے یہ نامے	256	میری ڈائری سے

چوہدری سردار محمود نے نواز پر تنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "حنا" 205 سرکلر روڈ سے شائع کیا،  
خط و کتابت کا پتہ 207 سرکلر روڈ محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ چوک اردو بازار لاہور، فون نمبر۔  
Monthly hina @ hot mail.com ای میل 37321690-37310797  
Monthly hina @ yahoo.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



81	گلاب رتوں کی نوید لائے مبشرہ ناز	7	روحی کنجاہی	7	دہ اک سایہ شجر	119	شمینہ شیخ
179	ماہیا مینوں یاد آؤندا	7	حفیظ تائب	7	تخمین اختر	218	قرۃ العین رائے
228	طیبہ ہاشمی	13	پرچھائیاں	8	سویٹی	228	سید اختر ناز
							پیارے نبی کی پیاری باتیں
							رمضان المبارک کے وظائف فوزیہ شفیق



96	محبوبوں میں حساب کیسا؟ مدیحہ تبسم	21	ابن انشاء	21	صبح امید شام وصال	122	یہ ملک ہمارا
----	-----------------------------------	----	-----------	----	-------------------	-----	--------------



22	ام مریم	46	سعدیہ عابد	46	میرے ساحر سے کہو	150	صبح امید	196	فوزیہ غزل



## حمد باری تعالیٰ

نعت رسول مقبول ﷺ

ہر اک امکان کا عنوان ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو  
بڑے تخلیق سماں ہیں تیرے رنگ اور تری خوشبو

ہر اک صورت سے ظاہر ہو رہی ہیں صورتیں کیا کیا  
عجب صورت پریشاں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

کہاں ہے راز ہر اک آنکھ روشن کیسے ہوتی ہے  
بہر سو نور افشاں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

مسلل پھونکتی رہتی ہیں شاخیں زندگانی کی  
فردغ باغ امکان ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

مگر نہ کچھ ثبوت اپنے بھی ہونے کا نہیں ملتا  
جواز اصل ایمان ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

زمین و آسمان میں ہے ہر اک جشن موسیقی  
ازل سے زمزمہ خواں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

جو چٹائی پہ جھکائے ہوئے سر بیٹھا ہے  
دین و دنیا کا وہ سلطان ہے سبحان اللہ

یاد ہے بات مجھے حضرت صدیقہ کی  
روحی کنجاہی آپ کا خلق بھی قرآن ہے سبحان اللہ

حفظ تائب

قارئین کرام! اگست 2011ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

14 اگست وہ دن جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا اور پاکستان ایک آزاد ملک کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرا "آزادی" ایک خوش کن لفظ، لیکن اس کے پیچھے قربانیوں کی ایک انتہائی طویل اور نہ ختم ہونے والی داستان پوشیدہ ہے، خون کا ایک بہت بڑا سمندر پار کر کے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے آزاد ملک میں قدم رکھا، جانے کتنے ہی بوڑھے اور جوان اس ملک کے حصول کے لئے راہ میں خاک تن ہوئے کہ "خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے بحر پیدا" بہر حال ایک سفر تمام ہوا اور ہم نے اپنا پیارا ملک حاصل کیا نعمتوں سے معمور آبشار، گنگائی ندیاں اور سر بلند کھلیاں سونا لگتی زر خیز زمین، یہ ہے ہمارا پیارا وطن پاکستان۔

آئیے یوم آزادی کے پر مسرت موقع پر اللہ تعالیٰ سے پاکستان کی بقائے دوام اور خوشحالی کے لئے دعا کریں اور یہ عہد کریں کہ وطن عزیز کے لئے کسی بھی قربانی کا دریغ نہیں کریں گے۔ اگست کے آغاز سے ہی رمضان المبارک بھی شروع ہو رہا ہے، رمضان المبارک کی خصوصی دعاؤں میں پاکستان کے تحفظ اور بقا کے لئے دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے وطن کو محفوظ و مامون رکھے اور ہم سب کو رمضان المبارک کی برکتوں اور رحمتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

عید نمبر:- اگست کا شمارہ عید نمبر شائع ہوگا قارئین اور مصنفین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی تحریریں اور عید سروے کے جوابات پندرہ اگست تک ادارے کو بھیجوا دیں۔

اس شمارے میں:- رمضان المبارک کے وظائف، سعدیہ عابد اور صبا جاوید کے ناول، مدیحہ تبسم اور ہما عامر کے ناول، مبشرہ ناز، شمینہ شیخ، تحسین اختر، قراۃ العین رائے اور طیبہ ہاشمی کے افسانے، ام مریم اور فوزیہ غزل کے سلسلے وارل ناولوں کے علاوہ حنا کے کئی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر  
سردار محمود



# چاندنی کی سیاری باتیں

## اسلام کی بنیاد

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور صاحب استطاعت کا بیت اللہ کا حج کرنا۔“ امت کا روزوں کی فرضیت پر اجماع ہے۔

روزوں کی فضیلت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث قدسی بیان فرمائی، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔  
”روزہ میرے لئے اور میں ہی اس کا جزا دوں گا۔“

## روزے کی اقسام

(صحیح مسلم) روزوں کی مندرجہ ذیل چار اقسام ہیں۔

- واجب روزے، جیسے رمضان المبارک، نذر اور کفارات کی ادائیگی کے روزے۔
- مستحب اور مندوب روزے، جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے، یعنی ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھنا، ہر قمری مہینے کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کا روزہ، پیر اور جمعرات کا روزہ، شوال کے چھ روزے، یوم عرفہ کا روزہ، ذوالحجہ کے 8 دنوں میں روزے، یوم عاشورہ کا روزہ، حرمت والے مہینوں اور ماہ۔

## شعبان کے روزے وغیرہ۔

- حرام اور ممنوع روزے، جیسے عورت کا خاوند کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر نفل روزہ رکھنا، رمضان المبارک سے پہلے شک کی بنا پر روزہ رکھنا، عید الفطر، عید الاضحیٰ اور ایام تشریق کے روزے، حاکمہ اور نفاس والی عورت کا روزہ۔
- مکروہ روزے، جیسے ہمیشہ روزہ رکھنا، صرف جمعے یا صرف ہفتے کے دن کا روزہ وغیرہ۔
- روزے کے فضائل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”ابن آدم کے ہر عمل (کے ثواب) میں اضافہ کیا جاتا ہے، نیکی کا ثواب دس گنا سے سات تو گنا بلکہ (اس سے بھی زیادہ) جتنا اللہ چاہے ملتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مگر روزہ (اس قانون سے مستثنیٰ ہے) کیونکہ وہ (خالصتا) میرے لئے ہوتا ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا، بندہ میری خاطر اپنی خواہشات اور کھانا ترک کرتا ہے، روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی روزہ کھولتے وقت (حاصل ہوتی ہے) اور ایک خوشی اپنے رب سے ملاقات کے وقت (حاصل ہوگی) اللہ کے ہاں رزق دار کے منہ کی بو کستوری کی مہک سے بھی زیادہ عمدہ ہے۔“

- فوائد و مسائل:-
- یہ بندوں پر اللہ کا خاص فضل ہے کہ بندہ اس کی توفیق سے جو نیکی کرتا ہے، اس کا ثواب

صرف ایک نیکی کے برابر دینے کی بجائے بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔  
”جو شخص نیکی لے کر حاضر ہوا، اس کے لئے اس کا دس گنا ہے۔“

حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن کی بیان کردہ یہ مقدار کم از کم ہے، ثواب اس سے کہیں زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔  
○ ثواب کی کثرت کا دار و مدار حسن نیت، اخلاص اور اتباع سنت پر ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان اس قدر عظیم الثبات تھا کہ ان کا اللہ کی راہ میں دیا ہوا دھیر غلہ بعد والوں کے احد پہاڑ برابر سونا خرچ کرنے سے افضل ہے، اس لئے ہر شخص کے حالات و کیفیات کے مطابق نیکی کا ثواب سنکڑوں گنا تک پہنچ سکتا ہے۔

○ عمل وہی قبول ہوتا ہے جو خالص اللہ کی رضا کے لئے کیا گیا ہو، ریا اور دکھاوے کی غرض سے کیا جانے والا عمل اللہ کے ہاں ناقابل قبول ہے، چونکہ روزے کا تعلق نیت سے ہوتا ہے اور دوسرے ظاہری اعمال، مثلاً نماز، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی نسبت روزہ پوشیدہ ہوتا ہے اور اس میں ریا کا شائبہ بھی کم ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس کے اجر کو بھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

○ روزے کا اصل فائدہ تب ہی حاصل ہوتا ہے جب انسان دل کی غلط خواہشات پوری کرنے سے پرہیز کرے، یعنی جس طرح کھانا کھانے سے پرہیز کرتا ہے، اسی طرح جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے بھی اجتناب کرے۔

- روزہ کھولتے وقت اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ اللہ کے فضل سے ایک نیک کام مکمل کرنے کی توفیق ملی۔

○ منہ کی بو سے وہ بو مراد ہے جو پیٹ خالی رہنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، چونکہ یہ اللہ کی اطاعت کا ایک کام کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اس لئے اللہ کو بہت محبوب ہے۔

- قیامت کو خوشی اسی لئے ہوگی کہ روزے کا ثواب اس کی توقع سے بڑھ کر ملے گا اور اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔
- بعض لوگوں کا خیال ہے کہ روزے کی حالت میں شام کے وقت مسواک کرنے سے بچنا چاہیے تاکہ اللہ کی پسندیدہ بو ختم نہ ہو جائے، لیکن یہ درست نہیں کیونکہ مسواک سے وہ بو ختم ہوتی ہے جو منہ کی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، معدہ خالی ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والی بو دوسری ہے، اس کا مسواک کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔

## روزہ ڈھال ہے

حضرت مطرف بن عبد اللہ رحمۃ اللہ جو قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ سے تھے، ان سے روایت ہے کہ حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں پلانے کے لئے دودھ طلب فرمایا، مطرف رحمۃ اللہ نے کہا میں روزہ سے ہوں، حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے۔

”روزہ جہنم سے بچانے والی ڈھال ہے جس طرح لڑائی میں تم میں سے کسی کی ڈھال ہوتی ہے۔“

- فوائد و مسائل:-
- مہمان کو کھانے پینے کی چیز پیش کرنا اخلاق عالیہ میں شامل ہے۔
- اگر کھانے پینے کی دعوت دی جائے تو نفل



روزہ کھول کر دعوت قبول کرنا ضروری نہیں۔  
○ اگر کسی موقع پر اپنی کوئی نیکی ظاہر کرنا پڑ جائے تو یہ ریا میں شامل نہیں۔

○ روزہ دوزخ سے بچاتا ہے، ایک تو اس لئے کہ یہ ایک بڑی نیکی ہے، جس کی وجہ سے بہت سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، دوسرے اس لئے کہ روزے کی وجہ سے انسان بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے، جن کے ارتکاب کی صورت میں وہ جہنم میں جاسکتا ہے، گناہوں سے اجتناب اور نیک عمل کی انجام دہی دونوں چیزیں جنت میں لے جانے والی اور جہنم سے بچانے والی ہیں۔

### قیامت کی پیاس

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جنت میں ایک دروازہ ہے جسے ریان کہا جاتا ہے، قیامت کے دن آواز دی جائے گی، کہا جائے گا روزے رکھنے والے کہاں ہیں؟ چنانچہ جو شخص روزہ رکھنے والوں میں سے ہوگا وہ اس (دروازے میں داخل ہو جائے گا اور جو اس میں داخل ہوگا، اسے بھی پیاس نہیں لگے گی۔“

○ فوائد و مسائل:- جنت کے آٹھ دروازے ہیں جو مختلف نیکیوں کی طرف منسوب ہیں، مثلاً باب الصلوٰۃ (نماز کا دروازہ) باب الجہاد (جہاد کا دروازہ) باب الصدقہ (صدقہ کا دروازہ)۔

○ ایک شخص نیکی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس کی ادائیگی کی زیادہ کوشش کرتا ہے، وہ اس نیکی سے منسوب دروازے سے جنت میں داخل ہوگا، اگر زیادہ صفات کا حامل ہو تو ایک سے زیادہ دروازوں سے بلایا جائے گا،

مثلاً حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آٹھوں دروازوں سے بلایا جائے گا۔

○ ریان کا مطلب ”سیراب“ ہے، روزہ دار بھوک پیاس برداشت کرتا ہے اور پیاس کا برداشت کرتا بھوک کی نسبت مشکل ہوتا ہے، اس لئے روزہ داروں کے لئے جو دروازہ مقرر ہے اسے بھی ”سیرابی کا دروازہ“ قرار دیا گیا ہے۔

○ فرض عبادات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ مسنون نقلی عبادات بھی ممکن حد تک ادا کرتے رہنا چاہیے، نقلی عبادات کا اہتمام جنت میں داخلے کا باعث ہے۔

### رمضان کے روزے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جو شخص ایمان رکھتے ہوئے اور ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے، اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔“

○ فائدہ:- اس سے مراد وہ صغیرہ گناہ ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، کبیرہ گناہ تو بہ سے معاف ہوتے ہیں اور حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک انہیں ادا نہ کر دیا جائے، الایہ کہ صاحب حق معاف کر دے۔

### شیطان کی قید

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطان اور سرکش جنوں کو جکڑ دیا جاتا ہے، جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں، ان میں

سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا اور ایک اعلان کرنے والا متادی کرتا ہے اے نیکی کے طلب گار، آگے بڑھ اور اے برائی کے طلب گار! رک جا اور اللہ تعالیٰ جہنم سے (بعض) لوگوں کو آزاد کرتا ہے، (رمضان میں) ہر رات اسی طرح ہوتا ہے۔“

○ فوائد و مسائل:- ماہ رمضان نیکیوں کا مہینہ ہے، اس مہینے میں اللہ کی طرف سے نیکیوں کے راستے میں حائل بڑی رکاوٹیں دور کر دی جاتی ہیں، اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص نیکیوں سے محروم رہتا ہے یا برائیوں سے اجتناب کر کے اللہ کی رحمت حاصل نہیں کرتا تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

○ شیطانوں اور سرکش جنوں کے قید ہو جانے کے باوجود ماہ رمضان میں انسانوں سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان گیارہ مہینوں میں گناہوں کا مسلسل ارتکاب کرنے کی وجہ سے ان کے عادی ہو جاتے ہیں، پھر رمضان میں نفس کی اصلاح کے لئے کوشش بھی نہیں کرتے، یعنی روزے نہیں رکھتے، کثرت سے تلاوت نہیں کرتے، تراویح نہیں پڑھتے، اس لئے ان کے نفس کی تربیت اور اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے وہ گناہوں سے اجتناب نہیں کر سکتے۔

○ جنت کے دروازے کھل جانے اور جہنم کے دروازے بند ہو جانے سے حقیقتاً ان دروازوں کا کھلنا اور بند ہونا بھی مراد ہے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان معاشرے میں ماہ رمضان کو خاص اہمیت دی جاتی ہے، اس لئے نیکیوں کی طرف عام رجحان پیدا ہوتا ہے اور مسلمان ہر قسم کی نیکی

کرنے پر مستعد ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے گناہ سے بچنے کی شعوری ہو جاتے ہیں، گویا یہ نیکیاں جنت کے دروازے ہیں اور گناہ جہنم کے دروازے۔

○ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکیوں میں آگے بڑھنے اور گناہوں سے باز آنے کا اعلان بھی اس لئے ہے کہ مسلمان نیکیاں کرنے اور گناہوں سے بچنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں۔

○ ہر رات بعض لوگوں کی جہنم سے آزادی بھی ماہ رمضان کا خصوصی شرف ہے، گناہوں سے توبہ کر کے ہر شخص اس شرف کو حاصل کر سکتا ہے۔

### دوزخ سے آزادی

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ ہر افطار کے وقت کچھ لوگوں کو آزاد فرماتا ہے اور یہ (رمضان کی) ہر رات میں ہوتا ہے۔“

○ فائدہ:- جہنم سے آزادی کا یہ شرف خلوص کے ساتھ سنت کے مطابق روزہ رکھ کر اور گناہوں سے توبہ کر کے حاصل ہو سکتا ہے، واللہ اعلم۔

### شب قدر

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا رمضان کا مہینہ شروع ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”تمہارے پاس یہ مہینہ آگیا ہے، اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینے سے افضل ہے، جو اس رات کا (ثواب حاصل کرنے) سے محروم رہا، وہ ہر بھلائی سے محروم رہا، اس کے خیر سے



سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا تو کیا غرباء اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی پر یا پانی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرادے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے فرمایا کہ اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلا دے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض کوثر سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو بھی پیاس نے لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں پہنچ جائے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آتش دوزخ سے آزادی ہے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اور جو آدمی اس مہینے میں اپنے غلام و خادم کے کام میں تخفیف دے گا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے گا اور اسے دوزخ سے رہائی اور آزادی دے گا۔

(شعب الایمان، معارف الحدیث)

روزے میں احتساب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”جو لوگ رمضان کے روزے ایمان و احتساب کے ساتھ رکھیں گے ان کے سب گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور ایسے ہی جو لوگ ایمان و احتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں میں نوافل (تراویح و تہجد)

روزے کی فضیلت

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو ایک خطبہ دیا، اس میں آپ نے فرمایا ”لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے، اس مہینے کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہ الہی میں کھڑے ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرب کیا ہے، (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینے میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے غیر فرض عبادت (یعنی سنت یا نفل) ادا کرے گا تو دوسرے زمانے کے فرضوں کے برابر اس کا ثواب ملے گا اور اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا، یہ ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے جس نے اس مہینے میں کسی روزے دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لئے) افطار کرایا تو اس کے لئے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم میں

ہے، انہوں نے کہا ہم لوگ حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں جاضر تھے اور دن وہ تھا جس میں شک کیا جاتا ہے، آپ کی خدمت میں ایک (پکائی ہوئی) مبری پیش کی گئی، بعض لوگ (کھانے سے اجتناب کرتے ہوئے) ایک طرف ہو گئے، حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا جس نے اس دن روزہ رکھا، اس نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی۔  
نوائد و مسائل:-

○ شک کے دن سے مراد انیس شعبان کے بعد والا دن ہے جب کہ چاند نظر آنے کی تصدیق نہ ہوئی ہو، یہ دن حقیقت میں شعبان کا تیسواں دن ہے۔

○ بعض لوگ تیس شعبان کو اس لئے روزہ رکھ لیتے ہیں کہ شاید رمضان شروع ہو گیا اور ہمیں معلوم نہ ہوا ہو، اب اگر رمضان شروع ہو چکا ہو تو یہ روزہ رمضان کا ہو جائے گا، ورنہ یہ روزہ کبھی اس طرح کا شک والہ روزہ رکھنا شرعاً منع ہے۔

○ اللہ تعالیٰ نے فرض عبادات کی مقدار اور اوقات کا تعین کر دیا ہے، نفل اور فرض عبادات کے اس امتیاز کو ختم کرنا درست نہیں۔

○ نیکی کا عمل اگر سنت کے خلاف ہو تو وہ نیکی کا عمل ہی نہیں رہتا۔

○ یہ روایت اکثر محققین کے نزدیک صحیح ہے، بقض صحابہ کے روزہ نہ توڑنے کی وجہ سے سکتی ہے کہ انہوں نے معمول کے مطابق روزہ رکھا ہو، جس کی اجازت ہے۔

وہی محروم رہتا ہے جو واقعی محروم ہے۔“  
نوائد و مسائل:-

○ وعظ و نصیحت میں موقع محل کا لحاظ رکھنا چاہیے، علمائے کرام عموماً خاص خاص ایام میں خاص موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں، ماہ محرم میں بدعات محرم کا تردید اور ماہ ربیع الاول میں اس ماہ کی بدعات کا عادیہ لیکن یہ بھی مناسب نہیں کہ پورا مہینہ ایک ہی موضوع پر تقریریں کرنا ضروری سمجھ لیا جائے، جیسے محرم میں حادثہ کربلا کی جھوٹی سچی تفصیلات اور ماہ ربیع الاول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت اور بچپن کی تفصیلات، بلکہ ان موضوعات کے ساتھ ساتھ دوسرے عملی مسائل بھی بیان کرنے چاہئیں۔

○ اس مہینے کی افضل ترین رات لیلتہ القدر ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی سورۃ القدر میں ہے۔

○ شب قدر کی عبادت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف مسنون ہے، تاہم اگر کوئی شخص اعتکاف نہ کر سکے، تب بھی راتوں کی عبادت، خصوصاً طاق راتوں کی عبادت میں سستی نہیں کرنی چاہیے۔

○ ایک رات عبادت میں گزارنے سے تیس ہزار سے زیادہ راتوں کی عبادت کا ثواب مل رہا ہو، پھر بھی کوئی شخص سستی کی وجہ سے ثواب حاصل نہ کر سکے تو یہ واقعی بہت بڑی محرومی ہے۔

○ یہ روایت بعض حضرات کے نزدیک حسن صحیح ہے۔

شک کے دن روزہ رکھنا منع ہے

حضرت صلہ بن زفر رحمۃ اللہ سے روایت



# رمضان کی نیکی

سب سے میٹھا صبر ہے  
رب کی بارگاہ میں  
اس کا اتنا شکر ہو تو  
اور کیسا چاہیے

ہمدرد



روح افزا

بلکہ فرمایا جب بادل ہو تو شعبان کے تمیں دن پورے کیے جائیں۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ چھوڑ دو اور اگر (۲۹ تاریخ کو) چاند دکھائی نہ دے تو شعبان کی تمیں کی گنتی پوری کرو۔“

(صحیح بخاری و مسلم، معارف الحدیث)

سحری

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ”سحری میں برکت ہے، اسے ہرگز ہرگز نہ چھوڑنا، اگر کچھ نہیں تو اس وقت پانی کا ایک گھونٹ پی لیا جائے کیونکہ سحری میں کھانے پینے والوں پر اللہ تعالیٰ رحمت فرماتا ہے اور فرشتے ان کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں۔“

(مسند احمد، معارف الحدیث)

افطار

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے بندوں میں مجھے وہ بندہ زیادہ محبوب ہے جو روزے کے افطار میں جلدی کرے (یعنی غروب آفتاب کے بعد بالکل دیر نہ کرے)

(معارف الحدیث، جامع ترمذی)

حضرت سلیمان بن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”جب تم میں سے کسی کا روزہ ٹوٹ جائے تو پانی سے افطار کرے اور اگر مجبور ہو جائے تو پانی ہی سے افطار کرے اس لئے کہ پانی کو اللہ تعالیٰ نے طہور بنایا ہے۔“

(مسند احمد، ابی داؤد، جامع ترمذی، ابن ماجہ)

(معارف الحدیث)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت

ہے کہ میں نے ان کے بھی سارے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور اسی طرح جو لوگ شب قدر میں ایمان و احتساب کے ساتھ نوافل پڑھیں گے، ان کے بھی سارے پہلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

(صحیح بخاری، مسلم، معارف الحدیث)

روزے کی برکات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”روزہ رکھا کرو تندرست رہا کرو گے۔“ (طبرانی)

اور روزے سے جس طرح ظاہری و باطنی مفرت زائل ہوتی ہے اسی طرح اس سے ظاہر و باطنی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

روزے کی اہمیت

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ”جب رمضان المبارک کا عشرہ اخیرہ شروع ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کمر کس لیتے اور شب بیداری کرتے یعنی پوری رات عبادت اور ذکر و دعا میں مشغول رہتے اور اپنے گھر کے لوگوں یعنی ازواج مطہرات اور دوسرے متعلقین کو بھی جگا دیتے، تاکہ وہ بھی ان راتوں کی برکتوں اور سعادتوں میں حصہ لیں۔“

(صحیح بخاری و صحیح مسلم، معارف الحدیث)

روایت ہلال کی تحقیق اور شہادت کی شہادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت یہ تھی کہ جب تک روایت ہلال کا ثبوت نہ ہو جائے یا کوئی عینی گواہ نہ مل جائے آپ روزے شروع نہ کرتے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت قبول کر کے روزہ رکھا۔ (زاد المعاد)

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بادل کے دن کا روزہ نہیں رکھتے تھے، نہ آپ نے اس کا حکم دیا



ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مغرب کی نماز سے پہلے چند ترہجوروں سے روزہ افطار فرماتے تھے اور اگر ترہجوریں بروقت موجود نہ ہوتیں تو خشک کھجوروں سے افطار فرماتے تھے اور اگر خشک کھجوریں بھی نہ ہوتیں تو چند ٹھونٹ پانی پی لیتے تھے۔“

(جامع ترمذی، معارف الحدیث)  
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”رزوے دار کی ایک بھی دعا افطار کے وقت مسترد نہیں ہوتی۔“

(ابن ماجہ، معارف الحدیث)  
تراویح

اکثر علماء اس بات پر متفق ہیں کہ تراویح کے مسنون ہونے پر اہل سنت و الجماعت کا اجماع ہے، آئمہ اربعہ میں سے یعنی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ان سب حضرات کی کتابوں میں اس کی تصریح ہے کہ تراویح کی بیس رکعات سنت موكده ہیں۔

(خصائل نبوی)

قرآن مجید کا سننا  
رمضان شریف میں قرآن مجید کا ایک مرتبہ ترتیب وار تراویح میں پڑھنا سنت موكده ہے اگر کسی عذر سے اس کا اندیشہ ہو کہ مقتدی محل نہ کر سکیں گے تو پھر الم تر کیف سے آخر تک دس سورتیں پڑھ دی جائیں، ہر رکعت میں ایک سورت ہو پھر دس رکعت پوری ہونے پر پھر انہی سورتوں کو دوبارہ پڑھ دے یا اور جو سورتیں چاہے پڑھے۔ (بہشتی زیور)

تراویح پورا مہینہ پڑھنا  
تراویح کا رمضان المبارک کے پورے مہینہ میں پڑھنا سنت ہے اگرچہ قرآن مجید ختم ہونے

سے پہلے ہی ختم ہو جائے مثلاً پندرہ روزہ میں قرآن مجید ختم ہو جائے تو باقی دنوں میں بھی تراویح کا پڑھنا سنت موكده ہے۔

تراویح میں جماعت  
تراویح میں جماعت سنت موكده ہے، اگرچہ ایک قرآن مجید جماعت کے ساتھ ختم ہو چکا ہو۔

تراویح دو دو رکعت کر کے پڑھنا  
تراویح دو دو رکعت کر کے پڑھنا چاہیے، چار رکعت کے بعد اس قدر توقف کرنا چاہیے کہ جس قدر نماز میں صرف ہوا ہے لیکن مقتدیوں کی رعایت کرتے ہوئے وقت کم بھی کیا جاسکتا ہے۔ (بہشتی زیور)

تراویح کی اہمیت  
رمضان المبارک میں تراویح کی نماز بھی سنت موكده ہے، اس کا چھوڑ دینا اور نہ پڑھنا گناہ ہے (عورتیں اکثر تراویح کی نماز کو چھوڑ دیتی ہیں) ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیے۔  
عشاء کے فرض اور سنتوں کے بعد بیس رکعت نماز تراویح پڑھیں جب بیس رکعت تراویح پڑھ چکیں تو اس کے بعد وتر پڑھیں۔ (بہشتی زیور)

تراویح کی بیس رکعتوں پر حدیث  
حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان میں بیس رکعتیں اور وتر پڑھا کرتے تھے۔

(مجمع الزوائد ص ۲۷۱ ج ۳ بحوالہ طبرانی)  
اگرچہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی ضعیف ہے لیکن چونکہ صحابہ کرام اور تابعین کا مسلسل تعامل اس پر رہا ہے اس لئے محدثین اور فقہاء کے اصول کے مطابق یہ حدیث مقبول ہے۔

حضرت سائب بن یزید اور یزید بن رومان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں صحابہ کرام بیس رکعت تراویح پڑھا کرتے تھے۔

رمضان المبارک میں شب بیداری، نوافل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کے روزوں کو فرض فرمایا ہے اور میں نے رمضان کی شب بیداری کو (تراویح اور تلاوت قرآن کے لئے) تمہارے واسطے (اللہ تعالیٰ کے حکم سے) سنت بنایا (کہ موكده ہونے کے سبب وہ بھی ضروری ہے) جو شخص ایمان سے اور ثواب کے اعتقاد سے رمضان کے روزے رکھے اور رمضان کی شب بیداری کرے وہ اپنے گناہوں سے اس دن کی طرح نکل جائے گا جس دن اس کو اس کی ماں نے جنا تھا۔ (نسائی، حیوہ المسلمین)

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ ماہ رمضان المبارک بہت ہی بابرکت اور فضیلت والا مہینہ ہے اور یہ صبر و شکر اور عبادت کا مہینہ ہے اور اس ماہ مبارک کی عبادت کا ثواب ستر درجے عطا ہوتا ہے، جو کوئی اپنے پروردگار کی عبادت کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرے گا، اس کی بہت بڑی جزا خداوند تعالیٰ عطا فرمائے گا۔

وظائف  
ماہ رمضان کی پہلی شب بعد نماز عشاء ایک مرتبہ سورہ فتح پڑھنا بہت افضل ہے۔

رمضان شریف میں ہر نماز عشاء کے بعد روزانہ تین مرتبہ کلمہ طیب پڑھنے کی بہت فضیلت ہے، اول مرتبہ پڑھنے سے گناہوں کی مغفرت ہو گی، دوم مرتبہ پڑھنے سے دوزخ سے آزاد ہوگا، تیسری بار پڑھنے سے جنت کا مستحق ہوگا۔  
شب قدر

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شب قدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس راتوں کی طاق راتوں میں۔  
شب قدر کی دعا

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میں نے عرض کیا کہ مجھے بتائیے کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کون سی رات شب قدر ہے تو میں اس رات اللہ تعالیٰ سے کیا عرض کروں؟ اور کیا دعا مانگوں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ عرض کرو۔  
ترجمہ، اے اللہ آپ معاف کرنے والے ہیں اور کریم ہیں غنوکو پسند کرتے ہیں لہذا مجھ سے درگزر کیجئے۔

(معارف الحدیث)  
پہلی شب قدر

حضور انور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میری امت میں سے جو مرد یا عورت یہ خواہش کرے کہ میری قبر نور کی روشنی سے منور ہو تو اسے چاہیے کہ ماہ رمضان کی شب قدروں میں کثرت کے ساتھ عبادت الہی بجالائے، تاکہ ان مبارک اور معتبر راتوں میں عبادت سے اللہ پاک اس کے نامہ اعمال سے برائیاں مٹا کر نیکیوں کا ثواب عطا فرمائے۔

شب قدر کی عبادت ستر ہزار شب کی عبادتوں سے افضل ہے۔  
نفل نماز

اکیسویں شب کو چار رکعت نماز دو سلام سے پڑھے ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے سورہ قدر ایک ایک بار، سورہ اخلاق ایک ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد سلام کے ستر مرتبہ درود پاک پڑھے۔  
انشاء اللہ تعالیٰ اس نماز کے پڑھنے والے کے حق میں فرشتے دعائے مغفرت کریں گے۔



ایک سوئیں شب کو دو رکعت نماز پڑھے، ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے سورہ قدر ایک بار، سورہ اخلاق تین تین بار پڑھے، بعد نماز، سلام پھیر کر ستر مرتبہ استغفار پڑھے۔  
انشاء اللہ تعالیٰ اس نماز اور شب قدر کی برکت سے اللہ پاک اس کی بخشش فرمائے گا۔

وظیفہ  
ماہ رمضان المبارک کی ایک سوئیں شب کو ایک سو مرتبہ سورہ قدر پڑھنا بہت افضل ہے۔

دوسری شب قدر  
ماہ مبارک کی تیسویں شب کو چار رکعت نماز دو سلام سے پڑھے، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قدر ایک ایک بار اور سورہ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھے۔

بعد سلام کے ستر مرتبہ کلمہ تجید پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرے، اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما کر انشاء اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے گا۔

وظیفہ  
تیسویں شب کو سورہ یسین ایک مرتبہ، سورہ رحمن ایک مرتبہ پڑھنی بہت افضل ہے۔

تیسری شب قدر  
ماہ رمضان کی پچیسویں تاریخ کی شب قدر کو چار رکعت نماز دو سلام سے پڑھے، بعد سورہ فاتحہ کے سورہ قدر ایک ایک بار، سورہ اخلاص پانچ مرتبہ ہر رکعت میں پڑھے۔

بعد سلام کے کلمہ طیب ایک سو دفعہ پڑھے۔ درگاہ رب العزت سے انشاء اللہ تعالیٰ بے شمار عبادت کا ثواب عطا ہوگا۔

پچیسویں شب کو چار رکعت نماز، دو سلام سے پڑھے، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قدر تین تین مرتبہ، سورہ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھے، بعد سلام کے ستر دفعہ استغفار پڑھے۔

یہ نماز بخشش گناہ کے لئے بہت افضل ہے۔ پچیسویں شب قدر کو دو رکعت نماز پڑھے، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قدر ایک ایک مرتبہ، سورہ اخلاص پندرہ پندرہ مرتبہ پڑھے، بعد سلام کے ستر دفعہ کلمہ شہادت پڑھے۔  
یہ نماز واسطے نجات عذاب قبر بہت افضل ہے۔

وظائف  
ماہ رمضان کی پچیسویں شب کو سات مرتبہ سورہ وہان پڑھے، انشاء اللہ اس سورہ کے پڑھنے سے عذاب قبر سے محفوظ ہوگا۔

پچیسویں شب کو سات مرتبہ سورہ فتح پڑھنا واسطے ہر مرد کے بہت افضل ہے۔

چوتھی شب قدر  
ستائیسویں شب قدر کو بارہ رکعت نماز تین سلام سے پڑھیں ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قدر ایک ایک مرتبہ، سورہ اخلاص پندرہ پندرہ مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے ستر مرتبہ استغفار پڑھے، انشاء اللہ اس نماز کے پڑھنے والے کو نبیوں کی عبادت کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

ستائیسویں شب کو دو رکعت نماز پڑھے، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قدر تین تین مرتبہ، سورہ اخلاص، ستائیس مرتبہ پڑھ کر گناہوں کی مغفرت طلب کرے، اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف فرمائے گا، انشاء اللہ۔

ستائیسویں شب کو چار رکعت نماز دو سلام سے پڑھے، ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے سورہ تکاثر ایک ایک مرتبہ، سورہ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھے۔

اس نماز کے پڑھنے والے پر سے اللہ تعالیٰ موت کی سختی آسان کرے گا، انشاء اللہ تعالیٰ اس کو عذاب قبر بھی معاف ہو جائے گا۔

ستائیسویں شب کو دو رکعت نماز پڑھے، ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے، سورہ اخلاص سات سات مرتبہ پڑھے، بعد سلام کے ستر دفعہ استغفار کی تسبیح پڑھے۔

انشاء اللہ تعالیٰ اس نماز کو پڑھنے والے اپنے مصلے سے نہ اٹھیں گے کہ اللہ پاک اس کو اور اس کے والدین کے گناہ معاف کر کے مغفرت فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کا حکم دے گا کہ اس کے لئے جنت کو آراستہ کر د اور فرمایا کہ وہ جب تک تمام بہشتی نعمتیں اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لے گا اس وقت تک اسے موت نہ آئے گی، واسطے مغفرت یہ دعا بہت افضل ہے۔

ستائیسویں شب کو چار رکعت نماز پڑھے، ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے سورہ قدر تین تین دفعہ سورہ اخلاص پچاس پچاس مرتبہ پڑھے، بعد سلام ہجده میں سر رکھ کر ایک مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھے۔

اس کے بعد جو حاجت دنیوی و دنیوی طلب کرے وہ انشاء اللہ اس نماز کے پڑھنے والے کو دنیا سے مکمل ایمان کے ساتھ اٹھائے گا۔

ماہ رمضان کی تیسویں شب کو چار رکعت نماز دو سلام سے پڑھیں ہر رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے سورہ قدر ایک ایک بار، سورہ اخلاص پانچ مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے دو رکعت شریف ایک سو دفعہ پڑھے۔

انشاء اللہ تعالیٰ اس نماز کے پڑھنے والے کو دربار خداوندی سے بخشش مغفرت عطا کی جائے گی۔

وظائف  
ستائیسویں شب قدر کو سات سو مرتبہ، یہ سات سو عذاب قبر سے نجات اور مغفرت گناہ کے لئے بہت افضل ہے۔

ستائیسویں شب کو سورہ ملک سات مرتبہ

پڑھنا واسطے مغفرت گناہ بہت فضیلت والی ہے۔  
پانچویں شب قدر  
تیسویں شب کو چار رکعت نماز دو سلام سے پڑھیں، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ قدر ایک ایک بار، سورہ اخلاص تین تین بار پڑھیں، بعد سلام کے سورہ الم نشرح، ستر مرتبہ پڑھیں۔  
یہ نماز کامل ایمان کے لئے بہت افضل ہے۔

جمعة الوداع

رمضان المبارک کے آخری جمعہ کے بعد نماز ظہر دو رکعت نماز پڑھیں، پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ زلزال، ایک بار، سورہ اخلاص دس بار، دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ کافرون تین مرتبہ پڑھیں، بعد سلام کے دس بار درود شریف پڑھیں، پھر دو رکعت نماز پڑھیں پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ تکاثر ایک بار، سورہ اخلاص دس بار، دوسری رکعت میں بعد سورہ فاتحہ کے آیت الکرسی تین مرتبہ سورہ اخلاص پچیس مرتبہ، بعد سلام کے درود شریف دس دفعہ پڑھیں۔

اس نماز کے بعد شمار فضائل ہیں اور اس نماز کے پڑھنے والے کو اللہ تعالیٰ قیامت تک بے انتہا عبادت کا ثواب عطا فرمائے گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

رمضان کی آخری رات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان کی آخری رات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے لئے مغفرت و بخشش کا فیصلہ کیا جاتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا، وہ شب قدر رہی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر تو نہیں ہوتی لیکن بات یہ ہے کہ عمل کرنے والا جب اپنا عمل کر دے تو اس کو پوری اجرت مل جاتی ہے۔



دور دور تھا، لوگ آزاد تھے اور اخبار آزاد تھے کہ جو چاہیں کہیں، جو چاہیں لکھیں، بشرطیکہ وہ بادشاہت کی تعریف میں ہو، خلاف نہ ہو۔

اس بادشاہ کا زمانہ ترقی اور فتوحات کے لئے مشہور ہے، ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی نظر آتی تھی، کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی جو لوگ لکھ جاتی تھے، دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی ہو گئے حسن انتظام ایسا تھا کہ امیر لوگ سونا اچھالتے اچھالتے بیرون ملک بھی چلے جاتے تھے، کسی کی مجال نہ تھی کہ پوچھے اتنا سونا کہاں سے آیا اور کہاں لے جا رہے ہو۔

روحانیت سے شغف تھا، کئی درویش اسے ہوائی اڈے پر لینے چھوڑنے جاتے یا اس کی کامرانی کے لئے چلے کاٹتے تھے، طبیعت میں عفو و درگزر کا مادہ از حد تھا، اگر کوئی آکر شکایت کرتا کہ فلاں شخص نے میری فلاں جائیداد ہتھیالی ہے یا فلاں عزیز کیوں نہ ہو، وہ کمال سیرچشمی سے اسے معاف کر دیتے تھے، بلکہ شکایت کرنے والوں پر خفا ہوتے تھے کہ عیب جوئی بری بات ہے۔

جب بادشاہ کا دل حکومت سے بھر گیا تو وہ اپنی چپک بلیں لے کر تاریک دنیا ہو گیا اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا، کچھ لوگ کہتے ہیں اب بھی زندہ ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

ایران میں کون رہتا ہے؟

ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے۔

انگلستان میں کون رہتا ہے؟

انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے۔

فرانس میں کون رہتا ہے؟

فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے۔

یہ کون سا ملک ہے؟

یہ پاکستان ہے۔

اس میں پاکستانی قوم رہتی ہوگی؟

نہیں، اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی۔

اس میں سندھی قوم رہتی ہے۔

اس میں پنجابی قوم رہتی ہے۔

اس میں یہ قوم رہتی ہے۔

اس میں وہ قوم رہتی ہے۔

لیکن پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔

سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔

پھر یہ الگ الگ کیوں بنایا تھا؟

غلطی ہوئی، معاف کر دیجئے، آئندہ نہیں بنائیں گے۔

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

کسی ملک میں ایک تھا بادشاہ، بڑا دانش مند، مہربان اور انصافی پسند، اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا اسے بہت پسند کرتی تھی، اس بات کی شہادت نہ صرف اس زمانے کے محکمہ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے بلکہ بادشاہ کی خود نوشت سوانح عمری سے بھی۔

شاہ حجاز کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا

فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (میرے کثرت عبادت، نماز روزہ کے متعلق علم ہونے پر) مجھ سے فرمایا کہ ایسا نہ کیا کرو بلکہ بھی روزہ رکھا کرو اور بھی افطار، اسی طرح رات کو نماز پڑھ کر سویا بھی کرو، تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے (کہ رات بھر جاگنے سے ضعیف ہو جاتی ہیں) تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، اولاد کا بھی حق ہے اور ملنے جلنے والوں کا بھی حق ہے۔ (شامل ترمذی)

شوال کے چھ روزے

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے اس کے بعد ماہ شوال میں چھ روزے رکھے تو اس کا یہ عمل ہمیشہ روزے رکھنے کے برابر ہوگا۔

(صحیح مسلم، معارف الحدیث)

کھانے پینے کے آداب

اسلام نے ہر شعبہ حیات میں سادگی اور پاکیزگی کا سبق سکھایا ہے، آئیے آج کھانے پینے کے آداب سیکھیں۔

آداب طعام: عمر بن ابوسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت میں تھا (کھانے کے دوران میں) میرا ہاتھ برتن میں ادھر ادھر جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”بیٹا! اللہ کا نام لے کر دائیں ہاتھ سے اور

اپنے آگے سے کھاؤ۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”تم بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کیا کرو اگر شروع میں اللہ کا نام لینا بھول جاؤ تو جب یاد آئے یہ پڑھ لیا کرو۔“

رمضان المبارک کے علاوہ دوسرے ایام کے روزے

حضرت عبداللہ بن شفیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روزہ رکھنے کے متعلق پوچھا انہوں نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی متواتر روزے رکھتے تھے اور ہمارا خیال ہوتا تھا کہ وہ اس ماہ میں افطاری ہی نہیں فرمائیں گے اور بھی ایسا مسلسل افطار فرماتے کہ ہمارا خیال ہوتا کہ اس ماہ میں روزہ ہی نہ رہیں گے لیکن مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد سے رمضان المبارک علاوہ کسی ماہ تمام ماہ کے روزے نہیں رکھے، ایسے ہی کسی ماہ کو کامل افطار میں گزار دیا یہ بھی نہیں کیا۔

(ابوداؤد، شامل ترمذی)

ہر ماہ تین روزے

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ماہ میں تین روزے رکھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا، رکھتے تھے، میں نے مکرر پوچھا کہ مہینہ کے کن ایام میں رکھتے تھے، انہوں نے فرمایا کہ اس کا اہتمام نہ تھا، جن ایام میں موقع ہوتا رکھ لیتے۔ (شامل ترمذی)

دوشنبہ، پنج شنبہ کے روزے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دوشنبہ اور پنج شنبہ کے دن حق تعالیٰ شانہ کی عالی بارگاہ میں اعمال پیش ہوتے ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ میرے اعمال روزے کی حالت میں پیش ہوں۔

مسلسل روزے رکھنے کی ممانعت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ



انیسویں قسط کا خلاصہ

شہر یار موت و زیست کی کشش میں مبتلا ہو کر راتیل کا دل جیتنے میں بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے ان کے درمیان دوریاں ٹھٹھتی ہیں تو ایک خوبصورت رفاقت آغاز پاتی ہے، جو حویلی کے سبھی مکیہوں کے لئے اطمینان بخشی اور سکھ کا باعث ہے، ایسے میں نکلیں وقاص کے لئے ایک حتمی فیصلہ کر کے اسے حویلی بلوانی ہے، جہاں شہر یار کے مزاج کے شوخ اور ایلے رنگ اس کی روح پہ پڑے آبلوں کو چل دیتے ہیں، مگر نکلیں کی دانائی اور جذباتی باتیں بالآخر اس سے وہ فیصلہ کرا لیتی ہیں جسے عام حالات میں شاید وہ اتنی آسانی سے بھی نہ کر پاتا۔

ماہ نور طارق کو اس جوشیلی اور دل آویز محبت کی خواہاں ہے، مگر وہ اس بات سے انجان ہے کہ پلوں سے بہت سا وقت بیت گیا اور وقت میں اگر کوئی نقصان ہو جائے تو بسا اوقات اس کا ازلہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جایا کرتا ہے۔

تیسویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے

Scan & PDF  
FIAZ AHMED  
Friends Korner.com



”خوش فہمی اچھی ڈوز ہے لیتے رہنا چاہیے بندہ صحت مند اور فریش رہتا ہے۔“ اس نے جوابی حملہ کیا مگر بہت خوبصورت سی ہنسی کے ساتھ۔

”بری بات مسز بڑوں سے مذاق نہیں کرتے، پھر حرج ہی کیا ہے اگر کسی کو خوش فہمی سلامت بھی رہنے دی جائے۔“ انہوں نے جواباً اسی ترنگ اسی فریش انداز میں کہا تو نگین کو کھلکھلاہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔

”کہاں ہیں آپ؟“ معا سے خیال آیا تو پوچھا۔

”محترمہ ذرا نیو کر رہا ہوں، لمبی بات کا موڈ ہے تو پھر ٹرائی کیجئے گا۔“

”آفس جارہے ہیں؟“ نگین نے منہ لٹکا لیا اس کا موڈ تو وقاص اور زوحا کے حوالے سے ان سے بات کرنے کا تھا۔

”ظاہر ہے یار! اس وقت کہیں اور تو مٹر گشت کرنے سے رہا۔“

”اچھا! وقاص سے بات کی آپ نے؟“ اس نے موضوع بدلا۔

”کون سی بات؟ اچھا وہی شادی والی، نہیں تمہارے سامنے ہی ہوئی تھی، میرا خیال ہے ہمیں اسے ذرا ٹائم دینا چاہیے۔“ انہوں نے اپنی رائے دی جس سے نگین نے اتفاق نہیں کیا تھا۔

”ضروری نہیں ہے داؤد بلکہ آپ ایسا کریں آج شام کو اسے لے کر حویلی آئیں، مجھے اسے کچھ بہت اہم دکھانا ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر یکا یک پر جوش ہونے لگی۔

”ایسا کیا انوکھا ہے بیگم صاحبہ! زوحا کو وہ دیکھ ہی نہیں گئی بارل بھی چکا ہے۔“ داؤد نے ٹوکا تو نگین جھلاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔

”آپ کو آنے میں کیا اعتراض ہے بھلا؟“ وہ بسوری تھی داؤد حسن خان نے گہرا سانس کھینچا۔

”اعتراض ہے نا میرا بہت حرج ہو گا آنے میں کلینک سے چھٹی ہوگی پھر آج تو بہت اہم میٹنگ بھی ہے، سوری میں نہیں آ پاؤں گا۔“ نگین کچھ دیر کو یوں چپ ہوئی جیسے کس سوچ میں ڈوب گئی ہو۔

”ٹھیک ہے داؤد آپ ایسا کریں وقاص کو بھیج دیں مگر ذرا جلدی، پھر میں اس کے ساتھ آ جاؤں گی نا۔“ اس کے اعصاب پہ جیسے کوئی دھن سوار ہو چکی تھی۔

”خیریت ہے نا نگین ہوا کیا ہے؟“ داؤد حسن خان کا چونکنا فطری تھا۔

”نو دی پوائنٹ یہ کہ وقاص کو فیصلہ کرنے کی بہت سہولت رہے گی، باقی تفصیل پھر ملاقات پہ۔“

”ایز یوش۔“ داؤد حسن خان نے بھی کرید نہیں کی، مگر پھر کچھ خیال آنے پہ فون بند کرنے سے پہلے بولے تھے۔

”خفا تو نہیں ہو؟“

”ارے.....“ وہ ذرا سی ہنسی تھی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

”خفا ساری دنیا سے ہو جاؤں تو آپ سے نہ ہوں، اتنی مشقتوں سے تو آپ کو لائن پہ لائی

ہوں یہ حماقت کرتی ہوں بھلا؟“

”اس کا مطلب ہم حماقت کر رہے تھے؟“ داؤد حسن خان نے اس پہ گرنٹ کی تو جواباً اسے شوخی سوچھ گئی۔

”آپ خود سمجھدار ہیں، بندی کی مجال کہ کوئی گستاخانہ کلمات نکالے منہ سے۔“ وہ کھل کھل ہنس رہی تھی، یوں جیسے کسی اونچے پہاڑ سے جھرنابہتا ہو۔

”شہر یار کیسا ہے؟“

”آپ فون کرتے تو ہیں اسے۔“ نگین نے بد مزہ اہو کر جتایا، اسے اپنی باتوں میں کوئی اور تذکرہ بہر حال برداشت نہیں ہوا تھا۔

”آف اتنی جیلیسی؟ واضح رہے شہر یار کسی لڑکی کا نام نہیں ہے۔“ داؤد حسن خان ہنس کر جتلا یا تھا پھر اسے گڈیائے کہا، تو نگین نے سیل واپس ڈال کر دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھا اور کچھ سوچ کر مسکرائے گئی۔

☆☆☆

یہ آنکھ رونے کی شدت سے لال تھوڑی ہے  
ملال ہے مگر اتنا ملال تھوڑی ہے  
بس اپنے واسطے ہی فکر مند ہیں سب لوگ  
یہاں کسی کو کسی کا خیال تھوڑی ہے  
مرا تو یہ ہے کہ ہار کے بھی ہنتے رہو  
ہمیشہ جیت ہی جانا کمال تھوڑی ہے  
لگانا پڑتی ہے ڈبلی ابھرنے سے پہلے  
غروب ہونے کا مطلب زوال تھوڑی ہے

وہ ایک گلابی شام تھی جب وقاص حویلی کے مین گیٹ تک پہنچا، جدید سہولیات سے مزین حویلی کے سرسبز وسیع و عریض لان میں وہ سب کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے، ایک شور ایک خوشگوار ہنگامہ مچا ہوا تھا، وکٹوں کے آگے بیٹ لہراتی زوحا تھی جبکہ باؤلنگ اسٹینڈ پہ شہر یار اس کے حریف کے طور پہ سامنے تھا۔

”ہاں تو پھر ٹارگٹ اچیو کرنا ہے نا؟“ شہر یار نے گویا اسے چھیڑا تھا۔

”تو اور کیا مجھے اپنے پاکستانی کرکٹرز کی طرح سٹہ بازی کر کے میچ ہارنا ہے؟ بال کراؤ آغا جی!“ اس نے منہ چڑایا شہر یار کو تپ چڑھ گئی۔

”تو کیا پہلے جو تین میچ باری ہو ان پہ مجھ سے سٹہ لگایا تھا؟“

”بھئی وہ قسمت کی ہار تھی، لازمی تو نہیں کہ ہر بار آپ ہی جیتو۔“ صوحانے نجل ہونا جو سیکھا ہی نہیں تھا۔

”انشا اللہ یہ بھی قسمت کی ہار ہوگی ڈونٹ وری۔“ شہر یار نے اسے زچ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور وہ اس مرتبہ کامیاب بھی رہا تھا۔

”بھابھی اپنے کیپٹن کو سمجھائیں خواجواہ بیرمول نہ لے، آف کورس اپنی ٹیم کی کیپٹن ہونے کی



حیثیت سے میری بھی آخر کوئی عزت ہے۔“ زوجا نے رائیل کو گھسیٹا جو گلابی کپڑوں میں ملبوس اڑتے بالوں کو سمیٹتی خاموشی سے دونوں کی نگرار سن رہی تھی، اس شکایت پہ خاطر خواہ اثر لیا۔  
”شہر یار کروائیں ناباؤ لنگ، ایز داٹھنے والا ہے میں پھر کھیل ادھورا چھوڑ دوں گی۔“ اس نے صرف آرڈر نہیں کیا تھا ساتھ میں دھمکی بھی دے ڈالی اس کے باوجود شہر یار جی جان سے فدا ہو گیا۔

”آپ کا حکم سر آنکھوں پہ جان من! مجھے تو اس بے چاری پہ ترس آرہا ہے، ابھی میری پہلی گیند پہ آؤٹ ہو جائے گی۔“ شہر یار نے ایک بار پھر زرخا کو زچ کیا پھر بال کرائی تھی، وہ تو کبھی ہی غصے میں پوری قوت سے بیٹ گھما دیا، گیند ہٹ کھا کر فضا میں اچھلی اور فضا میں تیرتی پورٹیکو کی جانب عازم سفر ہوئی۔

”جھکا۔“ زوجا نے گردن اکڑا کر فخر سے پیش گوئی کی، اڑتی ہوئی گیند اسی بل گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے باہر نکلتے وقاص کے شانے سے کھٹ سے جا کر گئی۔

”جھکا نہیں ٹھوکا! بد تمیز لڑکی، معزز مہمان کی یہ درگت۔“ وہ سب جو گیند کے تعاقب میں نگاہیں گھما چکے تھے اس کارنامے پہ کھیلاہٹ کا شکار ہو گئے، شہر یار نے البتہ زوجا کے لئے لینے کا وقت ضرور نکال لیا تھا اور اسے برہمی سے گھورتا تیز قدموں سے وقاص کی جانب بھاگا۔  
”ہائے اللہ!“ زوجا نے بیٹ پھینک کر دونوں ہاتھ سینے پہ رکھ لئے، دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینے سے باہر آ کرے گا۔

”یہ یہاں کیسے؟ میرا مطلب ہے یہ بغیر اطلاع۔“ رائیل کے گھورنے پہ اس نے شپٹا کے زبان دانٹوں تلے داب لی۔  
”اچھا بس کرو، آؤ دیکھتے ہیں بیچارے کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔“ رائیل نے تنبیہ کے انداز میں کہا اور قدم بڑھا دیے۔

”نہیں بھائی اس اوکے، مم..... ماما جان کدھر ہیں؟“ وقاص، شہر یار کے سوالوں پہ جوابات دے رہا تھا اور بے تحاشا سخت زدہ نظر آ رہا تھا، ایک تو وہ ویسے ہی کفیوژڈ تھا اور پر سے یہ آکورد پوزیشن۔

”یار یہ ہماری بہنا بس ایسی ہی ہیں، ذرا دھیان سے۔“ شہر یار مسکراہٹ دیا کر کہہ رہا تھا، وقاص کیا کہتا ان کی شکلیں دیکھ کر رہ گیا، رائیل کے روبرو تو ویسے بھی اس کی قدرتی صلاحیتیں تھیں جیسے مفلوج ہو جایا کرتی تھیں۔

”انوف شہر یار آپ بھی نہ بس بیچارے کو مزید پریشان کرنا شروع کر دیا ہے، وقاص آپ آؤ میرے ساتھ ٹکین اندر ہی ہیں۔“ رائیل کو وقاص کا حد سے زیادہ رویہ ہمدردی سے دوچار کر رہا تھا، جی شہر یار کو بازو سے پکڑ کر سائیڈ پہ کیا اور خود اس کے پہلو میں آ کر کھڑی ہو گئی، وقاص نے اس کی اس بے رکھشی کو بہت دھیان سے دیکھا اور محسوس کیا اور جیسے ایک دم اندر سے خالی ہو گیا۔  
”آئیے پلیز۔“ رائیل نے اس کا ٹکڑ ٹکڑ دیکھا اگر محسوس بھی کیا تو دھیان دیئے بنا بولی تھی، وقاص نے خود کو سنبھالا اور ہونٹ چبھتے ہوئے قدم بڑھا دیئے۔

”جاسیے جاسیے یہ آپ کو بالکل صحیح سالم آپ کی ممانی تک پہنچا دیں گی، مجھے تو وی صاحب

آپ کو دیکھ کر ایسے لگ رہا ہے جیسے آپ میلے میں گم ہو جانے والے چھوٹے سے بالک ہو اور گئی تمہاری والدہ محترمہ۔“ شہر یار کو گویا گدگدیاں ہو رہی تھیں، رائیل نے پلٹ کر شہر یار کو ناراض نظروں سے گھورا سب وہ چارو ناچار دیکھا تھا، مگر بیٹ پکڑتے ہوئے وکٹوں کی جانب جاتے جاتے بھی ہانک لگانے سے باز نہیں آیا۔

”بیہ ڈار لنگ ذرا جلدی واپس آ جانا یونو تمہارے بغیر میرا دل نہیں لگے گا۔“ وقاص چلتے ہوئے یکنخت لڑکھڑا گیا، رائیل بوکھلائی۔

”دھیان سے وقاص صاحب کیا ہوا؟“ وہ پریشانی سے استفسار کر رہی تھی۔

”تھنک۔“ اس کے پاس بتانے کو تھا بھی کیا، بس اندر سے خس و خاشاک ہوتا رہا تھا۔

☆☆☆

ہم محبت کے خرابوں کے مکین  
وقت کے طول المناک کے پروردہ ہیں  
ایک تاریک ازل نورابد سے خالی  
ہم جو صدیوں سے چلے ہیں تو

سمجھتے ہیں کہ ساحل پایا  
اپنی تہذیب کی پا کوئی کا حاصل پایا  
ہم محبت کے پنہاں خانوں میں بسنے والے  
اپنی پامالی کے افسانوں پہ رونے والے  
ہم سمجھتے ہیں نشان سر منزل پایا  
ہم محبت کے خرابوں کے مکین

کج ماضی میں ہیں

باراں زدہ طائر کی طرح آسودہ

اور بھی فتنہ ناکارہ سے ڈر کر چونکیں

تو رہیں بیہ نگاہ نیند کے جاری پردے

ہم محبت کے خرابوں کے مکین

ایک تاریک خرابے کہ جہاں

دور سے تیز پلٹ جائیں ضیا کے آہو

بس ایک صدا گونجتی ہے۔

شب الام کی یا ہو یا ہو

ہم محبت کے خرابوں کے مکین

ایک دلہروز میں خوابوں کے بحر بوتے ہیں

سایہ ناپید تھا سائے کی تمنا تلے سوتے رہے

ہم محبت کے خرابوں کے مکین

وہ بیڈ پہ پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا بالکل گم صم بے خبری کا سا انداز تھا، جب ہلکی سی دستک کے بعد



زوحا نے اندر قدم رکھا مگر اس کی غفلت یونہی قائم تھی، یہاں تک کہ وہ بالکل اس کے سر پہ پہنچ کر کھنکھاری، وہ چوکتے ہوئے اپنی جگہ زور سے اچھلا۔

”آپ؟“ اس کی آنکھوں میں خفیف سی کوفت اور ناگواری جاگی، جسے زوحا کے احساسات نے فی الفور محسوس کیا اور ایک چمک آمیز سا انداز اسے چھو کر گزر گیا۔

”اچھا نہیں لگا آنا میرا؟“ جل ہوئی ہوں تو واپس چلی جاؤں۔“ دونوں بازو سینے پہ لپیٹ کے وہ ہلکی سی چپھن سمیت بولی۔

”آپ کا اپنا گھر ہے، جہاں مرضی آئیں جائیں، میں کون ہوتا ہوں اعتراض اٹھانے والا۔“ وقاص نے نگاہ چار کیے بنا روٹھے پن سے کہا، زوحا کو تیر بن کر لگا تھا اس کا یہ انداز یہ جواب۔

(تم اتنے خاص تو نہیں ہو مسٹر وقاص کو یوں ذلت سہتی پھروں، مگر یہ میرا دل جو ہے نا یہی خواری یہ مجبور کر رہا ہے مجھے)۔

”آپ صحیح کہتے ہیں مسٹر وقاص، مگر کیا کیا جائے کہ ہم بہت روایات پرست لوگ ہیں، مہمان کی عزت ہمارے ہاں بہت خاص انداز میں کی جاتی ہے، میں سواری کرنے آئی ہوں، ریکی میری اس نادانستہ حرکت نے آپ کو جو.....“

”کیا کہہ رہی ہیں میں قطعی نہیں سمجھا؟“ وقاص نے بے اختیار اس کی بات قطع کی، زوحا بری طرح سے چونکی اس کی نگاہوں کی واضح الجھن اس کی بات کے پیچ ہونے کی دلیل تھی، زوحا کا دل جیسے یکا یک بھرا سا گیا۔

(یہ ہے اس کے نزدیک میری اہمیت میری حیثیت؟ ابھی چند گھنٹے قبل کی بات بھولے بیٹھا ہے، ساری زندگی تو اس کے ساتھ میں نظر انداز ہوتی سلگ سلگ کر ختم کر لوں گی خود کو، یہ ماموں بھانجیا کتنے بے حس سفاک اور کٹھور ہیں، کیا میں لگی جیسا اسٹینا اور ظرف رکتی ہوں؟) وہ پریشان ہو گئی تھی۔

”آئی مین آپ کو بال سے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ ہارٹ ہال تھی نا۔“ معا اس نے خود کو سنبھالا اور ڈھٹ بن کر سوال کیا۔

(جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسلوں سے کیسا ڈرنا، مجھے تمہاری بے نیازی اور لائقیت کے ساتھ جنگ کرنی ہے اور لگی کی طرح سے جیت کر دکھانا ہے۔)

”ارے نہیں بالکل پریشان نہ ہوں، کالج کا بنا ہوا نہیں ہوں کہ اتنی سی چوٹ سے ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا۔“ اس نے جیسے اس کی ڈھارس بندھائی مگر وہ سنجیدہ نہیں ہوئی تھی۔

”میں نے سوچا خیریت دریافت کر لوں اور یہ بھی پوچھ لوں پہلو کو ٹول کر دیکھیں اتنی زور سے حملہ ہوا تھا دل کہیں گر کر تو نہیں گیا۔“ اس کے کچھ میں جو معنی خیزی تھی وہ تو تھی ہی الفاظ بھی ہرگز معمولی نہ تھے وقاص نے چونک کر اس کی شرارت سے بچاؤ آنکھوں کو دیکھا پھر زہر خند سے مسکرایا۔

(دل تو جہاں گرنا تھا گر گیا، اتنی فرصت ہی نہ مل پائی کہ اٹھا کر دیکھ ہی لیں، ایسا کر کے کرنا بھی کیا تھا، اب وہ ہمارا رہا بھی کہاں، سسک رہا ہو گا پڑا نہیں۔)

”چلتی ہوں خواجواہ ڈسٹرب ہی کیا۔“ وہ بے دلی سے کہہ کر پلٹ گئی، وقاص کے چہرے پہ

چھا جانے والا اطمینان بڑا ہی بے ساختہ اور فطری تھا اسے ہونے والا داماد سمجھ کر جو خصوصی پروٹوکول دیا گیا تھا اس کی وجہ سمجھ کر وہ جیسے نئے سرے سے اذیت میں مبتلا ہونے لگا، اس پہ شہریار کے چٹکلے اور اٹھکیلیاں جسے سب ہی انجوائے کر رہے تھے ماسوائے اس کے جیسی وہ سب کے درمیان سے نیند کا بہانہ کر کے اٹھ گیا سب کے روکنے کے باوجود بھی، اگلی صبح بھی وہ بہت دیر سے بیدار ہوا کتنی بار لگی آ کے اس کا دروازہ ناک کر کے آوازیں دے کر گئی تھی مگر وہ جیسے کسی کا بھی سامنا کرنے پہ خود کو آمادہ نہیں کر پا رہا تھا دل بے حد بو جھل تھا مگر یہ بچت بھی کب تک ہو سکتی تھی۔

”آج اپنے نوٹسے میاں! ابھی تو منگنی نہ پیاہ آپ ابھی سے اتنا شرم رہے ہیں، بعد میں کیا حال ہو گا۔“ لیکن اسے زبردستی کمرے سے باہر نکال لائی تھی، ڈائینگ ہال جہاں اس پل بھی خاصی گہما گہمی تھی، سلطان شاہ اور تایا سا میں کے علاوہ قریباً گھر کے سبھی افراد اس وقت وہاں موجود تھے یقیناً اس کی وجہ سے ابھی تک کسی نے بھی ناشتا نہیں کیا تھا اسے خجالت نے آن لیا۔

”آؤ بیٹا بیٹھو۔“ ماما نے بالخصوص اٹھ کر اس کا استقبال کیا پیشانی چومی۔

”کچھ ہنسا بولا کرو اس عمر میں اتنی سنجیدگی۔“ انہوں نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ کر مسکرا کے کہا اور اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”شاید اس لئے کہ ان کے حصے کی بھی شوخیاں زوحا کے پاس ہیں۔“ ماہ نور نے بھی مزے سے کہا گویا وقاص کو چھیڑا تھا اسے بے دلی سے مسکراتا بڑا محض مروٹا۔

”دیکھ لیں ماما! آپ کی انویسٹ سی بی پی کیسے کیسے الزام لگ رہے ہیں۔“ زوحا نے گلاس میں تازہ مینگو جوس بھرتے ہوئے ٹھنک کر شکایت لگائی، وقاص نے بہت رشک سے اسے دیکھا۔

”کیسی بے فکر تھی وہ لڑکی! پرواہ نہیں کہ میں ہر قدم پہ کیسے اسے ناکامی سے دوچار کر رہا ہوں اور پھر بھی یہ کتنی مطمئن ہے، پتہ نہیں میرے اندر اتنا اضطراب کیوں بھر گیا ہے۔“

”ڈارلنگ آج وہ ریڈ والا سوٹ پہن کر تو دکھاؤ مجھے، قسم سے کیا غضب ڈھاتی ہو تم ریڈ کلر میں۔“ عین اسی پل شہریار ایزد کو ہوا میں اچھال کر کچ کر رہا ہوا پھر اس کی کلکھلاہٹ سے محفوظ ہوتا اندر داخل ہوا، فرمائش اپنے پہلو میں چلتی راہیل سے ہوئی تھی جو سب کے سامنے اس بے حجابی کے مظاہرے پہ محض اسے گھور رہی تھی۔

”گھور کیوں رہی ہو؟ کوئی غلط بات کہہ دی، بھئی اپنی بیوی سے فرمائش نہیں کروں گا تو کیا ملے والی ہے؟“ وہ اس کے خطرناک تیوروں کو دیکھ کر دہائی دینے کے انداز میں بولا تو راہیل نے بے طرح جل ہو کے حاضرین پہ ایک نگاہ ڈالی تھی اور بے چارگی سے شہریار کو دیکھا، جو خائف ہوئے بنا دانست نکال کر وضاحت کر رہا تھا۔

”خفا کیوں ہوتی ہو ڈارلنگ! اس میں حرج ہی کیا ہے، لوگوں کو بیویاں ہیں شوہر کی تعریف پہ کھلی جاتی ہیں ایک یہ محترمہ ہیں؟ آج دراصل میرا کہیں باہر کام دام کا موڈ نہیں گھر پہ ہی ہوں گا، اس تم ریڈ سوٹ پہننا جیولری اور میک اپ میں میچنگ کا خاص خیال رکھنا آج میں سارا دن تمہارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھوں گا اور وقت کو یادگار بناؤں گا۔“

وہ جتنا آس پاس موجود شخصیات کا خیال رکھے بغیر بول رہا تھا راہیل کو اسی قدر نفرت اور حجاب نے آن لیا تھا، اس نے غصے بھری آنکھوں سے گھورا مگر اثر لینے والوں میں سے تھا کہاں تب



رائیل نے سخت جھنجھلا کر ہاتھ کا مکہ زور سے اس کے کاندھے پر دے مارا تھا۔

”شرم کر لیں کچھ، سب یہیں ہیں۔“ وہ دانت پیس کر بولی، شہر یار اس کا دہکا دہکا سا چہرہ دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”وہ کیوں بھی! سب اپنے ہی تو ہیں، پھر وہ کیا ہے کہ جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم ہم کیوں کرم پھوڑیں۔“ وہ مزے سے کاندھے اچکا کر کہہ رہا تھا، رائیل خفت و شرم سے سرخ چہرہ لئے کسی سے بھی نگاہیں ملائے بغیر پیر پستی وہاں سے چلی گئی۔

”ارے باپ رے خفا ہو گئی، یار زو حاکم پڑنا اسے میں ذرا اپنی ڈار لنگ کو منالوں۔“ وہ ایک افراتفری کی کیفیت میں ایزد کو زو حاکم کے سپرد کر کے مصنوعی گھبراہٹ کا شکار ہوتا اس کے پیچھے بھاگا زو حاکم نے ایزد کو کاندھے سے لگاتے ہوئے بہت دھیان سے وقاص کو دیکھا، جو پتھر کے بت کی مانند ساکت تھا صرف آنکھیں تھیں جن میں غضب کی حد تیں اور لالی تھی، اس نے بے ساختہ گھبراہٹ میں جتلا ہو کر نگین کو دیکھا اس نے بھنوں کی مخصوص جنبش سے اسے ریلیکس رہنے کا اشارہ کیا تھا، مگر وہ ریلیکس نہیں ہو پائی ایزد کو صوحا کے حوالے کیا اور خود تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی، لان کی کھلی فضا میں آ کر فوارے کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے یوں گہرے گہرے سانس بھرے جسے اندر کی ٹھن کو باہر نکالنے کی سعی کر رہی ہو۔

”اچھی سے تھک جاؤ گی تو منزل پہ کیونکہ پہنچو گی زو حاکم؟“ نگین کی آواز پہ اس نے سر اونچا کر کے بہت افسردگی مگر آنسوؤں سے دھندلائی نظر سے اسے دیکھا۔

”پتہ نہیں منزل پہ پہنچ بھی پاؤں گی یا راستے میں ہی۔۔۔۔۔“

”اونہہ بری بات، یعنی صرف اداسی ہی نہیں مایوسی بھی سیٹ رہی ہو؟ ابھی سوچ لو یا مجھے تو لگ رہا ہے ہم اپنی ہستی اسکرانی زو حاکم کو کھودیں گے خدا نخواستہ دیکھو مجھے وقاص ہی نہیں بہر حال تم بھی عزیز ہو۔“ نگین کی بات سن کر اس نے سرعت سے بھیکے گال رگڑ ڈالے اور موڈ بدل کر ازلہ بشارت لہجے میں سمو کر بولی۔

”جی تو چاہتی ہوں یہ عزیزوں کا جوڑا ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے اور یہ آپ کے وقاص صاحب خود کو سمجھتے کیا ہیں؟ ارے ایسی کی تیزی ان کی، ایک بار شادی تو ہو لینے دو، پھر دیکھنا میں تمہاری طرح نہیں ہوں کہ شوہر کے رعب میں آ کر کھکھیا نے لگوں، انگلیوں پہ نہ نچایا آپ کے اس طرم خان کو تو زو حاکم نام نہیں۔“ اس نے بھی سی ناک چڑھا کر نخوت سے کہا تو نگین جیسے اسے سابقہ موڈ میں آتے دیکھ کر ہلکی پھلکی ہوئی۔

☆☆☆

تھکا گیا ہے مسلسل سفر اداسی کا

اور ابھی بھی ہے میرے شانے پہ سر اداسی کا

وہ کون کیسا گرہا جو بھیر گیا

خیرے گلاب سے چہرے پہ ذرا اداسی کا

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ پہلے سے زیادہ اداس پہلے سے غاموش اور ویران ہوتا جا رہا تھا، پریشے سے اپنے جانے کا ہٹا کر ایک طرح سے اس رنج و غم کی کمی، اس کے بعد

کتنی دیر تک وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں ہو سکا۔

میرے وجود کے خلوت کدے میں کوئی نہ تھا

جو رکھ گیا ہے دیا طاق پر اداسی کا

میں تجھ سے کیسے کہوں یار مہرباں میرے

کہ تو علاج نہیں میری ہر اداسی کا

یہ اب جو آگ کا دریا میرے وجود میں ہے

بہی تو پہلے پہل تھا شرار اداسی کا

نہ جانے آج کہاں کھو گیا ستارہ شام

وہ میرا دوست میرا ہم سفر اداسی کا

طارق کو لگا تھا اس کے دل کی جگہ پر ایک ویران سی بیکلی چل رہی ہے اس نے سرو صوفی کی بیک سے ٹیک کر آنکھیں موند لیں، کہ آنکھوں میں موجودگی کو پریشے سے غمی رکھنا چاہتا تھا۔

”میرا آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

سونیا جو اسی بل چائے کی ٹرالی سمیت اندر آئی تھی اسے دیکھ کر ایک دم چونکی اس کے چہرے پہ کچھ ایسی ہی بے تاب سی کیفیات رقم تھیں، طارق نے سرخ آنکھوں کو کھول کر صرف ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سے سر جھکا لیا۔

(کیا بتاؤں ابھی لڑکی! آپ کی دوست نے میرے دل میں کیسی برچھیاں اتار دی ہیں، اس طرح لئے ہیں کہ احتجاج تو درکنار شکوہ کرنے کا بھی حق محفوظ نہیں رکھتے، کیا کہیں کہ سب کچھ گنوا کر بھی ہمیں لب بستہ ہی رہتا ہے، یہ کیسی محبت ہے؟ یہ کیسے آداب ہیں جنہوں نے دل کو روگ لگا رہے۔)

”چائے لیجئے طارق!“ پریشے نے اس کی جانب کپ بڑھایا، وہ سنبھل سا گیا اور خواہش نہ ہونے کے باوجود کپ تھام لیا اور جب وہ چائے ختم کر چکا تو کچھ بھی کہے بغیر جانے کو اٹھ کھڑا ہوا تھا، آج اس نے اپنی نگاہوں کو بھی پابند کر لیا تھا اگر ایسا نہ کرتا تو شاید وہ خود یہ تمام ضبط کھودیتا، پریشے اس کی کیفیات سے بے خبر نہیں تھی کچھ بھی کہے بنا اس کے ساتھ چلتی باہر آ گئی، شاید دونوں پہلی مرتبہ اتنے خاموش اتنے کم صم تھے کہ ایک دوسرے کی موجودگی سے ہی بے خبر ہو گئے، صرف دکھ کا احساس سانس لیتا رہا تھا نارسانی سسکیاں بھرنی رہی تھی بھر کڑھتا رہا تھا۔

”مجھے ہمیشہ آپ کو خالی کر دینے کا دکھ افسردہ رکھے گا طارق! شاید میں مرنے کے بعد بھی شانت نہ ہو پاؤں، آج مجھے اپنی اس خواہش پہ ندامت محسوس ہوئی ہے جو میں نے آپ کے پھر سے ملنے دوبارہ سے دیکھنے کی کی تھی، اللہ جانے اس میں کتنی گہرائی کتنی شدت تھی کہ پوری ہو گئی اور۔۔۔۔۔“ اس نے لمحہ بھر کا توقف کر کے یوں ہونٹ پیچھے جیسے خود پہ ضبط کر رہی ہو۔

”کاش ہم دوبارہ نہ ملتے کاش مجھ سے آپ کو یہ دکھ نہ ملا ہوتا، مجھے بہر حال کوئی حق نہیں تھا آپ کو اپنے دکھوں میں حصہ دار بنانے کا۔“ وہ جیسے چلتے چلتے بہت تھک کر ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی اور اپنی بات کے اختتام تک بھرائی آواز یہ قابو نہ رکھ کر ایک دم سے رو پڑی، طارق نے جاتی ہوئی آنکھوں اور پیچھے ہوئے ہونٹوں سمیت اسے دیکھا تھا۔



”اور مجھے صرف اتنا دکھ ہے پریشانی کہ میں ان کڑے لمحات میں بھی شدید خواہش کے باوجود ان فاصلوں کو بانٹنے کو کوئی حق نہیں رکھتا، مجھے ان پابندیوں اور حد بندیوں نے مار ڈالا۔“ اس کے لہجے کی دیگری اور ملال نے پریشانی کے دل میں گویا شکاف ڈال دیئے، اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں، وہ جواسے ہی دیکھ رہا تھا، آہستگی سے نگاہ کا زاویہ بدل گیا۔

(مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ آپ نے مجھ سے بڑھ کر ماہ نور کے جذبات و احساسات کو اہمیت دی، وہ ایک بار پھر قسمت کی اوج پہ ہے اور میں آہ! یہ بھی ایک المیہ ہے، لوگ میری پالشڈ شائینگ پر سنائی پڑتے ہیں، مگر کون جانے میرے اندر اس ایک نام ماہ نور کی وجہ سے کتنے دیرانے آباد ہو چکے ہیں، رنجش در رنجش کے اس اذیت انگیز سلسلے نے میری روح کو زخم زخم کر ڈالا ہے اور وجہ ہر بار ماہ نور، پریشانی میری دیوانگی کی آخری حد ہے، ایسے ایسے احساسات کو وارد ہوتے دیکھا خود یہ کہ حیران ہوں ایسی وحشتوں سے گزر کر بھی صبح سالم ہوں ہوش ہوں، تو کیا میرے اندر ایمان کامل اور یقین واثق موجود ہے جو مجھے حواس باختہ نہیں ہونے دیتا، ورنہ ان مرحلوں سے گزر کر تو میں دیوانگی کے صحراؤں میں عمر بھر بھٹکتا پھرتا۔)

”او کے اب چلتا ہوں۔“ وہ خود کو سنبھال کر بہت ضبط سے بولا، پریشانی بس اسے دیکھے مئی، آج ان نظروں میں کیسی پیاس تھی، کیسی تڑپ تھی سیرابی کی تکمیل کی مگر اس نے نگاہیں جھکا لیں، دل شدتوں سے طلبگار تھا اسے روک لے جانے نے دے خاموشی سے اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جائے اور وصال کے سبھی موسموں سے آشنائی پالے مگر ایسا ممکن ہی کہاں تھا اس نے اپنی پیاس اپنی گنگنی کا سودا کیا تھا جیسی زبان کو سی لیا اور چلتا ہوا اس سے دور بہت دور ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ بصارتوں میں اس کا آخری عکس بھی نہ رہا، وہ آنکھوں میں آنسو لئے صبر اور ضبط کے ہر مرحلے سے نہایت کامیابی سے گزر گئی اور تھکے ہوئے قدموں سے واپس آگئی، آنکھوں میں مچلتے آنسو لئے اس نے سر کو تکیے میں گھسایا، جیتی ہوئی بازی کو ہارنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی مگر اس نے ہر معرکہ سر کر لیا تھا۔

”ماہ نور! تم بہت خوش بخت ہو، اس لئے بھی کہ میری کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے تمہاری خاطر خود کو جوگ دے لیا، وہ آج بہت افسردہ گیا ہے دل دکھا ہے اس کا بھی میرا بھی، اس کا خیال رکھنا کہ.....“ وہ ہچکیاں بھرتے ہوئے اپنے دکھ کو پروین شاکر کے الفاظ میں دہرانے لگی۔

ہوا کے ہاتھ اسے یہ پیام بھی پہنچے کہ میں نے اپنی محبت سپرد کی ہے تیرے سودیکھ میری امانت سنبھال کے رکھنا اسے بہار کی نرم ماہٹوں نے پالا ہے سو اس کو گرم ہوا سے بہت بھار رکھنا یہ گل عذار نہیں آشنائے سختی گل یہ ساتھ ہو تو بہت احتیاط سے چلنا مزاج اس کا ہواؤں کی طرح سرکش ہے سو اس کی جنبش آبرو کو دیکھتے رہنا

نہیں یہ سننے کا عادی نہیں رہا ہے کبھی سو اس کی بات وہ کیسی ہومانے رہنا اطاعت اس کی بہرگام اب ہے تیرا کام کہ خوش نصیب ہے تو اس کا ہم سفر ٹھہرا میں تیرہ بخت تھی اس سے چھڑ گئی کب کی بھٹک رہی ہوں گھنے جنگلوں میں اب تنہا تو اس کے لمس سے ہر روز زندگی پائے میں اس کے ہجر میں ہر رات مرگ لمس چکھوں تیرے گلے میں وہ ہر روز با نہیں ڈالتا ہے میرے بدن کو وہ حلقہ مگر نصیب نہیں وہ تیرے کتنا قریب ہوتا ہے

مگر میں اس کے بدن کی مہک کہاں ڈھونڈوں کہ اس کے شہر کی پاگل ہوا میں میرے گھر نہ جانے کون سی گلیوں سے ہو کے آتی ہیں کہ وہ مہک کہیں راستے میں چھوٹ جاتی ہے اس کی یاد میں ہوتی ہے اب تو صبح و شام ہوا کے ہاتھ اسے یہ پیام بھی پہنچے

وہ بالآخر ضبط کھو گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی، کمرے کے در و دیوار سے پردوں سے کونوں کھدوں سے ہر شے پہ اداسی نے غلبہ جما لیا، اس کا کراہیں اس کی سسکیاں بجائے گھنے کے بوہتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

درد اتنا تھا کہ اس رات دل وحشی نے ہر رگ جاں سے الجھنا چاہا! ہر بن مو سے ٹپکنا چاہا اور کہیں دور تیرے رخسار میں گویا پتہ پتہ میرے افسردہ لبوں میں ڈھل کر حسن ماہتاب سے آزرده نظر آنے لگا میرے ویرانہ تن میں گویا سارے دکھتے ہوئے ریشوں کی طنائیں کھل کر سلسلہ وار پتہ دینے لگیں مرحلہ قافلہ شوق کی تیاری کا اور جب یاد کی بجھتی شمعوں میں نظر آیا کہیں ایک پل آخری حرفوں میں تیری دلداری کا



درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا

ہم نے چاہا بھی مگر دل نے نہ ٹھہرنا چاہا

طارق شیرازی گھر پہنچا تو کھٹک اور آژردگی اس کے روم روم میں بسی ہوئی تھی وہ یوں آتے ہی بیڈ پر ڈھے گیا، جیسے ٹانگوں نے مزید وجود کا بوجھ ڈھونے سے معذوری ظاہر کر دی ہو، آج اس کی آنکھیں ہی نہیں پورا وجود جل اٹھا تھا، ایسی بے قراری تھی کہ کسی پل چین نہ آتا تھا، ایسے میں تسلسل سے بجتا ہوا سیل فون اس نے پھوڑے کی مانند دھکتے سر پہ تیل کی آواز سے پڑتی دھمک سے عاجز ہو کر سیل فون اٹھایا۔

مومو کالنگ کے الفاظ انگارے بن کر وجود میں چٹنے کال ریسیو کرنے کو دل ہرگز آمادہ نہیں تھا، مگر وہ حقوق کی یا محالی سے خائف تھا جی خود پہ جبر کے پہرے بٹھا کر کال ریسیو کر لی۔  
”اب بھی اینڈ نہ کرتے فون، کیا ضرورت تھی جہاں بیسویں بار کوشش ناکام ہوئی اب بھی ہو جانے دیتے۔“ وہ اس کی کچھ بھی سننے بغیر پھنکارنے لگی، طارق کا دھتکا سر جیسے پھٹنے کے قریب ہوا مگر ضبط کھوئے بغیر سانسیت سے بولا۔

”میں باہر تھا سیل گھر پہ بھول گیا تھا، تمہیں زحمت ہوئی میں معذرت چاہتا ہوں۔“ اس نے جواباً بہت شائستگی سے معاملہ سنبھالنا چاہا پریشے کے ضبط اور صبر نے اسے بھی گول رہنا سکھا دیا تھا، بہر حال اس کا دکھ پریشے سے بڑا نہیں تھا۔

”اوہ تو رے جاناں پہ حاضری تھی، پھر تو ڈسٹرب کرنے والا اس بلا کو بندہ دانستہ گھر چھو کر جاتا ہے۔“ اس نے کاٹ دار طنز کیا، طارق نے دانت پیس کر اپنا ضبط آزما لیا اور یقیناً اس کی خاموشی پہ ہی ماہ نور کا حوصلہ بڑھا تھا کس قدر حقارت بھرے مسخر سے گویا ہوئی۔

”تھا بھی نا وہ آپ منا آئے اپنی جان کو؟“ اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہی سیروں کے حساب سے خون جلایا تھا۔

”شٹ اپ۔“ طارق کا ضبط بس یہی تک تھا خلق کے بل چلایا۔

”ڈونٹ شاؤٹ! یہ چلانا مجھے بھی اچھی طرح سے آتا ہے۔“ وہ از حد بد لحاظی سے غرا کر بولی۔

”طارق میں کہہ رہی ہوں اپنی پوسٹنگ یہاں کروائیں، ورنہ میں ساری بات کھول کر آپ کے اور اپنے گھر والوں کو بتا ڈالوں گی۔“ اس نے آخری دھمکی دے ڈالی، طارق نے ٹھنڈا سانس بھر لیا۔

”ہونا وہی عام سی عورت۔“ طارق نے تنفر بھرے انداز میں چوٹ کی، جواباً وہ بھڑکی گئی۔

”ہاں ہوں وہی عام سی بیوی جو اپنے شوہر کی شراکت ہرگز گوارا نہیں کرتی۔“ اس نے طنز کے تیر چلاتے اپنے محاذ پہ کھل کر جنگ لڑنا شروع کی۔

”اور یہ کوئی بہت بڑی خوبی نہیں ہے، کم ظرنی اور کمینگی کی انتہا ہے، ہر کوئی پریشے نہیں بن سکتا

اور سنو میں تم سے ڈرتا ہوں نہ تمہاری دھمکیوں سے، اس کے علاوہ ایک بات اور سن لو، اگر آئندہ اس قسم کی باتیں کرنا ہوں تو مجھے کال کرنے کی زحمت مت کرنا، اللہ حافظ۔“ اس نے سیل کان سے ہٹایا سوچ آف کا بٹن دبا کر دور اچھال دیا، لحاظ اور مروت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، اگر وہ اس سے

عاری تھی تو کب تک برتاؤ بھی، وہ کتنی دیر بعد تک کھولتا رہا۔

اس کو کچھ کا کچھ بنا دیا ہے  
ہم نے تھوڑا سا دھیان دے کر  
اس کا دماغ بعد میں بھی سلگتا رہا، یہ ماہ نور تھی؟ وہ یقین کرنا بھی چاہتا تو نہ کر پاتا۔  
☆☆☆

اپنے ہونٹوں کی حرارت سے جگاؤ مجھ کو

یوں صداؤں سے دام صبح اٹھانا کیسا!

کمرے کی صفائی کے دوران رائیل نے متعدد بار اسے اٹھنے کو کہا تھا مگر وہ ان بنی کئے پڑا رہا مگر جب ایزد اٹھ کر رویا تب وہ جو وارڈ روپ سے شہر یار کے کپڑے نکال رہی تھی وہ بھی سب کچھ چھوڑ کر بھاگی آئی اور شہر یار تو گویا ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا، اس کا آپکل پڑ کر کھینچا اور اپنے اوپر کھینچ لیا، رائیل کے اوسان خطا ہوئے تھے مگر اسے ہتے دیکھ کر بے تحاشا تپ جڑھ گئی۔

”ہر وقت کا مذاق اچھا نہیں ہوتا شہری، ایزد رو رہا ہے اور آپ.....“

”مذاق نہیں جان مگر روئیں کہتے ہیں اس کو پچھلے ایک سال کی کھپت ہے جمع ہے، میں کیا کروں نہ مجھے چھوڑ کر جاتیں اور یہ ایزد اس کی تو بات ہی مت کرو نا، اس کی وجہ سے اب میں تمہاری توجہ کو ترسنے لگا ہوں پہلی فرصت میں اس کے لئے گورنس کا انتظام کرانا ہوں، حد ہے شوہر محترم بلا تے رہیں نہیں آئیں گی اور یہ چھٹکا ذرا سا منمنایا تو کیسے لبیک کہا۔“ وہ تو جیسے اتنا بھنایا تھا کہ کھس کر بولتا چلا گیا، رائیل کا تو منہ کھلا رہ گیا تھا۔

”شہر یار!..... ایزد بیٹا ہے آپ کا؟“

”تو..... بیٹا ہے تو؟“ اس نے ناک چڑھایا پھر اس پہ ایک عاشقانہ سی ہلکی ہلکی نگاہ ڈال کر بڑے انداز میں بولا۔

”یو نو بیہ!“

میں وہ حاسد ہوں جو اپنے بچے سے حسد کرتا ہے

اپنی ماں سے لپٹ جاتا ہے جب وہ پیار کے ساتھ

”اُف خدا یا! رائیل کا کانٹے ہوئے برا حال ہونے لگا۔“

”حد کرتے ہیں آپ بھی شہر یار!“ وہ ہنوز اسی طرح احتجاجاً چلاتے ایزد کو اٹھاتے ہوئے بولی، تو شہر یار نے برا سامنے بنالیا۔

”اب تم اس کا پیپر چینج کرو گی، اس کا منہ دھلاؤ گی، کپڑے پہناؤ گی، بار کتنی مرتبہ کہا ہے

مت کیا کرو ایسے گندے کام، اتنی ساری ملازمتیں کس لئے ہیں ان سے کہہ دیا کرو، تم بس میرے آگے پیچھے پھرا کر ونا۔“ آخری فرمائش یہ رائیل کے ہونٹوں پہ بے ساختہ مسکان چل اٹھی، ایزد کو

کاندھے سے لگا کر تھکتے ہوئے اس نے مجسم شوخ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”اصل بات یہی یہی ہے ویسے ماؤں کو اپنی اولاد کا کوئی بھی کام نہ گندا لگتا ہے، نہ ہی

ناگوار۔“ وہ ایزد کو دواش روم میں چلی گئی شہر یار ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا تھا۔  
☆☆☆



نظر میں ظلمت بدن میں ٹھنڈک جمال کتنا عجیب سا تھا  
میں اس کی چاہت میں گھر سے نکلا تو حل کتنا عجیب سا تھا  
نہ میں نے اس کو خطوط لکھے نہ اس نے میری پناہ چاہی  
دونوں کو اپنی اپنی بے رخی پہ ملال کتنا عجیب سا تھا  
ہاپنی مائل میں چاندیکھے میں اپنی مائل میں اس کو سوچوں  
بدلتے لمحوں میں سوچ کا یہ وصال کتنا عجیب سا تھا  
سفر اکیلے ہی کاٹ لوگے میں نے پوچھا تو رو پڑا وہ  
سوال کتنا عجیب سا تھا جواب کتنا عجیب سا تھا

لالہ میں موجود کین کی کرسی پہ بیٹھا وہ بے خیالی میں ہی سہی پودوں کو پانی لگاتی زوہا کو دیکھ رہا  
تھا جب تک اس کے ساتھ آکر بیٹھتے ہوئے اس کی توجہ کے مرکز کو پا کر کس قدر شوخی سے کھکاری۔  
”تو پھر کیا خیال ہے تمہارا؟“

”کس بارے میں؟“ وہ چونکا تھا اور نا فہم نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”اس کے بارے میں جیسے یہاں بیٹھ کر پچھلے آدھے گھنٹے سے دیکھ رہے ہو اور تمہارا دل نہیں  
بھرا۔“ ٹکین نے جس طرح شوخ انداز میں آنکھیں نہچا کر بتلایا تھا اس سے وقاص نے ٹھٹھک کر  
اسے دیکھا۔

”یہ کیسا الزام ہے مامی میں کیسے دیکھ رہا تھا؟“ اس کی حیرانی اس کی لائق بناوٹ سے پاک  
تھی ٹکین جانتی تھی مگر مقصد تو اسے گھیرنا تھا نا، جیسی مصنوعی ناراض سے بولی۔  
”اب ہم سے بھی پردہ داری ہو تو گے وکی!“ اور وقاص نے ٹھنڈا سانس بھر لیا تھا پھر بہت جل  
کر بولا تھا۔

”میں پوری کوشش کرتا ہوں جہاں رائیل ہوں وہاں سے ہٹ چاؤں، ہم یہاں سے کب  
واپس جائیں گے؟“ اس کے لہجے میں بے بسی اور اکتاہٹ بیک وقت تھی، ٹکین ایک ایسی سنجیدہ نظر  
آنے لگی۔

”ہاں وہ آغا آج کل بہت شوخ اور رو میٹھک ہو رہا ہے انکچو نیلی اس کا مزاج ایسا ہی ہے، پھر  
اب تو بہت عرصے بعد دونوں کی صلح ہوئی ہے اس لئے کچھ زیادہ ہی اتاؤلا ہو رہا ہے، ویسے میں  
رائیل کی نہیں زوہا کی بات کر رہی تھی۔“ آخری فقرے پہ زور دے کر گویا جتلیا تھا بالخصوص۔

وقاص ہونٹ پیچھے سر جھکائے بیٹھا رہا، عجیب بے خیالی کا سا انداز تھا ٹکین وثوق سے نہیں کہہ  
سکتی تھی اس نے کون سی بات اس کی سنی اور کس کو سمجھنے سے بھی قاصر رہا۔

”آپ نے مجھے کیوں یہاں بلایا تھا مامی! کوئی مقصد بھی تو ہو، ویسے میں آپ کو ہرگز اتنا  
کٹھور نہیں سمجھتا تھا۔“ خاص تاخیر سے اس نے سراٹھا کر شاکی انداز میں کہا ٹکین نے اس کی بات  
کے اصل مفہوم کو پایا اور آہستگی و نرمی سے مسکرا دی۔

”میں اسی حقیقت سے تمہیں روشناس کرانا چاہتی تھی لگے!“

”اور میں کہوں گا آپ نے صرف ظلم کیا ہے مجھ پہ، ایک طرح سے رستے ہوئے زخموں پہ  
نمک پاشی۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں پھنسا لئے۔

”وہ بہت محبت کرتی ہے تم سے اور محبت کی قدر نہ کرنے والے بہت خوار ہوا کرتے ہیں  
وکی!“ ٹکین کا انداز نا صحنہ تھا اس کی نگاہیں زوہا پہ ٹھہری تھیں جواب خیر دین ملازم کے ساتھ  
گوڈی کرانے میں مصروف تھی، پیازی ٹکر کا ٹراؤ زرنی پنک اور آف وائیٹ بڑے بڑے پھولوں  
کی لانگ شرٹ اور بڑا سا پیازی دوپٹہ گولڈن بالوں کی اونچی سی پونی جس کی کچھ لیشیں چہرے کے  
اطراف جھول رہی تھیں دکتی ہوئی گندمی رنگت جیسے نقوش اس پہ کم عمری کی مخصوص جاذبیت اور نکھار  
وہ ہرگز بھی نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں تھی۔

”مگر یہ وقاص.....!“ اسے وقاص پہ غصہ آنے لگا۔

”میں نے بھی بہت محبت کی تھی اور میرے خلوص میں بھی کوئی شک نہیں تھا۔“ وہ جیسے جھنجھلایا  
پھر ٹکین کے چہرے پہ ٹھہرے غصے کی دے بسی کے تاثر کو دیکھ کر کسی قدر عاجزی سے بولا تھا۔

”آپ مجھے میرے حال پہ کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟“

”نہیں چھوڑ سکتی، تم نے بھی غور کیا وقاص! کسی ماں کا بچہ کسی نا جائز غلط کام کی ضد کر رہا ہو  
ایٹھ رہا ہو تو ماں اسے اس غلط کام کی اجازت دے کر خود بے نیاز ہو جائے، نہیں سویت ہارٹ ایسا  
نہیں ہوتا۔“ ٹکین کے لہجے میں جو انہایت شفقت اور محبت کا رنگ تھا اس نے وقاص کے  
احساسات کو گداز کر دیا، اس کی آنکھیں یکھٹ بانٹیوں سے بھر گئیں۔

”ٹھیکس مامی! مگر پلیز آپ مجھے کچھ وقت تو دیں سنہلنے کے لئے۔“ وہ جیسے ان محبتوں سے  
دامن نہ چھڑا پایا ہار سا گیا۔

”ضرور دیتے اگر جو تم سنہلنے کی کوشش کرتے، تم ہاں کر کے تو دیکھو، زوہا میں بہت کوالٹیر  
ہیں، وہ تمہیں بہت خوبی سے سمیٹے گی۔“ ٹکین نے ہمت نہیں ہاری اور وقاص نے ہونٹ پیچھے لئے۔

(اب اور کیسے سمجھاؤں میں زوہا سے شادی سے اس لئے بھی بھلاگ رہا ہوں کہ اس طرح عمر  
بھر رائیل سے سامنا ہوتا رہے گا اور یہ بار بار کا سامنا میرے زخموں کو بھی مندمل نہیں ہونے دے  
گا، شاید میں عمر بھر نارسائی کے خار زاد جنگلوں سے باہر نہ نکل سکوں، مگر مامی آپ نے زندگی میں  
پہلی بار مجھ سے اتنی شدتوں سے اس قدر لجاجت سے کچھ مانگا ہے اور بار بار کا انکار مجھے خود اپنی  
نگاہوں میں گرا رہا ہے، میں خود کو معصوب بھلے ٹھہراؤں مگر یہ طوق گلے میں پہننے کو تیار ہوں، میں خود  
کو بار کر اس بات سے قطع نظر ہو کے کہ یہ فیصلہ مجھ سے کیا خراج وصول کرے گا خود کا حالات کے  
رحم و کرم پہ ڈال دیتا ہوں آپ کی محبت آپ کے خلوص کے طفیل۔)

اور ٹکین جو اس کی طویل خاموشی سے مایوس ہو کر اندر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی  
تھی وقاص کے پکارنے پہ چپ چاپ گردن موڑ کر بے دلی سے متوجہ ہوئی۔

”جانی مجھے آپ کا یہ فیصلہ منظور ہے۔“

اور ٹکین کو حج معنوں میں اپنی سماعتوں پہ شے محسوس ہوا تھا، وہ درمیانی فاصلہ گھٹا کر سرعت سے  
اس کے نزدیک آئی اور کس قدر خیر کس قدر غیر یقینی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر جوش سے سرسرائی آواز  
میں بولی تھی۔

”کیا کہا تم نے؟“ وقاص نے ایک نگاہ اس کے متمتاتے ہوئے چہرے کو دیکھا پھر سر جھکا کر  
بولا تھا۔



”مجھے زوحا سے شادی پہ کوئی اعتراض نہیں۔“ ٹکین پہ تو جیسے شادی مرگ طاری ہو گئی، وہ جوش جذبات میں اپنی خوشی پہ قابو نہیں رکھ سکی اور بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

”تھینک یو وقاص، تھینک یو سوچی، تم نے میرا سرخسے سے بلند کر دیا مجھے ایسی خوشی دی کہ بیان سے باہر ہے۔“ وہ یونہی اس کے ساتھ لگی رہ کر زور زور سے ہستی ہوئے بولنے لگی، جبکہ وقاص تو ایک دم شپٹا گیا تھا، خفت و خجالت سے سرخ چہرے لئے سرعت سے پیچھے ہٹا۔

”افوہ مامی! کیا کر رہی ہیں پٹوائیں گے مجھے۔“ اس کی بوکھلاہٹ نقطہ عروج پہ جا پہنچی رنگت الگ دیک رہی تھی، ٹکین کو اس کی حالت نے لطف دیا تو اونچے سروں میں ہتھکڑی لگانے لگی۔

”کیا کر رہی ہوں لاڈ اٹھا رہی ہوں تمہارے اور کون ہے جو تمہیں کچھ کہے۔“ وہ اکڑ کر بولی، وقاص نے پچھنے ہوئے انداز میں اسے دیکھا۔

”بھلے آپ میری مامی ہیں مگر اتج میں کچھ سال چھوٹی ہی ہوں گی، مجھ سے براہ کرم آئندہ ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ بس ماموں سے ہی کیجئے گا۔“ اس کے اوسان ابھی تک خطا تھے، ٹکین اب کی بار خود بھی خفیف سی ہو گئی۔

”شرم تو نہیں آتی تمہیں وکی! میں تمہیں بس اپنی اولاد سمجھتی ہوں تو اس لئے۔“

”جی اس لئے تو کہہ رہا ہوں آئندہ احتیاط کیجئے گا ماموں بھی غلط نہیں کا شکار ہو سکتے ہیں۔“ وہ اب واقعی اسے چھیڑ رہا تھا، ٹکین نے ترچھی نگاہوں سے اسے گھور کر دیکھا۔

”وہ تو خیر نہیں البتہ تمہیں زوحا کی فکر ستا رہی ہو گی ہے نا؟“ اس کی شوخی بھری برجستگی نے وقاص کے چہرے پہ ایک سایہ سالہر ادا کیا۔

”جی بالکل آپ مترم کی سالی بھی ہوتی ہیں سو احتیاط تو ضرور ہونی چاہیے۔“ زوحا جو انہیں دیکھ چکی تھی نزدیک آنے پہ ابھی آخری بات سن سکی تھی اس کے مطابق چپک کر کہا، ٹکین نے گھور کر اسے دیکھا پھر بولی تھی۔

”تم بھی یاد رکھو میں تمہاری ساس بھی ہوں گی سو تمہیں زیادہ محتاط رہنا ہو گا۔“

”ڈونٹ وری! میں میاں کو مٹھی میں ایسا دباؤں گی کہ صرف میرے اشاروں پہ ناچے گا، آزمائش شرط ہے۔“ زوحا نے جواباً زلی شوخی اور کس قدر بے باکی سے کہا اور بالخصوص وقاص کے چہرے کا تاثر ملاحظہ کیا جہاں ہمیشہ کا سکوت چھا چکا تھا اس کا موڈ ایک دم سرد ہو گیا۔

”ایکسکیوز می مجھے ذرا کچھ کام ہے۔“ وہ نخوت سے کہتی پلٹی تھی کہ وقاص نے بے اختیار اسے پکار لیا۔

”مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا تھی۔“ اس کی متحیر پھیلی غیر یقین آنکھوں میں اپنی نظریں گاڑ کر وہ اس سنجیدگی و متانت سے بولا تھا ٹکین نے بے ساختہ انڈی مسکراہٹ دیا۔

”ہاں ضرور میں ذرا دیکھوں صوحا کدھر ہے مجھے اس سے بھی کچھ کام ہے۔“ ٹکین تیز قدموں سے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی، دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے اور خاموش بھی وقاص سر جھکائے جیسے تمہید باندھ رہا تھا جبکہ زوحا پہلی بار کچھ کنفیوژڈ تھی، مگر جب وہ اسے وہاں روک کر خود شاید اسے فراموش کر گیا تو زوحا کو اسے یاد دلانا پڑا تھا۔

”آپ کچھ کہنا چاہتے تھے؟“ وقاص جو غیر شعوری طور پہ جیب سے سگریٹ کیس نکال کر

سگریٹ ہونٹوں میں دبا چکا تھا کس قدر چونکا، زوحا الجھن آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”آپ اسموکنگ بھی کرتے ہیں؟“ لفظ بھی پہ زور تھا انداز عجیب تھا یا وقاص کو محسوس ہوا، اس نے سگریٹ ہونٹوں سے نکال لیا۔

”جی کچھ عرصے سے۔“

”جب سے محبت ہوئی یا جب سے محبت میں نا کامی؟“ وہ سرد نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی

وقاص کے چہرے پہ یکنخت سنجیدگی کی کیمیوٹا بکھر گئی۔

”مجھے آپ کے سوالوں سے زیادہ آپ کا لہجہ فیل ہوا ہے زوحا! میرے جو بھی پرالہز ہیں آپ سے ڈھکے چھپے نہیں مامی کہتی ہیں آپ میں بہت سارے شیش ہیں، مجھے سنبھال اور سمیٹ سکتی ہیں، حالانکہ نہ تو ابھی سنبھلنے کی خواہش ہے نہ سمیٹنے کی، عین ممکن ہے آپ کو بہت ضبط اور حوصلے آزمانا پڑیں، ابھی میں نے مامی کو آپ کے لئے رضا مندی دی ہے، میں جیسا ہوں آپ کے سامنے ہوں ایک بار پھر سوچ لیجئے، ہو سکتا ہے میں آپ کے کھرے خالص اور شفاف جذبات کی اس انداز میں پذیرائی نہ کر سکوں کہ میرے اندر اس ایکسیڈنٹ نے سب کچھ کول کر دیا ہے۔“ زوحا نے ایک نظر اسے دیکھا وہ تھکا ہوا اور پشیمردہ نظر آتا تھا، اس نے ایک گہرا سانس بھرا اور آہستہ سے مسکرائے گی۔

”تھینکس وقاص! تھینکس فار دس آن! مجھے ہمیشہ اس بات پہ فخر رہے گا کہ میرا شریک حیات اندر باہر سے ایک دم کھر انسان ہے اور وہی ہے جس کی میرے دل نے چاہ کی اور میرے رب نے اس چاہ کو قبولیت کا اعزاز بخش کر سرخرو کر دیا، جی بالکل صحیح کہتی ہے میرے اندر بہت کوالٹیز ہیں، میں بہت ضبط و حوصلے امت اور میرے ساتھ اپنے ساتھی کے اپنی جانب پلٹنے کا انتظام کروں گی۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی، پروقار انداز میں چلتی اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی، وقاص نے ایک گہرا سانس بھرا اپنے تئیں ہوئے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا وہ خود کو کس قدر ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

مجھے ایک دل کی تلاش ہے جس میں میرے لوگوں کے سکھ سانس لے سکیں

جگنوؤں کے دل نہیں ہوتے

میرے لوگ امن اور آزادی کے بغیر پیدا ہوتے ہیں زندہ رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں

ہم نے اپنے حق میں بولنا چاہا

ہماری آوازیں ہمارے حلقوں سے چپک گئیں

ہم وہ بندے ہیں حکمران جن سے جمع تفریق کا کھیل کھیلتے ہیں

کانچ کی آنکھ میں بصارت نہیں آتی

میرے پاس آواز ہے گیت نہیں

تمہارے پاس گیت ہیں آواز نہیں

آؤ اس گیت کو مل کر گائیں، کیونکہ پرندے گانا بھول چکے ہیں

میں انہیں امن کا گیت سنانا چاہتا ہوں اور مجھے داد میں نفرت ملی ہے



شاید میرے لوگ موت سے سمجھوتہ کر چکے ہیں  
آؤ ہم بھی موت کے پروانے پر دستخط کریں

شاید اس سے ہم اپنے لوگوں کے لئے آزادی خرید سکیں

شہر یار نے نظم کھل کی اور تو صیف طلب نگاہیں راتیل پہ جمادیں، جس کی آنکھوں میں الجھن  
تیر رہی تھی۔

”افوہ گھب چپ کیوں بیٹھی ہو بتاؤ نا کیسی لگی یہ نظم تمہیں؟“

”یہ کیسی نظم سنائی ہے آپ نے مجھے؟ یہ آپ کے انتخاب میں کیسے شامل ہو گئی؟“ اس کا انداز  
ٹھٹھکا ہوا تھا، شہر یار سر کھجاتے ہوئے ہنس پڑا۔

”یار اساری زندگی رو مینک شاعری تو نہیں سنا سکتا پھر تم عاجز بھی تو آئی ہونا، میں نے سوچا  
ذرا ٹریک بدلتے ہیں، چیخ تو ہونا چاہیے لائف میں۔“

”کس قسم کا چیخ لانا چاہ رہے ہیں آپ اور آج کل مشاغل کیا ہیں سارا سارا دن غائب  
رہتے ہیں۔“ راتیل نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا، شہر یار کچھ ہنسیا۔

”تمہیں بتایا تو تھا جاب کی تلاش میں ہوں، ویسے بھی بے فکر ہو جاؤ، جس طرح تم نے اپنا  
اسیر کیا ہے نا مجھے مشکل بلکہ ناممکن ہے اس حسن کے فسوں سے نکل کر کچھ اور دیکھنے کے قابل ہو  
سکوں۔“

”میں یہ پوچھ رہی ہوں آپ کو جاب کی ضرورت کیا ہے؟ یہ اتنی وسیع جائیدادیں زمینیں ان  
کی دیکھ بھال کریں آرام سے جیسے آپ کے پرکھوں میں سب مرد کرتے آئے ہیں۔“

”نہ بابا میں تو نہیں کرتا یہ بورنگ کام پھر اس کے لئے تایا سا میں پایا اور بھائی ہیں نا میں نہیں  
خود کو کھپاؤں گا۔“

”تو پھر آپ کیا کریں گے؟“ راتیل نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو شہر یار جیسے کسی سوچ میں  
ڈوب گیا۔

”میں اپنے گناہوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں اسی دنیا میں۔“ اس کا انداز گم صم کھویا ہوا سا تھا،  
راتیل زور سے چوٹی۔

”کیا مطلب؟“ اس کا دل جانے کیوں دھڑکنے لگا۔

”بیہ میں..... میں کشمیر کے لئے جہاد کرنا چاہتا ہوں اور.....“ اس نے راتیل کا ہاتھ جکڑ لیا تھا  
مگر راتیل نے کرنٹ کھانے والے انداز میں ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں  
سے اسے دیکھنے لگی۔

”دیکھو کل سے میری بات سنو میں بہت دنوں سے تمہیں آگاہ کرنا چاہ رہا تھا مگر تمہارے  
رد عمل سے خائف تھا، بیہ مجھے جب سے وہاں کے حالات اور اپنی گورنمنٹ کی بے حسی سے آگاہی  
ہوئی ہے میں بہت اپ سیٹ ہوں بھی سوچا نہیں تم نے بیہ ہم لوگ کتنے بے حس ہیں خود غرض  
سفاک، وہ ہمارے وطن کا حصہ ہے گویا ہمارے وجود کا ایک حصہ وہاں ظلم ہے جبر ہے اور زیادتی کا  
بازار گرم ہے، مگر ہم سب اپنی اپنی دنیاؤں میں گم موجد مستی میں محو ہیں، مگر اب، اب میں مزید یہ  
بے حسی کی چادر اوڑھ کر نہیں بیٹھ سکتا، میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں وہاں جاؤں گا اور اپنے حصے کا

نرخ بھاؤں گا۔“

”شہر یار!“ راتیل کے حلق سے سرسراہٹ زدہ آواز برآمد ہوئی۔

”یہ ساری باتیں کہاں سے سیکھ لیں، کس نے آپ کو اس راستے پہ لگا دیا، میں نہیں جانتی مگر یہ  
تو سوچیں آپ ماما کے لئے کیا ہیں، ساہبا سال کی دعاؤں التجاؤں کے بعد انہوں نے آپ کو پایا تھا  
اور جب آپ کا ایکسڈنٹ ہوا اور میں بتا نہیں سکتی شہر یار ان کی کیا حالت تھی، خدا نخواستہ اگر تمہیں  
کچھ ہوتا تو شاید وہ پہلے مر جاتیں، صرف وہی کیا پایا ماما ہم سب، شہر یار، میں آپ کو ایسا نہیں کرنے  
دوں گی ہرگز نہیں، تمہیں آپ کی ضرورت ہے، بس آئندہ بھی ذکر بھی نہیں کرنا آپ نے گناہ کے  
ازالے اور معافی کے اور بھی طریقے ہیں۔“ اس نے جیسے بات ہی ختم کر دی شہر یار خاموش ہو گیا  
تھا مگر بات ختم نہیں ہوئی، شہر یار کی سرگرمیاں ختم ہوئی تھیں نہ اضطراب وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر  
سگریٹ پھونکتا کمرے سے نکل کر رات بھر ٹہکتا رہتا، راتیل حیران ہوا کرتی یہ وہی شہر یار ہے اسے  
یقین نہ آتا۔

”کیوں کر رہے ہیں ایسا؟“ اس رات بھی وہ بے چین سا ہو کر ٹیرس پہ نکل آیا تھا جب راتیل  
اس کے پیچھے باہر آئی تھی۔

”مجھے سکون نہیں ہے بیہ! مجھے کسی پل چین نہیں ہے، تم نے کبھی کشمیری عورتوں کی تار تار نہ ہوئی  
چادر میں دیکھیں جن میں وہ اپنا آبرو باختہ وجود چھپانے کی کوشش میں جب ناکام ہوتی ہیں تو کیسی  
بے بسی کے آنسو بہاتی ہیں، تم نے وہاں کے بڑھے اور جوانوں کے بے دردی سے بہتے خون کو  
دیکھا؟ میں دیکھتا ہوں آؤ تمہیں بھی دکھاؤں تمہیں بھی پتہ چلے دکھ کیا ہوتے ہیں بے بسی اور اذیت  
کیا ہوتی ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا بیڈ روم میں لے آیا، سی ڈی پلیئر آن کیا اور ایک سی  
ڈی ڈسک منتخب کر کے لگائی۔

یہ ڈا کو منٹری فلم تھی جس میں کشمیری جوانوں کی کچھ لاشیں اٹھائے ایک انبوہ جنازہ گاہ کی سمت  
رواں دواں تھا بین کرنی عورتیں روتے ہوئے بچے اور غم زدہ مرد، صرف یہی نہیں وہاں ڈھانے  
جانے والے مظالم کی بھی عکس بندی کی گئی تھی، بھارتی فوج بے دردی سے مظلوم عوام پہ لاٹھی چارج  
کر رہی تھی، راتیل کا ضبط جواب دے گیا تو اٹھ کر آف کا بٹن دیا تھا، شہر یار نے دیکھا اس کا چہرہ  
متغیر اور ہونٹ کپکپا رہے تھے، وہ دکھ اور اذیت کی جانے کس منزل پہ کھڑا تھا مگر بہت ضبط سے  
سکرایا۔

”اپنی خاموشی اور بے حسی کو ہم کیا نام دیں گے بیہ؟ بے غیرتی کا یا پھر بے شرمی کا۔“ وہ زہر  
خند سے بولا تھا، پھر سختی سے ہونٹ پیچ لے۔

”یہ..... یہ لوگ ہمارے اپنے ہیں اور ہم ان سے بے خبر ہیں، ہم جن کے پاس طاقت بھی  
ہے اور دولت و اقتدار بھی، ہم بھی تنگ دوسرے بے حسوں کی طرح خاموشی سے ان کی بے بسی اور  
بہتے خون کو دیکھیں گے؟ کل روز محشر خدا کے سامنے شرمندگی اٹھائیں گے۔“

”آپ کو اس راستے پہ کس نے لگا دیا۔“ خاص تاخیر کے بعد راتیل نے سوال اٹھایا تھا۔

”میرے ایک دوست ایک خیر خواہ نے وہ بھی پاکستانی ہے، مگر کشمیری مجاہدین کے ساتھ  
دفاعی جنگ لڑ رہا ہے۔“ راتیل نے جواب نہیں دیا خاموشی سے جا کر بیڈ پہ دراز ہو گئی، شہر یار سوچتی



نظروں سے اس کا چہرہ اچھا چ رہا تھا۔

☆☆☆

اور تیرے شہر سے جب رخت سفر باندھ لیا  
درو دیوار پہ حسرت کی نگاہ کیا کرتے  
چاند بجلائی ہوئی شام کی دہلیز یہ تھا  
اس گھڑی ہم تیرے مجبور سفر کیا کرتے  
ہم نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا  
دل ٹھہر جانے کو کہتا تھا مگر کیا کرتے  
جس طرح یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو  
کچھ اس طرح کی کیفیت آج بھی ہے  
جس طرح کوئی قیامت ہو گزر جانے کو  
جس طرح کوئی کہے پھر سے پلٹ آنے کو  
مگر کس طرح کہ ہم نے تو

تیرے شہر سے رخت سفر باندھ لیا

پریشے نے ایک سرد آہ بھری اور آنکھوں میں اترتے آنسوؤں کو ہتھیلی کی پشت سے رگڑ کر  
صاف کیا اور قدم بڑھاتی پورٹیکو میں آگئی، جہاں سالار درانی اور سونیا اسی کے منتظر تھے، سالار درانی  
بیٹ میں کو کچھ ہدایات دے رہے تھے اس نے رک کر بغور سنی۔  
”اور پلیز اس گلاب کے پودے کا بہت خیال رکھنا ہر روز پانی ضرور دینا، سوکھنے نہ پائے،  
تب تک جب تک پاپا لوٹ کر نہیں آ جاتے، پھر یہ پاپا کی ذمہ داری ہوگی، ٹھیک ہے نا پاپا۔“ اس  
نے لان کے ایک حصے میں اپنے ہاتھ سے لگائے گلاب کے پودے پہ آخری الوداعی حسرت زدہ  
نگاہ ڈال کر سالار درانی کو مخاطب کیا، سالار درانی نے اس کی بات سنی تھی اور سختی سے ہنسنے لگے۔  
کے ساتھ پلٹ کر گاڑی کا لاکڈ دروازہ کھولنے لگے۔

”السلام علیکم!“ بھی طارق شیرازی نے قریب آ کر انہیں چونکا دیا، اس کی خاموشی مگر گہری  
نگاہیں پریشے کے زندگی کے احساس سے عاری چہرے کا بے تابی سے حصار باندھ گئیں۔  
”علیہم السلام کیسے ہو بیٹا! اچھا کیا آپ آ گئے، میں خود کو اس قابل نہیں پاتا کہ ڈرائیو کر  
سکوں۔“ سالار درانی نے بہت بے تابی و اضطراب بھرے انداز میں اسے گلے لگایا یوں جیسے کسی  
جذباتی سہارے کے ہی منتظر ہوں، ان کا لہجہ بے حد بوجھل ہو رہا تھا، طارق نے آہستگی سے انہیں  
تھک کر خود سے الگ کیا پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر انہیں بیٹھنے میں مدد دی، سونیا دوسری سمت سے  
جا کر ان کے برابر بیٹھ چکی تھی، پریشے نے ایک نگاہ طارق شیرازی کے چہرے کو دیکھا اور خاموشی  
سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر سیٹ سنبھال لی، گاڑی کا انجن ہلکے سے غرایا اور بہت سک  
رفتاری سے آگے بڑھ گئی، ان کے بیچ ایک جان لیوا خاموشی آ کر ٹھہر گئی تھی، ہر فریق اپنی اپنی جگہ  
اذیت اور کرب کا شکار تھا، پریشے کی نگاہیں گاہے بگاہے طارق شیرازی کے چہرے پہ بھٹکنے لگتیں جو  
ہونٹ ضبط کی کوشش میں مسلسل ہنسنے ہوئے تھا، اس کا اپنا دل سکھنے لگا۔

ہم نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا  
دل ٹھہر جانے کو کہتا تھا مگر کیا کرتے  
جس طرح یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو  
کچھ اس طرح کی کیفیت آج بھی ہے  
جس طرح کوئی قیامت ہو گزر جانے کو  
جس طرح کوئی کہے پھر سے پلٹ آنے کو  
مگر کس طرح کہ ہم نے تو

تیرے شہر سے رخت سفر باندھ لیا

آنسوؤں پہ اختیار نہیں رہا تھا جیسی اس نے غیر محسوس انداز میں رخ موڑا اور کھڑکی سے باہر  
دیکھتے جی بھر کے نیر بہائے مگر دل کا بوجھ تھا کہ بڑھتا جاتا تھا دل تھا کہ اس دشمن جاں کو دیکھنے کی  
حسرت میں مچلتا رہا مگر اس نے دل پہ پہرے بٹھا دیے، اسے مچلتے تڑپتے چھوڑ کر، فوجی جیب  
اسلام آباد ایئر پورٹ کی شاندار عمارت کے سامنے پارکنگ میں جا کر رک گئی، طارق شیرازی نے  
باہر آنے کے بعد پریشے کی طرف آ کر دروازہ کھولا سالار درانی اور سونیا بھی باہر نکل آئے تھے۔  
”دنیا میں معجزے اب بھی رونما ہوتے ہیں پریشے! اور تمہارے لئے میں اپنے رب سے کسی  
معجزے کا ہی منتظر رہوں گا، تم ٹھیک ہو کر جب آؤ گی تو میں سمجھوں گا یہ میری دعاؤں کا اعجاز ہے،  
پھر تمہاری یہ ذمہ داری ہوگی کہ تم اپنے آپ کو میری پناہوں میں سوئپ دو۔“ وہ اس کے نزدیک  
جھٹک کر اتنی آہستگی سے بولا تھا کہ وہ تشکل سن پائی اور اس کے جیسے ہی بھر میں سرد ہو گئی اس نے  
نگاہیں اٹھا کر دیکھا، ان دلکش ساحر آنکھوں میں اس کے جگنو جگنو گارے تھے، اس نے سر جھکا لیا۔  
”آپ کو صرف صبر کرنا ہو گا طارق! اس لئے بھی کہ لوح تقدیر پہ لکھی تحریریں ہی بدلا نہیں  
کرتیں، ہمیں خدا کے اس فیصلے میں راضی بہ رضا ہونا ہے، میری طرف سے اب ہر آس اور امید کو  
ختم کر دیں، میں لوٹ کر آنے کے لئے نہیں جا رہی، بھول جائیں طارق کہ بھی کوئی پریشے آپ کی  
زندگی میں آئی تھی۔“ اس نے جواباً اتنی رسائیت سے کہا تھا کہ طارق چپ کا چپ رہ گیا اور پھر  
جب تک فلائیٹ کی اناؤنسمنٹ نہیں ہوئی سالار درانی اور سونیا نے دانستہ انہیں تنہا چھوڑ دیا۔

”طارق کچھ سناؤں آپ کو؟“ وہ اس کی حسرت و یاس زدہ نگاہوں سے نظریں چرا کر بولی  
طارق کیا کہتا بس اسے دیکھتا رہا اور پریشے نے خود پہ ضبط اور حوصلے کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھے، پھر خود  
کو سنبھال کر آہستگی سے کہنے لگی۔

وصال رت کی وہ پہلی بارش ہی سرزش تھی  
کہ ہجر موم نے رستے رستے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔

تمہارے ہاتھوں کا لمس جب بھی  
میری وفا کا ہتھیلیوں پر چنا بنے گا تو سوچ لوں گی  
رفاقوں کا سنہرا سورج غروب کے امتحان میں ہے  
ہمارے ہاتھوں سے گر بھی تیلیوں کی خوشبو گزرنے پائے  
تو یہ نہ کہنا کہ تیلیوں نے گلاب رستے بدل لئے ہیں



اگر کبھی کوئی شام یوں بھی اترے کہ جس میں ہم تم لگیں پر اے  
تو جان لینا کہ شام بے بس تھی شب کی تاریکیوں کے ہاتھوں  
تمہاری خواہش کی بند مٹھیاں بے دھیانی میں تھلیں جو  
تو یقین کرنا کہ میری چاہت کے جگنوؤں نے  
تمہارے ہاتھوں کے لمس تازہ کی خواہشوں میں  
بڑے گھیرے اندھیرے کاٹے

لظم پڑھتے اس کی مدھم آواز پہ آنسوؤں کی نمی نے غلبہ پایا تو کچھ ساعتوں کو خاموش ہو کر گویا  
خود پہ قابو پانے لگی، آنکھوں کے زیریں کناروں اور ناک کے نازک حصوں میں تیرے والی سرخی  
اور نازک کانٹے ہونٹ اس کے ضبط بکھر جانے کے گواہ تھے، طارق یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا، ان  
آنکھوں میں آج اس صورت کو نگاہوں میں محفوظ کر لینے کی ایک مجنونانہ سی خواہش تڑپ رہی تھی،  
دونوں بے بس تھے، دونوں ہی مجبور تھے تو روادار بھی ایک دوسرے کے احساسات و جذبات کے  
قد دان جی تیرے نے خود کو سنبھالا اور آنسوؤں کو گالوں پہ اترنے سے قبل ہی پی لیا اور بڑے  
حوصلے سے مسکرا کر پھر گویا ہوئی۔

مگر یہ خدشے یہ دوسرے تو تکلفا ہیں  
جو بے ارادہ سفر یہ نکلیں تو یہ ہوتا ہے تو ہوگا  
ہم اپنے جذبوں کو بخند رائیگانوں کے سپرد کر کے  
یہ سوچ لیں گے کہ ہم ہجر موسم  
وصال کی پہلی شام ہی سے  
سفر کا آغاز کر چکا تھا

ایک بار پھر دونوں کے مابین خاموشی در آئی، سسکتی کر لاتی اور بین کرتی ہوئی چپ جس میں  
ہجر لامتناہی کا ایک طویل سلسلہ تھا۔  
”پریشے اپنا کانٹلیٹ نمبر.....“ معا طارق کو خیال آیا تھا، پریشے نے اسے ملتی نگاہوں سے  
دیکھا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنا ہر رابطہ اسی سرزمین پہ دفن کر جائیں۔“ اس نے نرمی سے کہا  
اور طارق کے اندر یکا یک خالی پن اتر آیا، فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا، ڈیپارچر لاؤنج میں  
ایک خوشگوار سی افراتفری کا سماں یہاں وہاں پھیل گیا، پریشے بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور الوداعی  
نگاہیں اس کے لمحہ بہ لمحہ مضطرب ہوتے چہرے پہ جمادیں۔

”اجازت دیں طارق!“ اور طارق کی ضبط میں سرخ بڑتی آنکھیں اس کے چہرے پہ آن  
جھیں، دونوں جتنا خود کو مضبوط ظاہر کر رہے تھے اتنے مضبوط ہرگز نہیں تھے، اندر اکھاڑ بچھاڑ جاری  
تھی۔

(اگر میری اجازت سے تمہیں جانا ہوتا تو کبھی نہیں جاپا تیں)۔  
پریشے کا تو اس سے ٹپکی پیتھک کانٹلیٹ تھا، اس کے ہونٹوں پر اضمحلال بکھر گیا۔  
”چلیں اجازت نہ سہی رخصت ہی کر دیں۔“ وہ اسے نہیں اب اپنی جانب آتے سالار درانی

اور سونیا کو دیکھ رہی تھی۔

”نی امان اللہ۔“ طارق کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

”مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے طارق کہ ماہ نور کا خیال رکھیے گا، میری اس قربانی کو ضائع  
ہونے سے بچا لیجئے پلیز، آئی نوڈیٹ کہ آپ ایکسپریس بہادر اور دیانت دار انسان ہیں۔“ پریشے نے کہا  
تھا، طارق کی آنکھوں میں موہو دسریاں گہری ہو گئیں، وہ سالار درانی سے الوداعی مصافحہ کرنے  
لگا، اس کے بعد پھر سے پریشے کی جانب متوجہ ہوا تو وہ اپنے ضبط کا حوصلہ آزمایا ہی تھی کچھ کہے بغیر  
آگے بڑھی اور اس کے کوٹ کی جیب میں اگلے سن گلاسز نکال لئے، طارق حیران نہیں ہوا تھا،  
بہر حال اتنا تو وہ ایک دوسرے دجانے لگے تھے۔

”اور میں؟“ اس نے اب عجیب خواہش کر ڈالی حالانکہ اس نے کبھی اس سے قبل کسی کے  
آگے دست سوال دراز نہیں کیا تھا مگر وہ پریشے ہی جس نے اس کی زندگی میں آ کر انقلاب برپا کر  
دیئے تھے۔

”آپ کو پتہ تو ہے طارق! پریشے بہت کم ظرف ہے، آج تک آپ کو کچھ بھی نہیں دے  
پائی، پھر اب کیسے کچھ دے سکتی ہے۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پلٹ کر تیز قدموں سے  
چلتی مسافروں کے اثر دھام میں غائب ہوتے سالار درانی کے ہم قدم ہو گئی، پیچھے طارق شیرازی  
رہ گیا تھا اس کے نشان قدم کو چھوٹا ہوا۔

آنے والے تیرے رستے میں بچھاؤں آنکھیں  
جانے والے تیرے قدموں سے لپٹ کر رولوں

”میجر پلیز! واپس لوٹ جیئے اپنی دنیا میں اور پریشے کی خواہش کے مطابق نئے سرے سے  
زندگی کو ویلکم کہیے۔“ سونیا کی آواز پہ وہ چونک کر متوجہ ہوا۔  
”آپ.....؟“ سونیا نے ہراساں کھینچا۔

”میری فلائٹ میری منتظر ہے بس جارہی ہوں واپس ملتان، خدا حافظ۔“ اس نے ہاتھ ہلایا  
تھا، طارق بوہل قدموں سے واپسی کے راستوں پہ ہولیا، جواب بے تحاشا گنجگک ہو چکے تھے۔  
(جاری ہے)

☆☆☆



”معاف کرنا بی بی سائیں! پر رات ہو رہی ہے اندھیرا بڑھ رہا ہے، ہمیں جویلی.....“  
 ”مجھے جانا ہے تو جا، ہم نہیں جا رہے۔“ وہ شان بے نیازی سے بولی تھی اور وہ بے چاری منہ لٹکا کر رہ گئی تھی اسے آگے سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتی تھی اور وہ آنکھیں بند کیے اپنے کھنسل میں مصروف ہو گئی تھی۔

میں تیرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کے چلوں مہربانی تیری تیری آہٹ سے دل کا دریچہ کھلے میں دیوانی تیری ”بی بی سائیں!“ اس نے آواز دی تھی مگر جواب نہ دار، کاندھا ہلایا تھا اور اس نے اپنی فسون خیز آنکھیں کھولی تھیں اور اسے غصے سے دیکھتی کہ اسے کی نگاہ ایک اجنبی پر پڑی تھی اور وہ گھبرا گئی تھی جبکہ سانول شاہ کی نگاہ اس پر جم کر رہ گئی تھی، ہنر جھیل سی آنکھیں، ہونٹ پر جگمگاتا تل،

میں تیرے سنگ کیسے چلوں سچا تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا عائنہ شاہ ندی کنارے بیٹھی، پاؤں جھلاتے ہوئے اپنی سریلی آواز میں اپنا موسٹ فیورٹ گیت گنگنا رہی تھی اور وہ اپنے آپ میں مگن آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔

”بی بی سائیں! اب تو بلی چلتے ہیں، بہت دیر ہو گئی ہے، بڑے سائیں ناراض ہوں گے۔“  
 شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے اور اس کی خاص ملازمہ جو اسی کی ہم عمر تھی اسے جانے کی فکر لگ گئی تھی کیونکہ دیر ہو جانے پر ڈانٹ تو اسے ہی پڑنا تھی۔

”دکھتی دفعہ کہا ہے سیکند کہ ہمیں گاتے ہوئے ٹوکا میت کر۔“ وہ آنکھیں کھولتے ہوئے اس پر بگڑی تھی۔

## بچہڑا سانول شام سلوٹا

سعدیہ عابد



کھنسل ٹاول

Scan & PDF  
 FIAZ AHMED  
 Friends Korner.com





ایک کاندھے پر پڑا آچل دوسرے پر جھولتی سیاہ  
ناگن سی چوٹی، کانوں میں بڑے بڑے آویزے،  
ناک میں جگمگاتی لوگ، مناسب سراپا، وہ حسن کا  
شاہکار تھی اور وہ حسن و خوبصورتی کا دلدادہ اور یہ

کیسے ممکن تھا کہ خوبصورتی سامنے ہو اور سانول  
شاہ کے دل کے تار نہ بجیں، اس کی آنکھوں میں  
واضح ستائش تھی اور وہ اس کی گہری نظروں کی  
تاب کہاں لاسکتی تھی، اس نے چوٹی ہاتھ سے پکڑ  
کر پشت پر ڈالی تھی، پراندے کے گھنگھرنج  
اٹھے تھے اور اس نے جلدی سے دوپٹہ پھیلا کر سر  
تک اوڑھ لیا تھا، چوڑیوں نے اپنا ساز چھیڑا تھا  
اور وہ اس کی گھبراہٹ و احتیاط سے خوب محفوظ  
ہوا تھا۔

”سب..... سیکنہ..... کون ہے یہ..... اور یہ  
ہمیں کیوں گھورے جا رہا ہے۔“ وہ تقریباً اس  
کے کان میں گھستے ہوئے استفسار کر رہی تھی۔

”ساتھ والے گاؤں کے سردار شاہنواز کا  
پتر ہے، بی بی سائیں!“ ملازمہ نے دھیمے سے  
اس کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا تھا کہ وہ  
درمیان میں خود ہی بول پڑا تھا۔

”جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھ لیجئے۔“ اس  
کی خوبصورت آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں  
اور وہ اس کی حسین آنکھوں میں خود کو ڈوبتا محسوس  
کر رہا تھا۔

”سیکینہ، یہاں سے فوراً چلو، بابا سائیں یا  
ان کے کسی ملازم نے بھی دیکھ لیا تو ہم تو جان  
سے ہی جائیں گے۔“ وہ اجنبی پر سے نگاہ ہٹاتی  
اس کا بازو تھام کر آگے بڑھی تھی۔

”پھر کب ملیں گی؟“ گمبیر آواز پر اس کے  
قدم رکے تھے، وہ خوفزدہ ہونے لگی تھی اور اسی  
لئے وہ کچھ کہنے کو پر تو لیتی سیکینہ کو بھی روک گئی تھی۔  
”چھوڑ نہ سیکینہ، کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو۔“

وہ اس کے سامنے آگیا تھا اور وہ کہتے کہتے رک  
گئی تھی اور وہ اس کے پکھڑی سے نازک ادھ

کھلے ہونٹوں کو بڑی محویت سے دیکھنے لگا تھا  
”آپ ہمارے راستے سے ہمیں، آپ  
ہمیں جانتے نہیں ہیں۔“ وہ ناگواری سے بولی۔

”ہم تو آپ کا مکمل تعارف لینا چاہتے ہیں، ویسے  
خادم کو سردار سانول شاہ کہتے ہیں۔“ وہ اسے  
محویت سے دیکھتا ہوا نہایت دلفریبی سے بولا تھا  
اور اس کی شئی کم ہونے لگی تھی، خوف سے جان  
نکلنے کو لگی۔

”سیکینہ، وہ ادا سائیں! وہاں سے ادا  
سائیں کی گاڑی گزری ہے، انہیں پتہ چلا تو وہ تو  
یہاں آنے پر پابندی ہی لگا دیں گے۔“ اس نے  
حلق کوتر کرتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور وہ تو اس  
کے خوف زدہ معصوم حسن سے اپنی آنکھیں کی  
پیاس بجھا رہا تھا۔

”سردار سانول سائیں! آپ ہماری بی بی  
سائیں کے راستے سے ہٹ جائیں، ہمیں حوصلی  
پہنچنا ہے دیر ہو گئی ہے۔“ وہ ادب سے بولنے لگی  
تھی کہ جیب رکنے کی آواز پر جہاں وہ چوکا تھا،  
وہیں اس نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھائی تھی، حد  
شکر ہے کہ کوئی جاننے والا نہیں تھا اور وہ آنے  
والے سے بات کرنے کو لمحہ کے لئے مڑا تھا اور  
اس نے سیکینہ کا ہاتھ پکڑے وہاں سے دڑ لگا دی  
تھی۔

”تجھے ابھی آنا لازمی تھا۔“ سانول شاہ  
اپنے جگری یار اور پچازاد بھائی محسن شاہ پر بگڑا  
”معاملہ کیا ہے تجھی اور تو کب سے گاؤں  
کی ٹیارنوں سے میل ملاقات رکھنے لگا۔“ وہ  
بڑے آرام سے پوچھ رہا تھا اور وہ اسے گھورتا اس  
کی پشت دیکھنے لگا تھا جو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی  
تھی۔

”تو نے بہت غلط وقت براخبری دی ہے۔“  
”بھئی مجھے کہاں معلوم تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر  
یوں بھاگ جائے گی، ویسے بھی کون؟ مگر جس بڑی

سوئی۔“ اس نے آنکھ دبا کر کہا تھا۔

”ہاں بھی تو بہت سوئی، مجھے اندازہ نہیں تھا  
کہ یہاں گاؤں میں بھی اتنا حسن دیکھنے کو مل سکتا  
ہے۔“ وہ جیب کی طرف بڑھتے ہوئے نہایت  
شرارت سے بولا تھا، جیسی اس کا پاؤں کسی ایسی  
چیز پر پڑا تھا جو اس کے شوز کی ٹھوکر سے دور ہوئی  
تھی اور اپنی موجودگی کا احساس اپنی آواز سے  
دلایا تھا، اس نے نگاہ پچی کی تھی اور قدرے جھک  
کر چاندی کی چوڑی پازیب اٹھالی تھی۔

”اس کا مطلب ہے وہ جیسے دوبارہ ضرور  
ملے گی۔“ اس نے جیب میں رکھتے ہوئے شوخی  
سے کہا تھا۔  
”بھئی کرمیرے یار، یہ دشمنوں کا گاؤں  
ہے۔“

”یہاں نفرت کا جج تو صدیوں سے بویا  
جاتا رہا ہے، مگر محبت، محبت گانج سردار سانول شاہ  
بولے گا، وہ حسینہ تیرے پار کا دل چرا لے گی  
ہے۔“ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے معنی خیزی  
سے بولا تھا۔

”ویسے بھی کون؟“

”رب سائیں جانیں، مگر خیال ہے کہ  
یہاں کے سردار کی بیٹی ہے۔“ وہ اطمینان سے  
بولتا اس کا اطمینان غارت کر گیا تھا۔

”یو مین، سردار افکن شاہ کی بیٹی، مرنے کا  
ارادہ ہے کیا، افکن شاہ کے خاندان سے نسلوں کی  
دشمنی ہے۔“ اس نے نہایت پریشانی سے اس کو  
یاد دلایا تھا۔

”جانتا ہوں، مگر دل نہیں مانتا ان چیزوں کو  
اور پلیز اس وقت میرا موڈ خراب مت کر، کہانی  
شروع نہیں ہوئی کہ تو اختتام کی فکر میں بلکان  
ہوئے جا رہا ہے، مجھے جانتا نہیں ہے کہ وقت  
سے پہلے میں مل نہیں باندھتا۔“ وہ اسے ناگواری  
سے ٹوک گیا تھا۔

☆☆☆

سردار شاہنواز کے تین بچے ہیں، سب سے  
بڑی، زینت، دوسرے نمبر پر سانول شاہ اور سب  
سے چھوٹی زینب ہے، سانول شاہ کچھ دن قبل ہی  
لندن سے پڑھ کے لوٹا ہے، شاہنواز کے ایک ہی  
بھائی دنواز ہے اور جس کے دو بچے ہیں، محسن شاہ  
اور سونیا شاہ ہے، سردار شاہنواز کی ایک ہی بہن  
وحیدہ شاہ ہیں جو بیوہ ہیں ان کے تین بچے  
تھے، دلار شاہ، معصومہ شاہ، بہادر شاہ، زینت کی  
دلدار سے شادی ہو گئی ہے، زینب، محسن شاہ کی  
منگ ہے، معصومہ، سانول شاہ کی، جبکہ سونیا بہادر  
شاہ کی منگ ہے۔

محسن شاہ بھی کچھ دن قبل اعلیٰ تعلیم حاصل  
کر کے سانول شاہ کے ہی ساتھ لوٹا ہے، ان  
دونوں میں گہری دوستی ہے، دونوں نے حوصلی  
سے باہر زیادہ دقت گزارا ہے، لیکن دونوں ہی  
حوصلی کے معمولات سے اچھی طرح واقف ہیں  
کہ کس سے دوستی ہے، کس سے دشمنی ہے، گاؤں  
میں کس وقت کیا چل رہا ہوتا ہے اور اس کا  
کریڈٹ محسن کو جاتا ہے جو خود ہمیشہ حوصلی کے  
مکینوں سے رابطے میں رہا اور تمام ملنے والی  
معلومات وقتاً فوقتاً سانول شاہ کے بھی گوش  
گزار رہی کر دی، کیونکہ وہ ان سب چیزوں میں خود  
سے دلچسپی نہیں لیتا تھا اور اس وقت محسن شاہ کے  
یاد دلانے پر وہ الٹا ہی پر بگڑنے لگا تھا اور وہ اس  
سے مناسب دقت میں بات کرنے کا سوچنا  
خاموش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”معاف کیجئے گا ادا سائیں، سلام ادا  
سائیں۔“ وہ اپنی ثلث میں ماہن شاہ کو دیکھ نہیں  
سکتی تھی، ان سے کرائی تھی، انہوں نے بروقت  
اسے تھام کر گرنے سے بچایا تھا اور وہ بدحواسی  
سے گویا ہوئی تھی۔

”آپ اس وقت کہاں سے آرہی ہیں؟“  
وہ اس کی اثری رنگت دیکھ کر برہمی سے استفسار کر



رہے تھے۔

”وہ ادا سائیں! ہم بابا سائیں کی اجازت سے گئے تھے۔“

”جب ہم نے آپ کو منع کر دیا تھا تو بابا سائیں سے اجازت لینے کی آپ نے ضرورت کیوں محسوس کی؟ کیا آپ کی نظر میں ہماری بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ وہ سختی سے کہہ رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے تھے، وہ اس سے ایسے بات کرتے ہی کب تھے۔

”پتر! آپ غصہ نہ کریں، سائیں سے عائشہ نے نہیں ہم نے بات کی تھی۔“ رفیعہ بیٹی کی مدد کو آن پہنچی تھیں۔

”اماں سائیں! وقت دیکھا ہے آپ نے، شام کے ساڑھے سات بج رہے ہیں، کتنا اندھیرا ہو رہا ہے باہر اور یہ اب تک اکیلے گھر سے باہر نہیں۔“ وہ ادب ملحوظ رکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”ہم اکیلے نہیں گئے تھے ادا سائیں، سیکندہ ہمارے ساتھ۔“

”کسی قسم کی اونچ نیچ ہو جاتی ہے تو سیکندہ کیا کر سکتی ہیں۔“ وہ درشتگی سے پوچھتے ہوئے اسے شرمندہ کر گئے تھے۔

”معاف کیجئے گا ادا سائیں، ہم آئندہ نہیں جائیں گے اور دیر بھی آج ہو گئی تھی، ورنہ ہم ایک گھنٹہ میں لوٹ آتے ہیں۔“ وہ نہایت آہستگی سے بولی تھی۔

”آئندہ آپ حویلی سے بالکل باہر نہیں نکلے گئیں، کچا کہ اکیلے اور آپ یہ کس طرح حویلی سے باہر گئی تھیں، چادر کہاں ہیں آپ کی اور آپ نے حجاب بھی نہیں لگایا ہوا، اتنی آزادی آپ کو کس نے دی؟“ وہ اس پر بری طرح برستے کڑی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے اور وہ بری طرح گڑبڑاتی شرمندگی سے انگلیاں چٹخانے لگی تھی۔

”پتر! یہ گھر سے حجاب میں ہی گئی تھیں، ہم

خود ان باتوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔“ انہوں نے اسے جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔

”اماں سائیں! وہ حجاب ہمیں نظر کیوں نہیں آ رہا؟ چادر تو دور انہوں نے دوپٹہ کو بھی اس کے لینے کے طریقے سے نہیں لیا ہوا۔“ وہ جالی اس سے قبل ہی وہ نہایت طنز سے کہتے اس کے قدم جکڑ گئے تھے، وہ اپنی بدحواسی میں دوپٹہ سر پہ ڈالنا بھول گئی تھی اور بھاگنے کی وجہ سے وہ بے ترتیب ہو رہا تھا، رفیعہ کا بھی اس طرف دھیان نہیں گیا تھا اور بیٹے کی بات انہیں از حد شرمندہ ہی تو کر گئی تھی اور وہ تو زمین میں گڑھی جا رہی تھی، شمسہ اس کی ندامت محسوس کر رہیں اور شوہر کے تیوروں سے خائف ہوتیں، اسے بازو سے تھامے وہاں سے لے کر نکل گئی تھیں۔

”اماں سائیں! ہمارا مقصد آپ کو یا عائشہ کو شرمندہ کرنا ہرگز نہیں ہے۔“ وہ ماں کی خاموشی محسوس کرتے کہنے لگے تھے۔

”ہم آپ سے معذرت چاہتے ہیں، مگر آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“ وہ بیٹے کو ٹوک کر آہستگی سے بولی تھیں۔

”اماں سائیں! آپ قبوہ میرے کمرے میں بھیج دیں۔“ انہوں نے بات ختم کرنے کے لئے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے ہم ابھی بھجوا دیتے ہیں، مگر ہم آپ سے ایک بات کہیں۔“ رفیعہ نرمی سے بات کر رہی تھیں۔

”تھم اماں سائیں!“

”پتر! عائشہ دھی، کہیں نہیں جاتیں، بس ایک ندی۔“

”بات قطع کرنے کی معافی چاہتے ہیں اماں سائیں! لیکن ہمیں عائشہ کا گھر سے نکلنا قطعاً ناپسند ہے۔“

”آپ کی بات سر آنکھوں پر، لیکن عائشہ دھی کی خوشی۔“

”آپ اکیلے مت بھیجا کریں اور ہو سکے تو عائشہ دوپہر میں چلی جایا کریں۔“ وہ ماں سے زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ کر ان سے اجازت لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے اور وہ سکون کا سانس لیتیں باورچی خانہ کی طرف بڑھی تھیں تاکہ ملازمہ سے قبوہ کے لئے کہہ دیں اور رات کے کھانے کی تیاری بھی دیکھ لیں۔

☆☆☆

سردار افغن شاہ، اس چھوٹے سے گاؤں کے کرتا دھرتا تھے، افغن شاہ کی صرف دو اولادیں تھیں، ماہن شاہ بڑے اور ان سے پورے چودہ سال چھوٹی عائشہ، افغن شاہ کو خدا نے اولاد کی دولت سے سرفراز تو کیا مگر ان کی زیادہ تر بچے

چھوٹی عمر میں ہی وفات پا گئے، عائشہ بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی چھ ماہ کی تھی کہ شدید ملیل ہو گئی تھی، افغن شاہ کے تین بچے اسی عمر میں

معمولی سی عدالت کے بعد خدا کو پیارے ہو گئے تھے، عائشہ تو یاہن کی پیدائش کے پورے چودہ سال بعد ہوئی تھی، اس کی بیماری نے افغن شاہ اور

رفیعہ کو بہت بے کل کر دیا تھا، کتنے ہی مزاروں پر انہوں نے بیٹی کی صحت یابی کے لئے دھلی میں

پائی، مٹیں جہاں میں خدا نے عائشہ کی زندگی لکھی تھی، ان کی دعائیں بازیاں ہوئیں اور وہ صحت یاب ہو گئی، لیکن بیمار بہت رہی تھی، اس لئے اس کو بہت ناز و تحسین میں پالا گیا تھا، اس کی ہر ضد پوری کی جاتی تھی، گھر کے ہر فرد کی جیسے اس میں

جان بند تھی، بچپن جیسے تیسے گزر گیا اب وہ سولہ برس کی ہو گئی تھی، مکمل طور پر صحت یاب بھی تھی بچپن کی طرح ہر پندرہ دن بعد بیمار بھی نہیں ہوتی تھی، مگر اس کا خیال رکھنے کی ان لوگوں کو عادت

سی ہو گئی تھی، اس نے قرآن شریف پڑھا تھا اور مقامی اسکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی، اس سے آگے پڑھنے کی اسے اجازت نہیں ملی تھی

اور اس کی ضد کو دیکھتے ہوئے اسے پرائیویٹ پڑھنے کی اجازت مل گئی تھی اور وہ سیکنڈ ایئر کے پیپرز کی تیاری کر رہی تھی، اس کا صرف ایک ہی شوق تھا شام کے وقت ندی کنارے بیٹھ کر گنگنا، ڈوبتے سورج کو دیکھنا، افغن شاہ نے تو اسے پھر بھی اجازت دے دی تھی لیکن ماہن شاہ کو اس کا حویلی سے نکلنا سخت ناپسند تھا، ماہن شاہ نے کراچی یونیورسٹی سے انوائرمینٹل (مالوجیات) سائنس میں ماسٹر کیا تھا، شمسہ ان کی کلاس فیلو تھی جس سے وہ محبت کر بیٹھے تھے، افغن شاہ سے بات کی، شمسہ بھی ان کی طرح سیدھی، افغن شاہ روایتی جاگیرداروں کے برعکس نرم سوچ کے حامل تھے، انہوں نے بیٹے کی خوشی کا خیال رکھا تھا، افغن شاہ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے، اور انہوں نے بیٹے کی شادی غیروں میں ہی کرنی تھی اس لئے بیٹے کی خوشی کو مقدم جانا تھا اور شمسہ ایک اچھی بیوی اور بہترین بہو ثابت ہوئی تھی، شمسہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اور اس کے دو بھائی ہیں ایک بھائی بڑا اور شادی شدہ ہے اور ایک بھائی جو ادھی ہے جس کے لئے اس کی والدہ آج کل لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔

☆☆☆

”عائشہ کہاں ہیں، وہ کھانا نہیں کھائیں گی کیا؟“ دسترخوان پر سب ہی تھے ایک وہی نہیں تھی افغن شاہ کو اس کی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

”بابا سائیں ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، وہ آرام کر رہی ہیں۔“ شمسہ نے بنایا تھا اور وہ پریشان ہواٹھے تھے۔

”سائیں! آپ کا کھانا کھائیے، عائشہ ٹھیک ہیں، آپ تو جانتے ہیں انہیں ندی پر جانا کتنا پسند ہے، وہ کچھ دیر پہلے وہیں سے آئی ہیں، پیدل گئی تھیں اور پیدل ہی آئی ہیں تو تھک گئی ہیں۔“ رفیعہ شاہ نے آہستگی سے ان کی پریشانی

”سائیں! آپ کا کھانا کھائیے، عائشہ ٹھیک ہیں، آپ تو جانتے ہیں انہیں ندی پر جانا کتنا پسند ہے، وہ کچھ دیر پہلے وہیں سے آئی ہیں، پیدل گئی تھیں اور پیدل ہی آئی ہیں تو تھک گئی ہیں۔“ رفیعہ شاہ نے آہستگی سے ان کی پریشانی

”سائیں! آپ کا کھانا کھائیے، عائشہ ٹھیک ہیں، آپ تو جانتے ہیں انہیں ندی پر جانا کتنا پسند ہے، وہ کچھ دیر پہلے وہیں سے آئی ہیں، پیدل گئی تھیں اور پیدل ہی آئی ہیں تو تھک گئی ہیں۔“ رفیعہ شاہ نے آہستگی سے ان کی پریشانی



دور کی تھی۔

”دادا سائیں، بواجی بہت رو رہی تھی۔“  
عالیان شاہ کے بولنے کی کسی کو امید نہیں تھی اور  
ماہن شاہ شرمندگی محسوس کرنے لگے تھے، وہ اپنی  
ہی پریشانی میں اس پر ضرورت سے زیادہ ہی برس  
گئے تھے۔

”سیکنہ! جا کر بی بی سائیں کو بلا کر لائے،  
سیکنہ گاہم نے بلایا ہے۔“

”کوئی ہمیں بتائے گا کہ بات کیا ہے۔“ وہ  
ایک کے بعد ایک کے مبہم سا بولنے پر گرجدار  
آواز میں بولے تھے۔

”دادا سائیں! بواجی کی پازیب کہیں کھو گئی  
ہے، وہ اس کے لئے رو رہی تھی۔“ عالیان شاہ  
نے اس کی معلومات بڑھائی تھیں۔

”ہم تو اتنی سی چیز پر کبھی نہیں  
روتے۔“ خاموش بیٹھے ریان نے بھی مداخلت کی  
تھی، شمسہ دونوں بیٹوں کو کھورنے لگی تھیں۔

”سلام بابا سائیں!“ دوپٹہ سلیقے سے  
اوڑھے وہ روئی روئی سی ان کے سامنے تھی۔

”ہماری دھی رانی کی پازیب کھو گئی ہے تو  
اس میں رونے والی تو کوئی بات نہیں ہے، ایک  
پازیب کی جگہ ہم ہزاروں پازیوں کا اپنی دھی  
رانی کے پاس ڈھیر لگا دیں گے۔“ سلام کا جواب  
دیے کروہ نہایت نرمی سے بولے تھے، وہ پورے  
گاؤں اور حوٹلی کے مینوں کے لئے سخت اور جابر  
ہو سکتے تھے لیکن عائنہ شاہ کے لئے وہ ہمیشہ نرم  
مہربان سایہ ہی ثابت ہوئے تھے۔

”ہمیں اور پازیب نہیں چاہیے بابا  
سائیں، وہ ہماری پسندیدہ پازیب تھی، اسے ہم  
بھی نہیں اتارتے تھے، مگر آج نہ جانے کیسے کھو  
گئی۔“ وہ نہایت آہستہ سے ادب ملحوظ رکھتے  
ہوئے بول رہی تھی، آنسو اس کے رخساروں پر  
لڑھکنے جارہے تھے۔

”ماہن شاہ، خدا بخش کو پازیب ڈھونڈنے  
لے فوراً بھیجیں، سیکنہ کو ساتھ کر دیجئے گا تاکہ  
وہ خدا بخش کی راہ نمائی کر سکیں۔“ وہ باپ کے حکم  
پر ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر اٹھ گئے تھے۔  
”ہم نے خدا بخش کو بھیجا ہے، آپ پریشان  
نہ ہوں اور کھانا کھالیں۔“ بیٹے کی واپسی پر وہ  
بولے تھے اور خاموشی سے کھانا کھانے لگے تھے۔  
”ماہن شاہ کے دو بیٹے ہیں، عالیان شاہ  
اور ریان شاہ، دونوں جڑواں ہیں، مگر والدین  
میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف ریان دادا کی  
طرح نرم خو جبکہ عالیان باپ کی طرح سخت مزاج  
کے تھے، دونوں نے قرآن پاک ختم کر لیا ہے اور  
مقامی اسکول میں چھٹی جماعت میں زمر تعلیم تھے،  
دونوں کی ہی عائنہ سے خوب بنتی ہے، مگر ریان  
اس کے دل سے زیادہ قریب تھا کیونکہ وہ عالیان  
سے اکثر دب کر اپنا حق چھوڑ دیتا تھا اس لئے وہ  
ہی ریان کے حق کے لئے لڑ پڑتی تھی اسی لئے  
عالیان اکثر کہتا تھا کہ ”عائنہ کو وہ نہیں ریان زیادہ  
عزیز ہے“ اور وہ محض مسکرا کر رہ جاتی تھی کیونکہ  
اسے تو اپنے دونوں ہی بیٹے بہت عزیز ہیں اور وہ  
ان کا پورا خیال رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔  
”سیکنہ! مل گئی ہماری پازیب۔“ وہ لوگ  
کھانے سے فارغ ہوئے تھے قبوہ کا دور چل رہا  
تھا جب سیکنہ کی واپسی ہوئی تھی اور وہ بڑی بے  
تابی سے بولی تھی۔  
”نہیں بی بی سائیں! ہم نے بہت اچھے  
طریقے سے ڈھونڈی لیکن وہ نہیں ملی۔“ وہ شرمندہ  
تھی جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔  
”رات ہو گئی ہے آپ جا کر سو جائیں، صبح  
دن کے اجالے میں ڈھونڈیں گے تو مل جائے  
گی۔“ سیکنہ کو جانے کا اشارہ کر کے بیٹی سے  
بولے تھے جو اتاری صورت کے ساتھ وہاں سے  
اٹھ کر چلی گئی تھی۔  
”آپ خاندانی زیورات میں سے پازیب  
دھی رانی کو دے دیں، وہ بہت اداس ہیں اور ہم  
”پتر! تو نے اب آگے کیا سوچا ہے، کیا  
کرنا ہے؟“ سردار شاہ نواز کے چہرے سے ہی  
سختی و رعونت نکلتی تھی وہ عام سادہ بات بھی دہنگ  
انداز میں کرنے کے عادی تھے۔  
”بابا سائیں! میں اپنا بزنس کرنا چاہتا  
ہوں۔“  
”اس سے تمہاری کیا مراد ہے، پرکھوں کی  
اتنی جائیداد زمینیں ہیں، اسی کو سنبھالو۔“  
”جاگیرداری سے مجھے بالکل لگاؤ نہیں ہے  
بابا سائیں!“  
”شاہاش ہے پتر! جاگیردار ہو کر  
جاگیرداری سے مجھے لگاؤ نہیں ہے۔“ وہ اس کے  
آہستہ سے کہنے پر بھی اس پر چڑھ دوڑھے تھے۔  
”بابا سائیں! یہ زمینوں و مینوں کا مجھے کچھ  
سمجھ نہیں آتا، میں اس سب سے دور رہا ہوں اور  
آگے بھی رہنا چاہتا ہوں۔“  
وہ بھی انہی کا بیٹا تھا اپنی بات پر ڈٹا تھا۔  
”دیکھ پتر! تو نے پڑھنا چاہا، ہم نے  
اجازت دی، مگر اب ہم تیری بات نہیں مانیں  
گے، تو پرکھوں کی زمینوں میں ہی دل لگا۔“ وہ  
نہایت سختی سے اسے باور کرا رہے تھے۔  
”بابا سائیں! مجھے اپنا بزنس کرنا ہے، میں  
شہر جانا چاہتا ہوں، یہاں کا فرسودہ ماحول مجھے  
بھلا نہیں لگتا، یہاں ٹھن کا احساس ہوتا ہے۔“ وہ  
ان کے سخت رویے کا بالکل خاطر میں نہیں لایا  
تھا۔  
”تایا سائیں! مداخلت کی معافی چاہتا  
ہوں، لیکن میں بھی سانول کے ساتھ ہی بزنس  
کرنا چاہتا ہوں، ایسا نہیں ہے کہ مجھے یہاں کا  
ماحول فرسودہ لگتا ہے، یا ٹھن ہوتی ہے ایسا کچھ  
نہیں ہے، مگر ہم صرف اپنی تعلیم اپنے شوق کی  
خاطر ایسا کرنے چاہتے ہیں، کیونکہ ہماری جڑیں  
یہی ہیں، ہم نہیں بھی کیوں نہ چلے جائیں، لوٹ  
کر یہی آنا ہے۔“ اب کے حسن بہت اداب سے

اپنی بیٹیا کو اداس نہیں دیکھ سکتے۔“ قبوہ کی خالی  
پیال رکھتے ہوئے وہ بیوی سے بولے تھے۔

”سائیں! نہیں صرف وہی پازیب چاہیے،  
ورنہ پازیبوں کا تو عائنہ بیٹیا کے پاس ڈھیر لگا ہوا  
ہے۔“ وہ پرسوج انداز میں اٹھ گئے تھے، صبح دن  
نکلنے ہی انہوں نے خادموں کو پازیب کی تلاش  
میں روانہ کر دیا تھا، مگر وہ وہاں ہوئی تو ملتی۔

”خدا بخش وہ پازیب آخر جا کہاں سکتی  
ہے، اسے زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا۔“ وہ  
نا کام لوٹے خادم پر بری طرح گرج رہے تھے۔

”سائیں! میں نے بی بی سائیں کی  
پازیب ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے مگر مجھے  
لگتا ہے وہ کسی کے ہاتھ لگ گئی ہے ورنہ ہم کل  
سے ڈھونڈ رہے ہیں، ہاں ہوئی تو مل جاتی۔“ وہ  
ڈرتے ڈرتے بولا تھا یہ خیال تو خود انہیں بھی گزرا  
تھا۔

”گاؤں میں اعلان کروا دیں، بی بی  
سائیں کی پازیب جس کسی کو بھی ملی ہے وہ لوٹا کر  
جائے، اسے بھاری انعام ملے گا۔“ وہ اسے حکم  
دے کر مزارعوں کی طرف گھوم گئے تھے جو اپنی  
اپنی درخواستیں لے کر ان کے پاس آئے تھے، مگر  
اعلان کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا، کیونکہ وہ  
پازیب تو سردار سانول شاہ کے کوٹ کی جیب میں  
رکھی تھی اور وہ اس اعلان و تلاش سے یکسر انجان  
تھا، اس طرح اعلان کے بعد پازیب نہ ملنے پر  
ان سب کو ہی تشویش ہوئی تھی لیکن کچھ نہیں  
سکتے تھے اور عائنہ نے بھی نہ چاہتے ہوئے بھی  
مہر کر لیا تھا، مگر ماں کی دی ہوئی ایک سے ایک  
خسین پازیب بھی لینے اور پاؤں میں سجانے سے  
صاف انکار کر دیا تھا۔

☆☆☆

”آپ نے بلایا تھا بابا سائیں!“ سانول  
شاہ سلام کرتا پوچھ رہا تھا اور ان کے اشارے پر  
چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

”پتر! تو نے اب آگے کیا سوچا ہے، کیا  
کرنا ہے؟“ سردار شاہ نواز کے چہرے سے ہی  
سختی و رعونت نکلتی تھی وہ عام سادہ بات بھی دہنگ  
انداز میں کرنے کے عادی تھے۔  
”بابا سائیں! میں اپنا بزنس کرنا چاہتا  
ہوں۔“  
”اس سے تمہاری کیا مراد ہے، پرکھوں کی  
اتنی جائیداد زمینیں ہیں، اسی کو سنبھالو۔“  
”جاگیرداری سے مجھے بالکل لگاؤ نہیں ہے  
بابا سائیں!“  
”شاہاش ہے پتر! جاگیردار ہو کر  
جاگیرداری سے مجھے لگاؤ نہیں ہے۔“ وہ اس کے  
آہستہ سے کہنے پر بھی اس پر چڑھ دوڑھے تھے۔  
”بابا سائیں! یہ زمینوں و مینوں کا مجھے کچھ  
سمجھ نہیں آتا، میں اس سب سے دور رہا ہوں اور  
آگے بھی رہنا چاہتا ہوں۔“  
وہ بھی انہی کا بیٹا تھا اپنی بات پر ڈٹا تھا۔  
”دیکھ پتر! تو نے پڑھنا چاہا، ہم نے  
اجازت دی، مگر اب ہم تیری بات نہیں مانیں  
گے، تو پرکھوں کی زمینوں میں ہی دل لگا۔“ وہ  
نہایت سختی سے اسے باور کرا رہے تھے۔  
”بابا سائیں! مجھے اپنا بزنس کرنا ہے، میں  
شہر جانا چاہتا ہوں، یہاں کا فرسودہ ماحول مجھے  
بھلا نہیں لگتا، یہاں ٹھن کا احساس ہوتا ہے۔“ وہ  
ان کے سخت رویے کا بالکل خاطر میں نہیں لایا  
تھا۔  
”تایا سائیں! مداخلت کی معافی چاہتا  
ہوں، لیکن میں بھی سانول کے ساتھ ہی بزنس  
کرنا چاہتا ہوں، ایسا نہیں ہے کہ مجھے یہاں کا  
ماحول فرسودہ لگتا ہے، یا ٹھن ہوتی ہے ایسا کچھ  
نہیں ہے، مگر ہم صرف اپنی تعلیم اپنے شوق کی  
خاطر ایسا کرنے چاہتے ہیں، کیونکہ ہماری جڑیں  
یہی ہیں، ہم نہیں بھی کیوں نہ چلے جائیں، لوٹ  
کر یہی آنا ہے۔“ اب کے حسن بہت اداب سے



کہہ رہا تھا اور وہ جو صرف ان سے بحث کرتا ان کے غصہ کو ہوا دے رہا تھا وہ اسے گھورتے پلٹ کر محسن شاہ کو دیکھنے لگے تھے۔

”ٹھیک ہے، سرمایہ جتنا چاہو گے میں لگا دوں گا، رہائش کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا، لیکن تم دونوں یہ یاد رکھنا کہ تم بزنس چاہے کوئی بھی کیوں نہ شروع کر لو، تم دونوں کو ہی ایک نہ ایک دن باپ دادا کی جگہ سنبھالنی ہے، اس لئے میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اپنے اصل سے بھاگنے کی بجائے اسے پچھاؤ۔“ وہ محسن سے زیادہ اسے سنا رہے تھے۔

”اور شادی کا کیا ارادہ ہے؟“ کچھ دیر بعد وہ بولے۔

”تایا سائیں! جب آپ حکم کریں۔“ اب کے پھر محسن ہی فرماں برداری سے بولا تھا۔

”لیکن میرا شادی کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے، بزنس سیٹ کرنے کے بعد ہی سوچوں گا۔“ سانول فوراً بولا۔

محسن تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا، اس نے سچویشن کو لٹنی سمجھداری سے ہینڈل کیا تھا اور وہ جیسے اس کی ہر کوشش کو ہی ناکام بنا گیا تھا۔

”بہت زیادہ اونچا اڑنے کی ضرورت نہیں ہے سانول پتر! اور یہ یاد رکھنا کہ شہر میں جا کر ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ تیرا رشتہ پچھو کی دہی سے طے ہو چکا ہے ادھر ادھر تجھے منہ مارنے سے ہم نہیں روکیں گے، مرد کو یہ سب کرنے کی کھلی چھوٹ ہوتی ہے، مگر یہ یاد رکھنا کہ بیوی تیری معصومہ دہی ہی بنے گی، ہم کسی شہری لڑکی کو اپنی بہو ہرگز نہیں بنائیں گے۔“ وہ بیٹے کو بہت کچھ باور کراتے ایک تیز نظر ڈالتے مردان خانے سے نکل گئے تھے۔

”تیرا دماغ خراب ہے سانول! بات کرنے سے پہلے مقابل کو تو دیکھ لیا کر۔“

”رہنے دے محسن! مجھے لوگوں کی خوشامد

کرنے کی عادت نہیں ہے۔“ وہ بڑے آرام سے بولا تھا۔

”وہ کوئی نہیں، تیرے بابا سائیں ہیں۔“

”تو خدا تو نہیں میں وہی کروں گا جو میرا دل میرا دماغ چاہے گا، میں کسی کا غلام نہیں ہوں، کہ مٹی کے مادھو کی طرح حکم پر سر جھکاؤں، میری زندگی ہے میں اسے اپنے انداز سے گزاروں گا، میں کسی کی بھی جی حضور نہیں کر سکتا، چاہے وہ میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔“ وہ سخت دھڑکے میں اسے باور کر رہا تھا۔

”بزنس کا خیال کیوں آیا؟ تیرے مزاج کے حساب سے تو جاگیرداری ہی ٹھیک ہے۔“ اس نے طنز کیا تھا۔

”یو آر رائٹ بٹ مجھے یہاں سے فرار حاصل کرنی ہے، یہ بھی کوئی زندگی ہے، مجھے اپنی زندگی میں مصروفیت چاہیے۔“ اس کے اطمینان میں فرق نہیں آیا تھا۔

”لیکن مجھے مصروفیت نہیں چاہیے۔“

”میں نے تجھ سے کچھ نہیں کہا تھا، تو خود اچھا بننے کے لئے بابا سائیں کے سامنے فرماں برداری کے ریکارڈ توڑنے پر تیار تھا۔“ وہ اس کا مضحکہ اڑا رہا تھا۔

”میں اگر بروقت مداخلت نہ کرتا تو، تو نے بدتمیزی کے ریکارڈ توڑ دینے تھے۔“

”میرا پانا یہی ہے کہ زیادہ فرمانبرداری بھی اچھی نہیں ہوتی۔“

”اور میرا ماننا یہ ہے کہ زیادہ نافرمانی بھی۔“

”او میرے باپ کے چچے چپ کر جا، مجھے تو لگتا ہے بچپن سے میرے ساتھ اس غیر ملک میں تو نہیں تھا، اتنے سارے سال وہاں گزار کر بھی تو جاگیردار ہی رہا۔“

”جاگیردار ہوں تو رہا ہوں نہ، تیری طرح نہیں، تجھے جاگیرداری سے ہی لگاؤ نہیں ہے،

میری جان تو بزنس کا خیال دل سے نکال دے، فالٹو کی خواری، مغز ماری، محنت الگ، آرام سے باپ دادا کی دولت پر عیش کر، ہم تو کیا ہمارے بچے بھی ہاتھ پیر ہلائے بغیر صدیوں تک کھا سکتے ہیں، شہر چلنا ہے تو کھوٹے چلتے ہیں۔“ محسن نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی مگر وہ عمل اور ذہنیت سے پکا جاگیردار تھا۔

”تایا سائیں نے ویسے ہی اجازت دی ہوئی ہے، آرام سے وہاں رہیں گے اور شہری حسیناؤں کی زلفوں تلے شامیں بسر کریں گے۔“ اس نے نہایت کمینگی سے کہتے ہوئے اسے آنکھ ماری تھی۔

”حسینا میں تجھے مبارک ہو، میں نے لندن کی آزاد فضا میں اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے کی طنائیں کس رکھی تھیں تو شہر کی حسینا میں بھی میرے دل و دماغ پر ہرگز اثر نہیں کریں گی۔“ وہ نہایت مٹی سے بولا تھا اور اس نے زبردست قہقہہ لگایا تھا۔

”شہری حسینہ کو تو چھوڑ، گاؤں کی حسینہ تو تیرے دل پر وار کر ہی گئی ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”ٹیک ہی خیال ہے۔“ اس کا خوبصورت متناسب سراپا اس کی آنکھوں میں لہرایا تھا۔

”یعنی شادی۔“

”شادی کا ابھی سوچا نہیں ہے، یہ ضرور ہے کہ جس طرف تیری سوچ کی پرواز ہے ایسا میں نہیں سوچ رہا۔“

”شادی کا تو سوچنا بھی مت ایسا ممکن ہی نہیں ہے، ہاں وقت گزاری کے لئے ایک وہی کیا لگتی ہی مہ جبینوں کو تیرے قدموں میں ڈالا جا سکتا ہے، اس سوازی۔“

”شٹ اپ محسن! عورت میرے لئے ہر رشتہ میں قابل احترام ہے۔“ اس کی آنکھوں اور زبان برواغ ناگواری تھی۔

”جس سے کوئی رشتہ نہیں ہو اس کے بارے میں تو سوچا۔“

”عورت میرے لئے کسی رشتہ کے نہ ہوتے ہوئے بھی قابل احترام ہے، کیونکہ عورت کی عزت ہم پر فرض ہوتی ہے، آج ہم کسی کی بہن بنی کی عزت کریں گے تب ہی کوئی ہماری بہن بنی کو بھی عزت دے گا۔“

”چھوڑو پارلنڈن سے آیا ہے باتیں ایسی کرتا ہے جیسے نچ کر کے لوٹا ہو۔“ ان دونوں کی جن معاملات میں بھی نہیں بنی تھی یہ بھی اس میں سے ایک بڑا مسئلہ تھا۔

”میری باتوں کو ہوا میں نہ اڑایا کر محسن، میں کچھ غلط نہیں کہہ رہا جیسے تو مرد ہے، دنیا میں اور بھی مرد ہیں اور تو جن عورتوں کے ساتھ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے یا جن کو زبردستی اس راہ پرے کر آتا ہے، وہ انہی مردوں کی عزت ہوتی ہیں اور جو چیز تو شخصیت مرد اپنے لئے اچھی سمجھتا ہے وہ دنیا کے کتنے ہی مرد بہترین سمجھتے ہوں گے اور جب تو کسی کی عزت پر ہاتھ ڈال سکتا ہے تو کوئی اور بھی تیری عزت۔“

”شٹ اپ سانول!“ محسن چیخ کر بولا تھا۔

”جو بات تو سن نہیں سیکتا تو اسے بھی دوسروں کا مقدر نہ بنا۔“ وہ بھی مٹی سے بولا تھا، اسے اس کے دو غلے لوگ سخت ناپسند تھے۔

”تو بھی دنیا کے انہی پچاس فیصد مردوں میں سے ہے جو دوسروں کی عزتیں پامال کرتے پھرتے ہیں، مگر بات جب اپنی عزت کی آتی ہے تو مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں، جو تو اپنے لئے اچھا سمجھ رہا ہے وہ سب کے لئے سمجھے تو تجھے مانوں۔“ وہ نہایت طنز سے کہتا چلیجنگ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

”تو وہ کر جو تجھے صحیح لگتا ہے اور مجھے وہ کرنے دے جو مجھے صحیح لگتا ہے۔“ وہ غصہ سے



تمتاتے چہرے کے ساتھ بولا تھا اور وہ طنز پر ہنس دیا تھا۔

”اس لئے مجھے جاگیر داری پسند نہیں ہے، زمینوں پر حکومت کرنے کرنے انسانوں پر حکومت کرنے لگتے ہیں۔“

”تیری ناپسندیدگی کے باوجود تو رہے کا جاگیر دار ہی۔“

”مجھے جاگیر دار ہونے پر نہیں، خود کو خدا سمجھنے پر اعتراض ہے، ہمارے باپ دادا نے غریبوں کسانوں کو بھی اپنے برابر کا درجہ نہیں دیا، حقارت بھری زندگی ان کا مقدر بنا دی ہے، جبکہ وہ محنت کرتے ہیں، ہم ان کی محنت کا کھاتے ہیں اور انہی پر غراتے ہیں، ان کی محنت کا پھل نہیں دیتے، اپنی عورتوں کو حویلی میں سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں اور غریبوں کی عزتوں کو اپنی جاگیر داری کے زعم میں رول دیتے ہیں۔“

سانول شاہ تعلیم کے میدان میں تو اول تھا ہی زبردست مقرر بھی تھا، اس وقت بھی اس نے تقریر کر ڈالی تھی، جو محسوس نے سنی خاموشی سے تھی اور اس کو چپ کر دوانے کو باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے اور مردان خانے سے نکل گیا تھا اور اپنے کمرے کی راہ لی تھی۔

☆☆☆

”کہاں جا رہی ہیں آپ عائشہ۔“ وہ پلٹی تھی اور اس کی نگاہ وائٹ گرتے شلوار میں پکاندھوں پر شال پھیلائے ماہن شاہ، پر پڑی تھی، اس نے دوپٹہ سر پر ڈالتے ہوئے انہیں سلام کیا تھا اور جس کا جواب دے کر وہ اپنے سوال کے جواب کے انتظار میں تھے۔

”ادا سائیں، ہم وہ ندی۔“

”ہم نے آپ کو وہاں جانے سے منع کیا تھا۔“ وہ جانتے تھے کہ وہ کہاں جا رہی ہے اسکے باوجود پوچھا تھا اور وہ گھبرا کر ادھورے جملے ہی بولی تھی کہ وہ سختی سے ٹوک گئے تھے۔

”ادا سائیں! ہم نے آپ کی حکم عدولی کی معافی چاہتے ہیں، لیکن ہمیں وہاں جانا اچھا لگتا ہے، پلیز ہمیں وہاں جانے دیجئے۔“ اس نے بڑی آس سے بھائی کو دیکھا تھا۔

”ہم وہاں اکیلے نہیں جاتے ادا سائیں، وہ سیکنہ۔“

”آپ وہاں دوپہر میں چلی جایا کریں، شام کے وقت آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہے، اندھیرا ہو جاتا ہے۔“ وہ اسے مایوس نہیں کر سکے تھے۔

”دوپہر میں ہمیں اماں سائیں نہیں جانے دیتیں، دھوپ بہت ہوتی ہے نہ، اماں سائیں کو لگتا ہے دھوپ میں جانے سے ہماری رنگت کملا جائے گی، لیکن ادا سائیں، گاؤں کی کتنی ہی عورتیں، کسان و ہاری، دن کے وقت کام کرتے ہیں۔“

”عائشہ! آپ اندر جائیں اور چادر اچھے سے اوڑھ کر آ جائیں، ہم آپ کو وہاں لے جائیں گے۔“

”جی، ادا سائیں۔“ وہ اس کے معصومیت سے کہنے پر دھیمے سے مسکرا دیئے تھے اور وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف دوڑتی تھی۔

”چلیں ادا سائیں۔“ وہ منٹوں میں لوٹی تھی اور جلدی میں باپ کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

”کہاں جانے کی تیاری ہے ہماری بیٹا کی۔“ انہوں نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

”سلام بابا سائیں! ہم ادا سائیں کے ساتھ ندی کنارے جا رہے ہیں۔“ وہ بے حد خوش تھی اور انہیں قدرے حیرت ہوئی تھی کیونکہ ماہن شاہ کو اس کا وہاں جانا پسند نہ تھا اور کہاں وہ خود اسے لے جا رہے تھے اور وہ باپ کی حیرانگی بھانپ گئے تھے۔

”بابا سائیں! ہمیں عائشہ کا وہاں جانا، حویلی نے نکلنا بالکل پسند نہیں ہے، مگر ہم عائشہ کی

خوشی نظر انداز نہیں کر سکتے۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے بولے تھے۔

”عائشہ بیٹا! آپ ابھی اندر جاؤ ہمیں آپ کے ادا سے کچھ بات کرنی ہے، ماہن شاہ آپ مردان خان میں آئیے۔“ بات بہت ضروری تھا اس لئے انہوں نے اسے اندر جانے کا کہہ کر مردان خانے کی طرف قدم بڑھا گئے تھے، ماہن شاہ نے اسے دیکھا تھا، اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے برسات جاری ہو گئی تھی۔

”عائشہ! آپ ایسا کیجئے، سیکنہ کے ساتھ چلی جائیں، لیکن آدھے گھنٹہ بعد آجائے گا۔“ وہ اسے روتا ہوا کہاں دیکھ سکتے تھے۔

”ادا سائیں! آدھا گھنٹہ تو بہت کم ہوتا ہے، ہم ایک گھنٹہ میں آ جائیں۔“ وہ اتنی معصومیت سے بولی تھی کہ وہ چپ کر گئے تھے۔

”آپ چہرہ کو ابھی طرح سے ڈھانپ لیں، کسی غیر مرد کی نظر نہیں پڑنی چاہیے۔“ اسے ہدایت دیتے ہوئے، ملازموں کو آواز دی تھی۔

”خدا بخش، رئیس الہی، چھوٹی بی بی سائیں کو بہ حفاظت ندی تک لے جائیں اور ان کو حفاظت سے واپس لے کر آئیں اور یہ تو آپ کو پتہ ہی ہے نہ بی بی سائیں سے کتنے فاصلے پر رہ کر ان کی حفاظت کرنی ہے۔“ ہدایت دیتے ہوئے کڑی نظروں سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔

”جی سائیں! ہم بی بی سائیں کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کریں گے۔“ وہ دونوں ادب سے بولے تھے۔

”آپ سیکنہ کے ساتھ چلی جائیں اور روز آپ کو یہ پانچ بجے شام آپ کی من پسند جگہ لے جایا کریں گے۔“ ماہن شاہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مردان خانے کی طرف بڑھ گئے تھے، وہ دونوں آگے چل رہی تھیں اور وہ دونوں ہتھاروں سے لیس ان کے پیچھے چل رہے تھے، حویلی سے ندی تک کا راستہ کافی زیادہ تھا مگر وہ

وہاں تک پیدل جانے کو ہی ترجیح دیتی تھی، ہاں واکی اکثر جیب میں ہو جاتی تھی مگر وہ جانی جیب میں کبھی بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

”بی بی سائیں! آج آپ خاموش کیوں بیٹھی ہیں، اپنا من پسند گیت نہیں گنگنائیں گی۔“ وہ خاموشی سے پیچھے پاؤں جھلا رہی تھی، وقتاً فوقتاً پانی اچھال دیتی تھی۔

”نہیں آج ہمارا موڈ نہیں ہے۔“

”آپ اپنی بازیب کو لے کر اداس ہیں۔“ ”ہاں شاید، ہمیں لیکن سمجھ نہیں آتا کہ ہماری بازیب گئی کہاں؟“ وہ ایک ہفتہ بعد یہاں آئی تھی، سانول شاہ اس عرصہ میں کتنے ہی چکر لگا چکا تھا، آج بھی وہ آیا تو دور سے ہی اسے دولڑکیاں ندی کے کنارے بیٹھی دکھائی دی تھیں۔

”رک جا سانول! تیرا اس وقت وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“ حسن کی نظر اسلحہ سے لیس بڑی بڑی مونچھوں والے ادھر سے ادھر ٹپکتے دو محافظوں پر پڑی تھی اور اسے اندازہ لگانے میں بالکل دیر نہیں لگی تھی کہ وہ یہاں کیوں ہیں، وہ یقیناً اس کی حفاظت پر معمور تھے اور گاؤں میں یہ عام رواج تھا کہ حویلی کی عورتیں اول تو سیر و تفریح کے لئے نکلتی نہیں تھیں اور اگر نکلتی تھیں تو اسی طرح اسلحہ سے لیس ملازم ان کی حفاظت کے لئے موجود ہوتے تھے، اس کے متوجہ کرنے پر سانول شاہ نے بھی انہیں دیکھا تھا۔

”حسن شاہ! ان ملازموں کو ادھر ادھر کر، مجھے اس سے بات کرنی ہے۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا تھا۔

”تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے، وہ اگر اس گاؤں کے سردار کی بیٹی ہوئی تو خون خرابہ ہو جائے گا۔“

”آئی ڈونٹ کئیر حسن، مجھے اس سے ہر حال میں بات کرنی ہے۔“ وہ اس کی تشویش کو



کسی خاطر میں نہیں لایا تھا۔

”اگر وہاں کوئی اور ہوا تو؟“

”یہ سب میرے سوچنے کی باتیں ہیں۔“  
”تو وہ کر جو کرنے کو کہہ رہا ہوں، کر نہیں  
سکتا تو بول۔“ اس کو غصہ آنے میں تو ویسے ہی لمحہ  
لگتا تھا۔

”پراہم ہوئی تو، تو خود ذمہ دار ہوگا، یہ یاد  
رکھنا کہ اس گاؤں کے سردار سے ہمارے پرکھوں  
کی نسل دشمنی ہے۔“ وہ اسے باور کر رہا تھا مگر اس  
نے جو ٹھان لی تھی وہیں کرنا تھا، محسن گاڑی سے  
اتر گیا تھا اور وہ اسے ان دونوں گاڑی کے ساتھ  
باتوں میں مصروف دیکھ آرام سے گاڑی سے اتر  
تھا اور دے قدموں اس تک پہنچ گیا تھا۔

”بی بی سائیں! ایسا اس پازیب میں کیا  
ہے کہ آپ اتنا روئیں اور اب ایک پازیب پہنچی  
ہوئی ہے۔“

یہ پازیب میرے دل کے بہت قریب  
ہے، یہ مجھے اس دنیا کے سب سے خاص انسان  
پنے دی ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے نگاہ اٹھائی  
تھی اور اس کا دل اچھل کر قلع میں آ گیا تھا۔  
”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ  
گہیر آواز میں بولا تھا۔

وہ اس وقت حجاب میں تھی اس کی طرف  
آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں اور ان آنکھوں نے ہی  
تو سانول شاہ کا دل چرا کر رت جگے اس کے  
نصیب میں لکھ دیئے تھے، اس کی واضح بات  
اسے گڑبڑانے پر مجبور کر گئی تھی۔

”ہمیں آپ سے کوئی بات.....“

”میں آپ سے بات کیے بغیر نہیں جاؤں  
گا، ٹائم ویسٹ کرنے کی بجائے میری بات سن  
لیں۔“ اس کی بات کاٹ کر وہ نہایت سنجیدگی سے  
بولا تھا، وہ خوف کی لپیٹ میں آئی تھی اور اس  
نے خوفزدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا تھا اور کچھ  
فاصلے پر ماہن شاہ کو دیکھ کر اس کا وجود لرز کر رہ گیا۔

تھا اور اپنے ہی قدموں پر کھڑے رہنا اس کے  
لئے نہایت دشوار ہو گیا تھا، پیچھے ہوئی تھی کہ  
پاؤں پھسلا تھا اور وہ توازن قائم نہیں رکھ سکی تھی،  
پیچھے ہٹنے میں جا گرتی کہ سیکنہ آگے بڑھی تھی اور  
اس کو بچاتے خود ندی میں جا گری تھی۔

”آپ پلیز چھپ جائیں، ادا سائیں نے  
آپ کو دیکھ لیا تو قیامت ہی آجائے گی۔“ وہ چپچی  
تھی اور مدد کے لئے ہاتھ پاؤں مارنی کسی کو پکار  
رہی تھی اور اس سے قبل کہ وہ اس کو بچانے کے  
لئے کچھ کرتا، ماہن شاہ نے اس طرف قدم  
بڑھائے تھے اور عائشہ نے باقاعدہ اس کے  
سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور وہ جلدی سے  
درختوں کی آڑ میں ہو گیا تھا۔

”آپ چپچپ کیوں تھی، سب ٹھیک.....“

”ادا سائیں!..... وہ..... سیکنہ..... وہ.....“

ندی میں گر گئی ہے۔“ وہ روتے ہوئے ٹوٹتے  
ہوئے لہجے میں بولتی ماہن شاہ کو پریشان کر گئی  
تھی۔

”خدا بخش، رئیس الہی۔“ وہ اس کے کہنے  
پر رئیس الہی ندی میں کود پڑا تھا، سیکنہ اس کی منگ  
ہے، وہ تیرا کی جانتا تھا کچھ ہی دیر میں وہ اسے  
باہر لے آیا تھا۔

”آپ دیکھیں انہیں۔“ وہ تینوں سائیڈ پر  
ہو گئے تھے، مگر اس کے تو ہاتھ پاؤں پھولے  
ہوئے تھے، وہ کچھ بھی نہیں کر رہی تھی۔

”پیٹ دبا کر پانی نکالنے کی کوشش کریں،  
مصنوعی سانس دینے کی کوشش کریں۔“ وہ ان  
سے کافی فاصلے پر چلے گئے تھے اور وہ باہر نکلتے  
ہوئے نہایت دھیمے لہجے میں بولا تھا اور اس کو  
دیکھ کر اس کی اپنی سانسیں رکنے لگی تھیں۔

”یہ ویسے مرے نہ مریں، آپ کی لاپرواہی  
ان کو بے موت مار دے گی۔“ وہ قدرے غصہ  
سے کہتا واپس چھپ گیا تھا تا کہ اس کی جان میں  
جان آ سکے اور اس کے کہے پر عمل کرنے پر اس

کے ساکت وجود میں ہلچل ہونے لگی تھی، رئیس  
الہی اتنی دیر میں گاؤں کی ڈاکٹرنی کو بھی بلا لایا تھا،  
وہ سیکنہ کو دیکھ رہی تھی کچھ ہی دیر میں اٹھ بیٹھی تھی۔  
”سیکینہ! تم ٹھیک ہو۔“ وہ اس کی طرف پلٹی  
تھی اور وہ بے چاری اثبات میں گردن ہلا گئی  
تھی۔

”ڈاکٹر صاحبہ! یہ ٹھیک ہے نہ؟“

”بی بی سائیں! یہ بالکل ٹھیک ہے، آپ  
پریشان نہ ہوں۔“ ڈاکٹر کے کہنے پر اس نے  
سکون کا سانس لیا تھا۔

”سیکینہ تم تو پوری بھیگی ہوئی ہو، تم یہی ٹھہرو،  
ہم ادا سائیں سے شال لے آتے ہیں۔“ وہ  
اسے وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر ماہن شاہ کی طرف  
بڑھی تھی۔

کہ سانول شاہ تیزی سے درختوں کی آڑ  
سے نکلا اور سیکنہ کو کچھ کہا جسے سنتے ہی وہ زرد پڑ  
گئی۔

”مجھے مرنے کا شوق نہیں ہے، سائیں کو  
پتہ چل گیا تو وہ مجھے زندہ ہی گاڑھ دیں گے۔“ تو  
سانول شاہ کی فرمائش سن کر وہ کانپ گئی تھی۔

”تم نے میری مدد کرنے کی حامی نہیں بھری  
تو میں اسی وقت درخت کی آڑ سے باہر نکل آؤں  
گا، بعد کے نتائج کی تم خود ذمہ دار ہوگی۔“ اس کا  
ٹھنڈا لہجہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑا گیا  
تھا۔

”آپ جانتے کیا ہیں؟“ لہجہ میں واضح  
لڑکھڑاہٹ تھی اور آنکھیں خوفزدہ انداز میں کچھ  
فاصلے پر موجود لوگوں پر ٹھہرتی پلٹ آئی تھی جو کہ  
دوسری طرف منہ کیے کھڑے تھے کہ وہ واقعی  
سامنے نہ آجائے۔

”مجھے صرف تمہاری بی بی سائیں سے کچھ  
بات کرنی ہے، میں کل پانچ بجے یہی انتظار کروں  
گی، تم نے مجھے صرف ان سے بات کرنے کا  
موقع فراہم کرنا ہوگا اور ایسا تم نے نہیں کیا تو

نتائج کی تم خود ذمہ دار ہوگی، میں محض دھمکی نہیں  
دے رہا، میں بہت کچھ کر سکتا ہوں اور کروں گا  
بھی۔“ عائشہ کو آتے دیکھ کر وہ چپ کر گیا تھا،  
عائشہ نے ماہن شاہ کی شال اس کے بھیکے وجود  
کے گرد لپیٹ دی تھی۔

”ہم معافی چاہتے ہیں سیکینہ! ہماری وجہ  
سے تمہیں اتنی تکلیف پہنچی پڑی۔“ وہ شرمندہ سی  
کہہ رہی تھی اور وہ اس کی نرم آواز کی لوج اپنے  
دل پر محسوس کر رہا تھا اور اس کو جاتے ہوئے  
بڑے پیار و حسرت سے دیکھ رہا تھا، کہ آج بھی وہ  
اس سے بات تک نہیں کر سکا تھا اس کے نام تک  
سے واقفیت حاصل نہیں کر پایا تھا اور اب اسے کل  
شام پانچ بجے کاشدت سے انتظار تھا تا کہ وہ اس  
سے بات کر سکے، اسے یقین تھا کہ سیکینہ اس کی  
بات ضرور مان لے گی اور عائشہ سے بات کرنے  
کا موقع فراہم کر دے گی۔

☆☆☆

”تو چاہتا کیا ہے سانول؟“  
”کچھ خاص نہیں، بس وہ مجھے بھولتی نہیں  
ہے، میں اس سے مل کر کوئی فیصلہ کر لینا چاہتا  
ہوں۔“ وہ اتنے آرام سے بولا تھا کہ جیسے وہ اس  
سے نہ جانے کتنی دفعہ مل چکا ہو اور آخری ملاقات  
فیصلہ کن کرنا چاہ رہا ہو۔

”تو سمجھ نہیں رہا ہے سانول! آج بھی گڑبڑ  
ہوتے ہوتے رہ گئی، وہ تو میں نے یہاں گاؤں  
میں بہت کم وقت گزارا ہے، اس لئے گاڑ کو شک  
نہیں ہوا اور وہ مجھے یہاں کوئی مسافر ہی سمجھے،  
ورنہ دونوں خاندانوں میں ایسی دشمنی ہے کہ آتی  
جانی ہواؤں کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا  
ہے۔“

”کوئی شک کرے یا کچھ بھی، مجھے اس  
سے سروکار نہیں ہے، میں نے وہی کرنا ہے جو میں  
نے ٹھان لی ہے۔“  
”یعنی برسوں پرانی نسلی دشمنی کو تو نے ہوا



نفس میں گردن ہلا دی تھی۔

”یعنی آج وہاں جانے کو تمہارا دل کر رہا ہے۔“ وہ اتنا ہی بولی تھی کہ وہ جلدی سے اشارت میں گردن ہلا گئی تھی اور وہ کچھ لمحے کچھ نہیں سکی تھی۔

”ہم وہاں نہیں جاسکتے سیکندہ، تم یہ مٹ سمجھنا کہ تمہارا دل کر رہا ہے اس لئے ہم اپنی بڑائی کے دھم میں وہاں جانے سے منع کر رہے ہیں۔“ وہ نہایت شرمندگی سے بولی تھی، کیونکہ وہ کسی کا بھی دل کھائی نہیں سکتی تھی۔

”ہم تو اب وہاں بھی نہیں جائیں گے۔“ وہ ادا اس ہو گئی تھی۔

”کیوں بی بی سائیں!“ حیرت اس کی آواز میں سمٹ آئی تھی۔

”سیکندہ! وہ لڑکا دو دفعہ ہماری راہ میں آچکا ہے اور اس سے پہلے کہ بات بڑھ جائے اور بابا سائیں کو اس سب کا پتہ چلے اور وہ ہمارے بارے میں کچھ غلط سوچنے پر مجبور ہو جائیں، ہم وہاں جانا ہی بند کر دیں گے۔“

”لیکن بی بی سائیں! وہ تو آپ کی من پسند جگہ ہے؟“

”ہمارے لئے ہماری پسند سے زیادہ ہماری اور ہمارے بابا سائیں اور ادا سائیں کی عزت و ناموس معنی رکھتی ہے، اس وقت ادا سائیں اس شخص کو وہاں دیکھ لیتے تو ہمیں تو وہ زندہ ہی گاڑھ دیتے، ہم اپنی بے گناہی کیسے ثابت کرتے؟ ادا سائیں، تو پھر بھی ہماری بات کا یقین کر لیتے، مگر گاؤں کا کوئی بندہ ہمیں دیکھ لیتا تو اس نے تو ہمیں ہی غلط سمجھنا تھا اور ہم وہاں جائیں گے ہی نہیں تو ایسا کوئی ڈر بھی نہیں ہوگا، ہمیں تو اب سمجھ آیا ہے سیکندہ کہ ادا سائیں ہمیں حویلی سے نکلنے سے کیوں منع کرتے تھے اور اس دن تو غلطی بھی ہماری تھی، حجاب میں ہماری سانس رکتی ہے، بس اس لئے ہم نے اس دن

حجاب پہنایا تھا، اگر ایسا ہم کرتے ہی نہ تو ایک غیر محرم کی نظر ہم پر پڑتی ہی نہیں، اس معاملے میں سائیں کتنے سخت ہیں، اگر انہیں پتہ چل جائے تو نہ جانے کیا کریں گے وہ اور ہمیں لگتا ہے کہ سب سے پہلے وہ ہمارے وہاں جانے پر پابندی لگا دیں گے، اس لئے ہم نے خود ہی ابھی وہاں نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے، نہ ہم جانے گے نہ وہ ہماری راہ میں آئے گا۔“ وہ یہ سب کہنے ہوئے بہت دھمی اور ادا اس تھی، کیونکہ وہاں جانے کے لئے وہ شدت سے اگلے دن کا انتظار کر رہی تھی اور ایک اجنبی کی وجہ سے وہ اپنی پسند سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو گئی تھی، کیونکہ اس کے گھر والوں نے غیر معمولی محبت دی تھی اس پر بھروسہ کیا تھا، جس کو اس نے بھی ٹوٹے نہیں دیا تھا اور آگے بھی یہی اس کی کوشش تھی سیکندہ بھی اس کی باتوں سے مطمئن ہو گئی تھی کیونکہ کسی قسم کی اونچ نیچ ہوتی تو سب سے پہلے وہی جان سے جاتی۔

☆☆☆

”تم لوگوں کو ایک دفعہ کی بات سمجھ نہیں آتی، مجھے کھانا نہیں کھانا۔“ وہ نو عمر ملازمہ پر بری طرح گر جا تھا، جو دستک دیتی اسے کھانے کے لئے بلانے آئی تھی۔

”سانول سائیں! وہ بڑے سائیں نے آپ کو مردان خانے.....“

”دفع ہو جاؤ یہاں سے اور جا کر کہہ دو سب سے مجھے نہیں آنا اور اگر اب تم یا کوئی اور بھی مجھے بلانے آیا تو تمہیں جان سے مار دوں گا۔“ گل افشاں کی تو پہلے ہی اس سے جان جانی تھی، اس کے بری طرح دھاڑنے پر لرزئی ہوئی کمرے سے باہر تھی اور وہ اپنی ہی جھونک میں اس کے کمرے میں آتے محسن شاہ کو دیکھ نہیں سکی تھی، اس سے بری طرح گراہی تھی، محسن شاہ نے اس کے نازک بلوریں سے وجود کو بانہوں کا سہارا دے کر

رہنے سے بچایا تھا جبکہ اس کی آنکھوں کی چمک اس کی سنہری رنگت اور چہرے پر بدن کوئی بھی نہ بڑھ گئی تھی، وہ ایک کم عمر لڑکی مشکل سے اندرہ سولہ برس کی ہو گئی اور حویلی میں کام کرتے سائیں کتنے سخت ہیں، اگر انہیں پتہ چل جائے تو نہ جانے کیا کریں گے وہ اور ہمیں لگتا ہے کہ سب سے پہلے وہ ہمارے وہاں جانے پر پابندی لگا دیں گے، اس لئے ہم نے خود ہی ابھی وہاں نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے، نہ ہم جانے گے نہ وہ ہماری راہ میں آئے گا۔“ وہ یہ سب کہنے ہوئے بہت دھمی اور ادا اس تھی، کیونکہ وہاں جانے کے لئے وہ شدت سے اگلے دن کا انتظار کر رہی تھی اور ایک اجنبی کی وجہ سے وہ اپنی پسند سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو گئی تھی، کیونکہ اس کے گھر والوں نے غیر معمولی محبت دی تھی اس پر بھروسہ کیا تھا، جس کو اس نے بھی ٹوٹے نہیں دیا تھا اور آگے بھی یہی اس کی کوشش تھی سیکندہ بھی اس کی باتوں سے مطمئن ہو گئی تھی کیونکہ کسی قسم کی اونچ نیچ ہوتی تو سب سے پہلے وہی جان سے جاتی۔

”سائیں! راستہ دے دیں، بڑے سائیں! وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے آگے بڑھ گیا تھا۔

”سائیں! رک جائیں۔“ اسے سانول شاہ کے کمرے میں جاتے دیکھ کر وہ بڑھ کر آگے آئی تھی اور وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”اب بک بھی چکو، کیوں روکا ہے؟“ وہ اس کی خاموشی پر بولا تھا۔

”سائیں اندر مت جائیں، سانول سائیں نے سختی سے منع کیا ہے، کوئی ان کی تنہائی میں خلل ڈالے گا تو وہ ہماری جان لے لیں گے۔“ وہ ڈرتے بولتی تھی۔

”تمہاری جان تو میرے ہاتھوں جائے گی۔“ وہ انتہائی وارفتہ نگاہوں سے اسے دیکھتا تھا۔

”اسے آہستگی سے کہتا، سانول شاہ کے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔

”یہ کتنی بری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔“ اس نے جھرجھری سی لی تھی اور وہاں سے بھاگ گیا۔

☆☆☆

”محسن! اس وقت مجھے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔“ وہ محسن کو دیکھتے ہی بولا تھا مگر وہ کوئی ملازم تو تھا نہیں کہ اس کے ڈر سے بھاگ لیتا، وہ تو اس کے بیڈ پر ٹپک گیا تھا۔

”میں کیا کرتا ہوں، کیا نہیں، کس سے فائدہ پہنچتا ہے، کس سے نقصان یہ سب تجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ نہایت غصہ میں اسے مخاطب کرتا سیدھا ہو کر بیڈ کراؤن سے ٹپک لگا گیا تھا۔

”مجھ سے کیوں اتنا اکھڑا اکھڑا ہے، تیری اس حسد کو میں نے تو وہاں آنے سے نہیں روکا۔“ اسے بھی غصہ آ گیا تھا۔

”تمیز سے بات کر محسن! وہ تیری ہونے والی بھابھی ہے۔“ اس کا اندازہ اسے بری طرح کھلا تھا۔

”میری بھابھی تو صرف ادی معصومہ نے ہی بننا ہے۔“ اس کے لہجے کا برا ماننے ہوئے طنز کیا تھا۔

”تیری بھابھی! وہ لڑکی بنے گی جسے میں بیوی بناؤں گا اور میں معصومہ سے شادی نہیں کرنے والا، میں نے اپنے لئے لڑکی پسند کر لی ہے۔“

”جس کا نام بھی تو نہیں جانتا۔“ محسن طنزاً بولا۔

”نام سے مجھے کیا لینا دینا نہیں ہے، میں بابا سائیں سے آج ہی بات کرنے والا ہوں۔“ وہ اس کے طنز کی پرواہ کیے بغیر ٹھوس لہجے میں بولا تھا۔

”اور وہ جیسے مان ہی تو جائیں گے، وہ ہیں ہی اسی انتظار میں تو نام لے گا اور وہ رشتہ لے کر چل پڑیں گے۔“

”زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے محسن! بابا سائیں آرام سے مانیں یا زبردستی انہیں میری بات ماننا ہی ہوگی اور میں اپنی بات





تجھے منوا کر دکھاؤں گا۔“ اس کے تو سر پر لگی پیر پر  
بچنے والی بات ہو گئی تھی اور وہ اسے کچھ کہنے کو منہ  
کھولتے دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے روک گیا  
تھا، پٹ سے اتر اٹھا، پاؤں میں چپل پھنسی تھی  
اور ملجے کپڑوں اور بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ ہی  
کمرے سے نکل گیا تھا۔

”بابا سائیں! اپنے کمرے میں ہیں، یا  
مردان خانے میں۔“ اس نے ملازمہ سے پوچھا  
تھا۔

”سائیں! اپنے کمرے میں ہیں اور آپ کو  
یاد فرما رہے ہیں۔“ لا جو اسی کو بلائے جا رہی تھی،  
ادب سے بولی تھی اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باپ  
کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”سانول شاہ!“ اندر سے شاہنواز شاہ نے  
آواز لگا کر ”کون ہے؟“ پوچھا تھا تب اس نے  
کہا تھا اور اجازت ملتے ہی کمرے میں داخل ہو  
گیا تھا، چار سے پانچ ان کے آرام کا وقت تھا  
جس میں کوئی نکل نہیں ہوتا تھا مگر رات سے  
سانول شاہ نے کھانا نہیں کھایا یہ بات ان کے  
لئے تشویش ناک تھی، اسی لئے اسے بلایا تھا اور وہ  
بیٹے کا حال دیکھ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے  
تھے ابھی وہ کچھ کہتے کہ وہ خود ہی بول پڑا تھا۔

”بابا سائیں! میں نے شادی کرنے کا  
فیصلہ کر لیا ہے۔“ وہ ان کے لہجے کے اشارے کو  
نظر انداز کر گیا تھا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے پتر! ہم ادی  
وحیدہ سے آج ہی بات.....“

”آپ کو پچھو وحیدہ سے بات کرنے کی  
ضرورت نہیں ہے بابا سائیں، میں معصومہ سے  
شادی نہیں کرنا چاہتا۔“

”پھر کس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ بیٹے  
کے تیور اشتعال دلانے والے تھے مگر وہ بیٹے کی  
طرح جوش نہیں دکھا سکتے تھے۔

”بابا سائیں! میں سردار افغن شاہ کی بیٹی

سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کا بے خوف  
باک لہجہ ہرگز بھی قابل معافی نہیں تھا ان کی  
میں۔

”اگر ہم انکار کر دیں۔“ وہ نرمی سے کا  
لے کر اس کے اندر کا سارا غبار نکالنا چاہتے  
تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس میں کتنا دم خم ہے۔  
”میں آپ کے انکار کو ماننے سے انکار  
دوں گا۔“

”کرو گے کیا؟ سردار افغن کی بیٹی  
شادی کرنا کوئی اتنا آسان کام تو نہیں ہے،

سے ہماری نسلی دشمنی ہے۔“  
”بابا سائیں! میں کسی دشمنی کو نہیں مانتا،  
اس شادی کے لئے کسی بھی حد تک جا  
ہوں۔“

”آخر کس حد تک، مجھے بھی تو پتہ چلے۔“  
”جان دینی پڑے گی تو جان بھی دے دوں  
گا۔“

”بابا ہا، جان پتر کمزور لوگ دینے کی بات  
کرتے ہیں اور بہادر جو ہوتا ہے وہ جان دے  
نہیں جان لینے کی بات کرتا ہے۔“ چھت چا  
قہقہہ لگا کر بیٹے کی کم عقلی پر گویا طنز کیا تھا۔

”بابا سائیں! میں جان دینے اور جان  
لینے سے گریز نہیں کروں گا، آپ یہ بتائیے  
آپ میرا رشتہ لے کر چارے ہیں یا نہیں؟  
اسے مذاق اڑانی باپ کی ہنسی بری تو بہت لگی  
کیا کچھ نہیں تھا۔“

”نہیں، ہم اپنے دشمن کے گھر سوالی  
نہیں جائیں گے، معصومہ دہی تمہاری منگ  
اسی سے شادی ہوگی۔“ وہ اپنے مخصوص دہجے  
لہجے میں بولے تھے۔

”بابا سائیں! یہ آپ کی بھول ہے کہ آپ  
زبردستی میری شادی کسی سے بھی کروادیں  
آپ مجھے عاق کر دیں، جان سے مار دیں،  
سکتے ہیں کر لیں، شادی تو میں افغن شاہ کی

سے ہی کروں گا اور یہ فیصلہ سردار شاہنواز شاہ کے  
بیٹے سانول شاہ کا فیصلہ ہے، مرتے مر جاؤں گا،  
مگر اپنی بات سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“  
اتنے برسوں میں پہلی دفعہ یوں لگا تھا کہ ان کا بیٹا  
ان کے مقابل ہو، کوئی اور وقت ہوتا تو وہ خمر سے  
چھاتی پھلا کر اس کے اٹل فیصلہ میں اس کے  
ساتھ دیتے مگر یہاں بات ان کی زبان ان کی  
غیرت کی آ رہی تھی۔

”دیکھ پتر جسے تو بہت آسان سمجھ رہا ہے وہ  
ہرگز آسان.....“

”یقین نہیں آ رہا کہ یہ بات میرا باپ کہہ  
رہا ہے، جس نے بھی کسی بات کی کام کو ناممکن  
نہیں سمجھا اور یہ بہادری تو نہیں ہے بابا سائیں!“  
وہ نہایت طنز سے ان کی بات کاٹ گیا تھا، اس  
نے بہت گہری چوٹ لگائی تھی۔

”بہادری اور بے غیرتی میں فرق ہوتا ہے  
سانول شاہ۔“ خونخوار نظروں سے اسے دیکھا  
تھا۔

”ٹھیک کہا آپ نے بابا سائیں! اور یہ  
بات میری غیرت گوارہ نہیں کر سکتی کہ جس لڑکی کی  
بیوی بنانے کا میں نے سانول شاہ نے سوچا، وہ  
کسی اور کی بیوی بن جائے، میرے اندر اتنی  
طاقت ہے کہ میں اپنی خواہش پوری کر سکوں، مرد  
ہوں بابا سائیں مرد اور مرد جس کو نگاہ سے دل  
میں اتارتا ہے وہ اسے کسی اور کا نہیں ہونے دیتا  
اور میں نامردی کا طوق گلے میں سجانے سے کہیں  
زیادہ بہتر اپنی مردانگی ثابت کرنے کو ترجیح دوں  
گا، آپ سیدھے طریقے سے رشتہ لے جائیں، نا  
منظور ہو گیا تو ٹیڑھے طریقے بھی مجھے آتے ہیں،  
میں صرف اپنے فیصلہ سے پیچھے ہٹنا نہیں آتا اور  
یہ سب آپ کو اس لئے کہہ رہا ہوں کہ افغن شاہ  
سے آپ کی پرانی دشمنی ہے اور اس وقت دشمنی ختم  
کر کے امن و دوستی بھی قائم کی جاسکتی ہے اور  
دشمن کو جلا بھی بخشی جاسکتی ہے اور میں آپ کو اتنا تو

سمجھدار سمجھتا ہوں کہ آپ موقع کبھی نہیں چھوڑتے  
تو یہ تو آپ کی بڑائی ثابت کرنے کا موقع ہوگا،  
ٹھیک ویسے ہی جیسے دشمن پر وار کرنے کا یہ بہترین  
موقع ہے، جس سے فائدہ اٹھانے کی آپ ایک  
کوشش بھی کر چکے ہیں، مگر براہ قسمت کا جو عین  
وقت بر دعا دے گئی۔“ اس نے سرد لہجے میں طنز  
کے تیر چھوڑے تھے اور وہ بے طرح چوٹے تھے۔  
”ایسے مت دیکھیں بابا سائیں! میں آپ کا  
ہی بیٹا ہوں، میری رگوں میں خون آپ کا ہی دوڑ  
رہا ہے، آپ اگر میرے ایک ایک پل کی خبر رکھتے  
ہیں تو میں بھی آپ لوگوں سے اتنا بے خبر نہیں  
رہتا۔“ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا باپ کا  
سکون لے اڑا تھا۔

”حسن نے میرے منع کرنے کے باوجود یہ  
سب آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا، اسی لئے آپ کا  
اطمینان قابل دید تھا، مگر آپ نے مجھ سے کوئی  
سوال جواب نہیں کیا بلکہ مجھے وہاں جانے کا موقع  
دیا تاکہ میں افغن شاہ کی بیٹی سے بات کرنا اور  
آپ افغن شاہ کی عزت سر عام نیلام کر سکتے مگر  
افغن شاہ کی بیٹی مجھ میں انوار نہیں تھی بابا سائیں  
جو وہ مجھ سے ملنے آئی اور اس کے نہ آنے سے  
آپ کے منصوبہ پر پانی پھر گیا اور اس دن کے  
بعد بھی آپ نے مجھے نہیں روکا، یہ سب مجھے کیسے  
پتہ چلا تو بابا سائیں جو میرا پیچھا کر رہے تھے وہ  
آپ کے نمک خوار تھے لیکن میری آنکھیں بھی  
دیکھتی ہیں۔“ اس نے تو باپ کی بولتی ہی بند کر دی  
تھی۔

”فیصلہ اب آپ کے ہاتھوں میں ہے بابا  
سائیں، دشمنی یا دشمنی کا خاتمہ۔“ وہ جس طرح آیا  
تھا اسی طرح لوٹ گیا تھا مگر سوچوں کے کتنے در  
ان کے لئے وا کر گیا تھا اور وہ جتنا سوچ رہے  
تھے ابھرتے جا رہے تھے، اس ابھرنے سے نکلنے کا حل  
لیکن انہیں خود نکالنا تھا۔



”سیکنہ! آپ سے ہمیں کچھ پوچھنا ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ہماری باتوں کا سچائی سے جواب دیں گی۔“ سیکنہ بری طرح الجھ گئی تھی۔

”حکم سائیں!“ افکن شاہ نے طریقے سے بات اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

”بی بی سائیں! ندی پر نہیں جا رہیں، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”نہیں، سائیں! اگر ہے بھی تو مجھے.....“

”سیکنہ ہم نے بات کرنے سے پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ آپ نے سچ بولنا ہے، سچ نہیں کہہ سکتیں تو جھوٹ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔“ ان کے سختی سے کہنے پر وہ شرمندہ ہو گئی تھی اور اس نے دھیمے دھیمے اس اجنبی سے اچانک ہونے والی اور دوسری ملاقات کے ساتھ، عائشہ کی گفتگو بھی سردار افکن شاہ کے گوش گزار کر دی تھی۔

”آپ اس اجنبی لڑکے کے بارے میں کچھ جانتی ہیں کہ وہ کون ہے؟ اور ہمارے گاؤں کا ہے یا کسی دوسرے گاؤں سے اس کا تعلق ہے۔“ ساری تفصیل سن کر سنجیدگی سے استفسار ہوا تھا۔

”سائیں! وہ دشمنوں کا بیٹا ہے، سردار شاہنواز شاہ کا بیٹا سانول شاہ جو حال میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لندن سے لوٹا ہے۔“ وہ کچھ اور انداز سے کہہ رہی تھی مگر اسے یکدم احساس ہوا تھا کہ سامنے افکن شاہ ہیں جو غیر ضروری بات سخت ناپسند کرتے ہیں، یہ خیال آتے ہی وہ خاموش ہو گئی تھی اور انہوں نے اسے جانے کا کہہ دیا تھا، سردار شاہنواز اچھی سوچ کے حامل تھے، انہوں نے بھی ملازموں کو غریبوں کو حقیر نہیں سمجھا تھا، ملازموں کے ساتھ وہ ہمیشہ اچھے طریقے سے ہی پیش آتے تھے، کوئی سائل ان کے در سے بے مراد نہیں لوٹتا تھا، وہ عام جاگیرداروں سے یکسر

مختلف تھے، بڑھے، لکھے باشعور انسان تھے، انسانیت سے نااہل نہیں تھے، ایک بہت بڑا گاؤں جہاں کسی زمانے میں ایک شخص کی حکمرانی قائم تھی، آپسی ناچاقیوں اور حکومت کرنے کی چاہ میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی تھی، باقاعدہ جنگ ہوئی تھی اور ایک گاؤں تین چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا، یہ آج سے صدیوں پرانی بات تھی، تینوں کے درمیان نسلی دشمنی تھی، وقت کے ساتھ دو گاؤں آپس میں شیر و شکر ہو گئے تھے مگر سردار وہی تھے اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب افکن شاہ کے دادا حیات تھے اور وہ گاؤں کے سردار تھے، انہوں نے دونوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا جسے شاہنواز شاہ کے دادا نے ٹھکرا دیا تھا اور مہابت خان کے دادا نے اس بڑھے ہوئے ہاتھ تھام لیا تھا اور دوستی کو مضبوط کرنے کے لئے اپنی پوتی کا رشتہ افکن شاہ سے طے کر دیا تھا اس وقت افکن شاہ اٹھارہ برس کے جبکہ رقیعہ خان دس برس کی تھیں اور جب سولہ برس کی ہوئی تھیں تو رخصت ہو کر افکن شاہ کی حویلی میں آ گئیں تھیں اور ان کے آپس بڑھتے میل جول کو دیکھتے ہوئے شاہنواز شاہ کے دادا نے بھی چند سال بعد خود سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا، جسے دونوں خاندانوں نے قبول کر لیا تھا، لیکن چند سال بعد ہی پھر جھگڑا ہو گیا تھا، بات معمولی تھی جسے بہت بڑھا دیا گیا تھا، اس کے بعد شاہنواز شاہ کا تعلق مہابت خان کے خاندان سے تو جزار ہا مگر شاہنواز شاہ اور افکن شاہ کے لئے جب وہ صرف آٹھ ماہ کا تھا، شاہنواز شاہ کے دادا نے آگے بڑھ کر اپنی پوتی کا رشتہ ڈالا تھا جس سے افکن شاہ کے دادا نے انکار کر دیا تھا اور کیونکہ اول تو وہ اتنی کم عمری میں پوتے کا رشتہ طے کرنا نہیں چاہتے تھے، دوم جس پوتی کے لئے بات کی تھی وہ چار سال کی تھی اور یہ بے جوڑ رشتہ ہی ثابت ہونا تھا، مگر انکار کو ان کا مسئلہ بنالیا گیا اور پھر سے دشمنی

اٹ گئی، وہ تو دوستی بھی کرنا نہیں چاہتے تھے ایسا صرف اس لئے کیا تھا کہ دوسرا آپس میں رشتہ دار ہو گئے تھے اس سے ان کی حیثیت کمزور ہو سکتی تھی، ان کے مفادات پر وہ دونوں مل کر کاری کر سکتے تھے، بس اس سب سے بچنے کے لئے امن قائم ہوا تھا جو جزوقتی ثابت ہوا لیکن اس کے بعد مہابت خان سے انہوں نے تعلقات بھی خراب نہیں ہونے دئے اور افکن شاہ سے تعلقات جوڑنے کی کبھی کبھار کوشش نہیں کی گئی، جبکہ دادا کی وفات کے بعد افکن شاہ کے والد اور پھر خود افکن شاہ نے بھی تعلقات جوڑنے کے لئے دوستی بڑھایا مگر شرط سے مشروط رکھا گیا، ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ افکن شاہ نے اس پر سوچا تھا لیکن جب تک بہت دیر ہو چکی تھی، ماہن شاہ نے کمرے کو دل میں بسا کر اپنی خواہش کا باپ سے اظہار کر دیا تھا اور انہوں نے بیٹے کی خوشی کو دنیا کی ہر چیز پر فوقیت دی تھی، سیکنہ تو کمرے سے کب کی جا چکی تھی اور وہ ماضی میں کھوتے بہت دور تک جا چکے تھے کہ رقیعہ کی آمد پر وہ حال میں لوٹے تھے۔

”آپ نے ہم سے کوئی بات کرنی ہے؟“ وہ کچھ دیر پہلے ہی میکے سے لوٹیں تھیں، انہیں شش و پنج میں دیکھ اپنائیت سے پوچھا تھا۔

”سائیں! بات تو کرنی ہے، اہم بھی بہت ہے، مگر کہتے ہوئے جھجک رہے ہیں۔“ ابجھن ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

”ایسی کیا بات ہے جو آپ بلا جھجک نہیں کر سکتیں؟ ہم نے آپ کو اتنا مان و بھروسہ تو کم از کم دیا ہی ہے کہ آپ ہم سے اپنے دل کی ہر بات بلا جھجک کہہ سکیں۔“ وہ نرمی جو خاص ان کے لئے مخصوص تھی، وہی ان کے لہجے میں دیر آئی تھی اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہینگئی تھی۔

”سائیں! آپ نے ہمیں مان بھروسہ، وہ سب دیا جو ہم نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا،

بات ہماری ہوتی تو ہم اب تک آپ سے کہہ چکے ہوتے۔“

”رفیعہ! جو بھی بات ہے کہہ دیجئے۔“ ہاتھ تھام کر تسلی دی تھی۔

”آپ ناراض نہیں ہوئے گا۔“ وہ اب کے ہنس دینے تھے اور وہ بہت سست چل کر دھیرے دھیرے کہنے لگی تھیں۔

”ادا سائیں! منزل پتر کا رشتہ عائشہ بیٹا کے لئے لے کر آنا چاہتے ہیں۔“ اپنی بات کا اثر ان کے چہرے پر دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ ان کے بے تاثر چہرے سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی تھیں اور دروازہ پر دستک ہوئی تھی اور انہوں نے مسہری سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

”سائیں! چھوٹے سائیں! آپ کو مردان خانے میں یاد فرما رہے ہیں۔“ ہفتہ نے آنے کا مقصد بتایا تھا۔

”ہم آپ کی بات کا سوچ کر جواب دیں گے، ابھی آپ ادا سے کچھ مت کہیے گا۔“ پیر میں جوئے پہنتے ہوئے کندھوں پر شال پھیلائی تھی اور ان کے قریب سے گزر گئے تھے۔

”سلام بابا سائیں!“ وہ باپ کو دیکھ کر احترام میں کھڑے ہو گئے تھے۔

”سب خیریت تو ہے ماہن شاہ؟“ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا اور ماہن شاہ نے ایک لفافہ باپ کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”یہ لفافہ کون دے گیا ہے؟ اور کیا ہے اس میں؟“ جواب تک ماہن شاہ کے ہاتھ میں تھا جو ایک ہند لفافے میں بند تھا۔

”بابا سائیں! یہ خط سردار شاہنواز شاہ کا آدمی دے گیا ہے۔“ وہ بیٹھے سے کھڑے ہو گئے تھے۔

”آپ کو یقین ہے کہ وہ شاہنواز شاہ کا ہی آدمی تھا۔“

”بابا سائیں! ہمیں نہ صرف یقین ہے بلکہ



آنے والے نے ہم سے کہا تھا کہ وہ شاہنواز شاہ کا پیغام لے کر آیا ہے اور اس نے یہ لفافہ ہمیں دیا اور کہا کہ وہ تین دن بعد اس کا جواب لینے آئے گا۔" ماہن شاہ نے اس کے اطمینان کے لئے ساری تفصیل بتائی تھی، وہ بیٹھ گئے تھے اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے لفافہ چاک کرنے کا کہا تھا، لفافے میں سے ایک کاغذ برآمد ہوا تھا اور وہ باپ کی رضا سے خط کے مندرجات پڑھنے لگے تھے۔

"سلام! افکن شاہ! ہم تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ امن کے اس پیغام کو تم کھلے دل سے خوش آمدید کہو گے، سردار شاہنواز شاہ! خط فضول طوالت کی بجائے چند سطروں پر ہی مشتمل تھا، ماہن شاہ باپ کو دیکھ رہا تھا۔

"قاصد جا چکا ہے، یا اب آپ نے ٹھہرایا ہوا ہے؟" اس سوال کی اسے فی الوقت امید نہیں تھی، لیکن جواب دینا بھی ضروری تھا۔

"بابا سائیں! وہ باہر موجود ہے، ہم آپ کی اجازت کے بغیر اسے کیسے بھیج سکتے تھے۔ وہ آہستگی سے کہہ رہے تھے کہ انہوں نے خدا بخش کو آواز لگائی تھی۔

"خدا بخش باہر موجود مہمان کی اچھے سے آؤ بھگت کریں۔" خدا بخش کو ہدایت دے کر انہوں نے ماہن شاہ کو کاغذ قلم لانے کو کہا تھا جو وہیں موجود تھے اور وہ ان کے کپے پر عمل کرتے ہوئے کاغذ پر قلم چلانے لگے تھے، وہ خط کے مندرجات لکھوا چکے تو اسے طے کر کے لفافے میں بند کر کے قاصد تک پہنچانے کا حکم دیتے وہ شاہنواز شاہ کا خط لئے مردان خانے سے نکل گئے تھے اور ماہن شاہ ایک گہری سانس کھینچتے کچھ پوچھنے کی خواہش لبوں پر ہی دبا گئے تھے، کیونکہ وہ باپ کے تیور بھانپ گئے تھے کہ وہ فی الحال نہ کچھ انہیں بتائیں گے نہ ہی ان کی کچھ بھی سنیں

گے، جبکہ وہ شاہنواز شاہ کے خط پر حیران تھے تو باپ کی عجلت پر حیرانگی دوچند ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"وسلام! سردار شاہنواز شاہ! ہم دل سے آپ کے مشکور ہیں کہ آپ نے ہمیں دوستی کے قابل جانا، امن تو ہم بھی چاہتے ہیں اور آپ کی پیش کش کو قبول کرنے میں ہمیں ذرا بھی انکار نہیں ہے، عزیز من لیکن آپ نے یہ واضح نہیں کیا کہ دوستی مشروط بنیادوں پر استوار ہوگی یا غیر مشروط؟ سردار افکن شاہ۔"

دلواز شاہ اور وہ خود اس وقت مردان خانے میں موجود تھے، قاصد جو خط دے کر جا چکا تھا، جسے شاہنواز شاہ نے با آواز بلند پڑھ کر بتائی پر رکھ دیا تھا اور گہری سوچ میں تھے کہ دلواز شاہ کی آواز سوچ کے تسلسل کو منتشر کر گئی تھیں۔

"ادا سائیں! میں آپ کی ان کوششوں کو سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ آخر کیوں یکدم ہی افکن شاہ سے دوستی کے خواہ ہو گئے ہیں۔" انہوں نے مختصر سا نول شاہ کے ارادے ان کے گوش گزار کر دیے تھے۔

"ادا دلواز ہم نے اپنے فائدے میں جانے والا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔" ادا سائیں! یہ موقع کس کام کا جس میں خود ہمیں جھکنا پڑے۔

"تو کم عقل ہے ادا دلواز! دوستی کا ہاتھ بڑھانے والا ہمیشہ اونچائی پر رہتا ہے (وہ یہ جان کر بھی ہمیشہ ایسی کسی کوشش سے دور رہے اور افکن شاہ کی ہر کوشش بھی ناکام بنادی تھی وہ ٹھیک ہی خود کو موقع پرست کہہ رہے تھے) اور ہماری بڑائی تو ثابت ہو چکی، جھکنا تو افکن شاہ کو پڑے گا۔" ان کے سانولے چہرے پر مکروہ سازش کا جال بنا صاف نظر آ رہا تھا۔

"ہم افکن شاہ کو اتنا بے وقوف نہیں سمجھتے تھے کہ وہ ہمارے ایک چھوٹے سے پیغام کو فوراً ہی

پذیرائی دے گا۔"

"ادا سائیں! وہ کیوں نہیں دیتا، اس کے باپ دادا اور وہ خود بھی تو کوشش کر چکا ہے اور اب تو وہ بات بھی نہیں رہی جس کی بنیاد پر دوستی کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہوا تھا، زینت دہی بھی جو بیابانی گئی اور ماہن شاہ کی بھی شادی ہو چکی، افکن شاہ اپنی ضد بھی پوری کر کے رہا اور دوستی قبول کر کے اس کی خواہش بھی پور ہو جائے گی اور اس کی دریا دلی۔"

"اویئے چپ کر جا، تجھ میں اپنی بیوی کی خاصیت آتی جا رہی ہے، بولنا شروع ہوتا ہے تو نہ عقل سے کام لیتا ہے، نہ سانس لیتا ہے۔" دلواز شاہ شرمندہ ہو کر چپ کر گیا تھا۔

"دلواز! یہ قدم بے سوچے سمجھے نہیں اٹھایا، شرط تو اب بھی ہماری وہی ہے، فرق بس اتنا ہے کہ پہلے ہم بیٹی دے رہے تھے، اب بیٹی لیں گے، پہلے ہم جھک رہے تھے، اب وہ جھکے گا، بلکہ مرتے دم تک جھک کر رہے گا، یہ سمجھ لے دلواز کہ ہم ایک تیر سے دو نشانے لگائیں گے، دوستی کا ہاتھ بڑھا کر ہم نے اپنی بڑائی ثابت کی ہے اور ایسا کر کے بیٹے کے دل میں بھی اپنا مقام بلند کر لیا ہے، وہ اب کم از کم باپ کے خلاف نہیں جائے گا۔"

"ادا سائیں! اگر اس نے آپ کی شرط ماننے سے انکار کر دیا۔"

"شرط رہیں گے کب، جو ماننے اور نہ ماننے کا سوال پیدا ہوگا، میں سچ کہتا ہوں عقل نام کی کوئی چیز اب تیرے پاس نہیں رہ گئی، دماغ کو چلایا کر دلواز۔" وہ اس کی انسٹ کر رہے تھے اور وہ برداشت کرنے خاموش رہنے پر مجبور تھے۔

"دوستی غیر مشروط بنیادوں پر استوار کریں گے اور جھک کر چند ماہ بعد اس کی بیٹی کو اپنے پتر کے لئے مانگیں گے، ہمارا دشمن تو وہ ہے، لیکن یہ

بات ضرور ہے کہ وہ ایک اچھی نسبت کا کھرا شخص ہے، برے کو برائی سے اور اچھے کو اچھائی سے مارو اور اسے جھکانے کو ہم اچھا بن کر اس سے ملیں گے، ہم اپنے باپ دادا کی بے عزتی بھولے نہیں ہیں، ہماری انا آج بھی بلبلارہی ہے کہ اس نے ہمارے دادا کے فیصلہ کی لاج نہیں رہی تھی، دوستی اس کے خاندان سے ہمیں نہ کل کرنی تھی نہ آج کرنی ہے، ہمارا پتر ایسا چاہتا ہے اور ہمیں افکن شاہ کو جھکانے کا موقع مل رہا ہے، ہمارا پتر جوان ہے جوش میں کچھ ایسا کر بیٹھا کہ ہمیں جھکنا پڑے، اس لئے ہم پہلے سے ہی ساری بساط اپنی مرضی کے مہروں کی بچھا لیتا جاتے ہیں۔" ان کے دماغ میں کتنی ہی سازشیں تسلسل سے چل رہی تھیں کہ کون سی چال کب اور کیسے چلنی ہے، اس بات تک کا وہ لائحہ عمل تیار کر چکے تھے۔

"ادا سائیں! اگر اس نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو؟" وہ اب بھی ابھمن کا شکار تھے، چالباز اور موقع پرست تو وہ بھی تھے لیکن ان کی ساری خوبیاں خامیاں شاہنواز شاہ کے سامنے ماند پڑ جاتی تھیں، کیونکہ وہ خود کو عقل کل سمجھتے تھے اور جو فیصلہ کر لیتے تھے اس سے ہٹتے نہیں تھے، انہوں نے بھی کسی کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ بھائی سے دب کر رہتے تھے، ایک تو ان کی شخصیت بارعب تھی، دوسرا یہ کہ وہ بھائی کے احترام میں بھی چپ کر جاتے تھے۔

"انکار کر سکتا ہے، مگر کرے گا نہیں اور مہابت خان کی دوستی کب کام آئے گی، اتنے برسوں سے نفرت کی آگ دل میں لئے اس سے ہنس ہنس کر ایسے ہی تو نہیں ملے، ان کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا اور وہ انہیں دھیرے دھیرے اپنے تیار کردہ لائحہ عمل سے آگاہ ہی دینے کے بعد انہیں جانے کا حکم دیتے سانول شاہ کو بھیجنے کا کہہ کر اس کا انتظار کرنے لگے تھے، وہ



میٹرک پاس تھے، لکھنا پڑھنا جانتے تھے مگر سانول شاہ کی تسلی کے لئے انہوں نے خط اسی سے لکھوایا تھا اور دوسرا جوابی خط بھی اسی سے لکھوانا تھا، وہ کوئی بھی کام ادھورا اور کچا نہیں کرنا چاہتے تھے، سانول شاہ خط لکھتے ہوئے بے حد خوش تھا اور اقلن شاہ کی اعلیٰ سوچ کا معترف بھی اور وہ اسے بتاتے جا رہے تھے اور وہ جسے کاغذ پر اتارتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

”بابا سائیں! آپ کے فیصلے کے خلاف کچھ بھی بولنے کی ہم آپ سے پیشگی معذرت چاہتے ہیں کیونکہ ہم یہ سب کہنے پر مجبور ہیں کہ ہمیں آپ کے فیصلے پر اعتراض ہے۔“

”جانتے ہیں اور اول روز سے ہم اسے محسوس بھی کر رہے ہیں، ہو سکتا ہے آپ کو ہمارا فیصلہ ابھی جو قطعاً برا لگ رہا ہے وقت کے ساتھ اس میں بہتری نظر آئے گی۔“ وہ ماہن شاہ کی بات قطع کر کے نرمی سے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے تھے۔

”بابا سائیں! آپ درست کہہ رہے ہیں، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں، سردار شاہنواز شاہ ہرگز بھی بھروسے کے لائق نہیں ہیں، انہوں نے کہہ دیا کہ دوستی غیر مشروط بنیاد پر ہوگی، یہ بات ہم مان ہی نہیں سکتے، کوئی نہ کوئی مفاد ضرور جزا ہے، ورنہ وہ پہل بھی نہ کرتے۔“ ماہن شاہ کو شاہنواز کا اقدام بے مقصد نہیں لگ رہا تھا۔

”جانتے ہیں ہم کو شاہنواز شاہ نے دوستی کا ہاتھ ایسے ہی نہیں بڑھایا، مگر ہمارے نزدیک وجوہات مفاد اور نقصانات سے بڑھ کر کوئی چیز ہے تو وہ ہے امن اور ہم امن قائم کرنا چاہتے ہیں، دشمن بن کر رہنے سے کچھ نہیں ہوتا، بلکہ خدا ناراض ہوتا ہے اور ہم نے فضول کے واہیات میں پڑھ کر شاہنواز شاہ کے بھڑے ہوئے ہاتھ

ٹھکرا دیئے تو، یہ دشمنی نہ جانے کتنی لمبوں تک بڑھے، شاہنواز شاہ زیادہ سے زیادہ ہم سے دشمن دولت، زمین چائیداد ہی تو طلب کریں گے۔“

”بابا سائیں! وہ اپنی سابقہ شرط بھی تو رکھ سکتے ہیں۔“

”بے وقوفی کی بات کی ہے آپ نے ماہن شاہ، آپ بھی شادی شدہ ہیں اور خیر سے اس بچی کی بھی شادی ہو گئی ہوگی۔“

”بابا سائیں! آپ جو مناسب سمجھیں وہ کریں، مگر ہمیں لگتا ہے کہ آپ آستین میں سانپ پالنے والے ہیں، شاہنواز شاہ بھی کسی کے نہیں ہوئے، امن کی آس میں آپ ان کے مکر و خدائے سمجھ نہیں پا رہے، نہ ایسی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ہم وہی کریں گے جو آپ چاہیں گے، آپ کے فیصلہ پر ہم سر جھکا رہے ہیں، لیکن بابا سائیں یہ دوستی صرف دوستی ہی رہی چاہیے، اسے دشتی داری میں بدلنے کی وہ بات ضرور کریں گے اور۔“

”ہم آپ سے بہتر سمجھتے ہیں ماہن شاہ، اس لئے ہمیں نہیں پڑا جانے کی ضرورت نہیں ہے، جہاں تک بات آستین میں سانپ پالنے کی ہے، شاہنواز شاہ کے دشمنی کے وار میں دیکھ چکے ہیں، دوستی بھی کر دیکھتے ہیں، ہو سکتا ہے ہماری نیک نیتی ان پر اثر کر جائے، رہ گئی بات دوستی کی رشتہ داری میں بدلنے کی، وقت آنے پر ہی ہم کوئی فیصلہ کریں گے، بس ابھی ہماری پہلی کوشش ہے کہ تسلی دشمنی ختم ہو جائے۔“ وہ بیٹے کے خدشات بھی سمجھ رہے تھے اور انہیں شاہنواز شاہ سے اچھے کی امید بھی نہیں تھی، پھر بھی وہ ایسا کر رہے تھے تو صرف رب سائیں کے بھروسے پر، خط کا جواب بھلے ہی انہوں نے غلٹ میں دیا تھا، مگر وہ استخار کر چکے تھے، اسی لئے وہ بہت مطمئن تھے اور جب وہ رب کی رضا پر سر جھکا رہے تھے تو کیوں نہ مطمئن ہوتے، وہ اپنا کچھ نقصان نہیں دیکھ رہے تھے، لیکن ماہن شاہ کو اس سب میں

سوائے خسارے کے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، باب سے ادب ملحوظ رکھتے ہوئے بات کی تھی، مگر ان کا اطمینان قابل دید تھا اور وہ اسے انجمن سے نکالنے کے لئے رب کی رضا میں راضی ہو جانے کا مشورہ دیتے، اسے بہت کچھ سمجھاتے اٹھ گئے تھے اور وہ بھی تھا تو انہی کا بیٹا، کچھ نہ کچھ مطمئن ہو ہی گیا تھا اور باب کے حکم پر اس نے قاصد کو شاہنواز شاہ کی حویلی روانہ کر دیا تھا مگر اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اس نے آنکھیں کھلی رکھنی ہیں جب تک اعتماد حاصل نہیں ہو جاتا۔

☆☆☆

شاہنواز شاہ نے زبردست دعوت و طعام کا انتظام کیا تھا، مہابیت خان کی پوری فیملی اور اقلن شاہ کی بھی پوری فیملی مدعو تھی، حویلی کے زنان خانے میں عورتوں کے لئے خاص انتظام کیا گیا تھا، مہابیت خان کی حویلی کی عورتیں پہلے بھی آتی رہی تھیں، اس وقت بھی تقریباً ساری ہی خواتین موجود تھیں مگر اقلن شاہ کی طرف سے مصلحت کے تحت صرف رفیعہ شاہ آتی تھیں، حویلی کی عورتیں اس سب پر حیران تھیں مگر شاہنواز شاہ نے نہ کچھ بنایا تھا نہ ارادہ تھا اور ان سب کو حکم کی تعمیل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، شاہنواز شاہ کے سامنے تو ان کی بوڑھی ماں کچھ نہیں کہتی تھیں بیوی اور دوسری عورتیں کیا چیز ہیں، شاہنواز علاقائی نوک گیتوں پر علاقائی رقص نے محفل پر سماں باندھ دیا تھا، اتفاق سے سانول شاہ شہر سے آیا تھا تو متحیر رہ گیا تھا اور اس کی حیرت شاہنواز شاہ کے تعارف کروانے پر دو چند ہو گئی تھی، ماہن شاہ کو اس نے دیکھا نہیں تھا وہ اپنے ماموں کے بیٹے منزل سے بات کرنے میں ملن تھا۔

”سردار! اس سے ملو یہ میرا بیٹا سانول شاہ، لندن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے۔“

سانول شاہ کا تعارف کرواتے ہوئے ایک خیر سا ان کے لہجے و انداز میں پنہاں تھا، سانول شاہ

نے اقلن شاہ کو دیکھا تھا وہ انداز و اطوار سے ہی شاہنشی کا اعلیٰ نمونہ لگ رہے تھے، ایک تمکنت تھی ان کی شخصیت میں، مصافحہ کر کے وہ بغل گیر ہوئے تھے، ماہن شاہ سے تعارف کے مراحل طے ہوئے تھے، سانول شاہ اندر ہی اندر اس سب کو اپنی حویلی میں دیکھ کر بہت خوش تھا، شاہنواز شاہ نے اسے آنے کو کہا تھا مگر شہر میں مصروفیت ایسی رہی کہ وہ انکار کر گیا تھا مگر محسن شاہ نے فون کر کے کہا کہ وہ فرصت نکالے اور جس طرح بھی پہنچے ہو سکے گاؤں وہ ادھورے کام چھوڑ کر آیا تھا، اسے یہ سب پتہ ہوتا تو وہ ہر کام چھوڑ کر آ جاتا اور وہ اس وقت سفر کی محکمان بھلائے، ماہن شاہ سے بات کر رہا تھا، ماہن شاہ کو یہ شاہستہ تہذیب یا فتنہ شخص کافی بھلا لگا تھا، قبوہ کے دور کے بعد شراب کی محفل لگی، شاہنواز شاہ نے کالج کے بلورس گلاس میں شام کا پہلا جام اپنی دوستی کے نام کرتے ہوئے اقلن شاہ کی طرف بڑھایا تھا۔

”ہم معذرت چاہتے ہیں سردار شاہنواز شاہ ہم نہیں جانتے۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا تھا اور شاہنواز شاہ نے ساری خرافات وہاں سے اٹھوا دی تھیں۔

”یار شاہنواز جتنے ادا اقلن نہیں ہیں اور محروم اس نعمت سے ہمتیں کر دیا گیا ہے، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“ مہابیت خان کے قبضہ لگاتے ہوئے اپنے ذریعہ خیالات سے آگاہ کیا تھا۔

”تم کہو گے تو یہ نعمت تمہارے ساتھ کر دی جائے گی، مگر ابھی کے لئے معذرت، مہمان خصوصی کی پسند نا پسند کا خیال رکھنے پر مجبور ہوں۔“ وہ بھی نہایت ہلکے پھلکے انداز میں بولے تھے۔

”جناب! ہماری طرف سے سب کو اجازت ہے، کیوں ہمیں آپ کے منہ سے پیانہ



چھین کر سب کی نظروں میں گناہگار بنا رہے ہیں۔“ وہ خود نہیں پیتے تھے مگر واقف تھے کہ یہاں کے مردوں کا یہ پسندیدہ مشروب ہے۔

”میں آپ لوگوں سے اجازت چاہوں گا۔“ سانول شاہ اس محفل کے جننے سے قبل ہی اٹھ گیا تھا اور ان لوگوں نے بھی کچھ دیر بعد اجازت طلب کی تھی ساتھ ہی انہوں نے اگلے جمعہ کو ان کو اپنے ہاں انوائسٹ کیا تھا، پھر جمعہ کے دن دعوت میں شاہنواز شاہ کی حویلی کی تقریباً سب ہی عورتیں آئی تھیں، عائشہ کے نکھیاں کی ساری خواتین تھیں، وہ سب کو بہت عرصے بعد ایک ساتھ دیکھ کر بہت خوش تھیں، ان کی ساری کزنز بے حد خوبصورت تھیں، مگر وہ پھر بھی سب میں نمایاں تھیں۔

”تیری دھی بڑی سوہنی ہے۔“ یہ بات رفیعہ سے سانول شاہ کی دادی نے بھی تھی اور وہ جھینپ گئی تھی، اتاری رخسار، دھک اٹھے تھے، سیاہ رنگ کے علاقائی کپڑوں میں اس کی گلابی رنگت چل جا رہی تھی، کچھ لڑکیاں ایسی بھی تھیں، جو جل بھن کر کیا ہو گئی تھیں اور ان میں ایک مصومہ شاہ بھی تھی جو ملکونی حسن کی مالک تھی، اپنی تمام کزنز میں سب سے زیادہ حسین، جس کا اسے ادراک خود سے بھی تھا اور ہمیشہ تعریف کے ڈونگرے برسا کر اس احساس کو تقویت دی گئی تھی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس کی جگہ کسی اور کی تعریف کی گئی ہو، سراہا گیا ہو، سانول شاہ کا دل اس کی ایک جھلک دیکھ لینے کو چلا جا رہا تھا، مگر ایسا ناممکن ہی تھا، وہ ان سے قدرے دور بیٹھا تھا، اپنی حویلی میں تو وہ ایسی محفل سے پہلے اٹھ گیا تھا، مگر یہاں رکے رہنا اس کی مجبوری تھی، اسے الگ تھلک دیکھ ماہن شاہ کو آداب میزبانی یاد آئے تھے اور وہ بلوریں گلاس اٹھائے اس تک آ گئے تھے۔

”معذرت، میں پینے کا شوق نہیں رکھتا۔“

بڑھے ہوئے گلاس کو دیکھ کر نہایت سنجیدگی و نرمی سے کہا تھا، ماہن شاہ کو حیرت ہوئی تھی۔

”آپ اتنا حیران کیوں ہو رہے ہیں، آپ بھی نہیں پیتے۔“ وہ مسکرایا تھا اور اس کی مسکراہٹ بلاشبہ بڑی حسین تھی۔

”سانول شاہ، حیرت صرف اس لئے ہے کہ اس حویلی کا کوئی فرد شراب نہیں پیتا اور آپ کے ہاں تو یہ عام ہے، ایسے میں ہماری حیرت ایسی بے جا بھی نہیں ہے۔“

”آپ نے ٹھیک کہا، ہٹ میں نے ساری زندگی حویلی سے باہر گزاری ہے، یہاں کے طور طریقے مجھے سخت ناپسندیدہ ہیں۔“

”ایک آزاد فضا میں رہنے کے باوجود۔“

”ہا ہا، جی ایک آزاد فضا میں رہنے کے باوجود بھی میں ایسا ہوں، میری کوشش ہوئی ہے کہ ان کاموں سے بچا رہوں، جن کے لئے رب سائیں نے منع کیا ہے، میں کوئی بکا مسلمان نمازی ٹائپ بندہ نہیں ہوں، مگر اتنا ضرور ہے کہ کبھی کبھار نماز پڑھ لی، چند ایک اچھے اور نیک کام کر لئے۔“

”سانول شاہ مسلمان بس مسلمان ہوتا ہے، کچا بکا کچھ نہیں ہوتا آپ کی سوچ کافی مثبت ہے، تھوڑی سی کوشش سے آپ اپنا ہر ایک عمل مثبت بنا سکتے ہیں۔“ ماہن شاہ کو اس سے بات کر کے حقیقتاً بہت اچھا لگا تھا، انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ اتنی اچھی سوچ کا حامل شخص شاہنواز شاہ کا بیٹا ہے، مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ سانول شاہ نے ہر ایک اچھائی اور مثبت سوچ اپنی ماں سے ورثے میں لی تھی، سانول شاہ کی ماں نصرت بی بی، گاؤں کے مسجد کے امام کی حافظ قرآن بیٹی تھیں، اتفاقی طور پر شاہنواز شاہ نے انہیں دیکھا اور پھر ضد کر کے ان سے نکاح کیا تھا مگر ان کو حویلی میں جگہ نہیں مل سکی تھی، شاہنواز شاہ کی پہلی بیوی نادرہ نے اور حویلی کی دیگر عورتوں نے بھی نصرت بی بی کو

عزت و احترام اور ان کا جائز مقام نہ دیا اور ظلموں کے پہاڑ توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، نصرت بی بی نے یہ سب شوہر سے بھی کہا نہیں اور خود سے انہوں نے کچھ محسوس نہ کیا، نصرت بی بی نے سانول کو جنم دے کر دنیا سے منہ موڑ لیا تھا، جہاں حویلی کی عورتوں نے ان کی موت پر سکون کا سانس لیا تھا، وہیں وہ ان کی اہمیت کو ان کی زندگی میں تو ماننے کو تیار نہ ہوئیں تھیں مگر موت کے بعد ان کی اہمیت کو بھی چیلنج نہیں کر سکی تھیں، کیونکہ شاہنواز شاہ کا نام نصرت بی بی کے بیٹے سے ہی چل رہا تھا، نادرہ سے شاہنواز شاہ کی صرف بیٹیاں تھیں اور ماں کا نیک اور پاکیزہ خون ماں کا اعلیٰ کردار، سانول شاہ کے اوپر چھپر چھا رہا ہوا تھا وہ برائی کی طرف بڑھنا بھی چاہتا تھا تو کوئی انجانی طاقت اسے روک دیتی تھی، ظاہری و باطنی طور پر وہ ایک جیسا تھا اور خامیوں کا گراف نہایت کم تھا اس کی سب سے بڑی خامی اس کی ”میں“ تھی، وہ انسان کو انسان سمجھتا تھا، برتر و کم تر نہیں، مگر جب بات اپنی آتی تھی تو مقابل نہیں دیکھتا تھا کہ کون ہے جو کہہ دیا، جو سوچ لیا بس وہی کرنا ہے، کیونکہ نادرہ اسے ایک ماں کا پیار رقابت کی وجہ سے دے نہیں سکتی تھیں، اس کی زیادہ پرورش اس کی دادی نے کی تھی، پھر وہ اٹھارہ برس کی عمر میں لندن چلا گیا تھا اور حج معنوں میں اب وہ حویلی میں رہ رہا تھا اور ان کے طور طریقے دیکھ رہا تھا اور اسے عجیب سی الجھن ہوئی تھی، حویلی کے ہر فرد سانول شاہ سے ڈرتا تھا، حسن شاہ بھی نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے دب کر رہتا تھا جبکہ دونوں نے بہت سا وقت ساتھ گزارا تھا، مگر وہ محسن کو بھی لمحوں میں بے عزت کر کے رکھ دیتا تھا اب جہاں صرف لوگ سر جھکانے والے ہوں وہاں گردن میں کلف تو لگ ہی جاتا ہے اور اس کی گردن بھی فخر و غرور سے تنی رہتی تھی۔

ماہن شاہ اب اس سے اس کی تعلیم کے متعلق پوچھ رہے تھے اور وہ اس سے کافی متاثر ہوئے تھے، سانول شاہ نے بھی اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کی تھی، مگر وہ آج ماہن شاہ کو اس طرح کی باتیں بتا رہا تھا تا کہ وہ اس کی شخصیت سے مرعوب ہو جائیں، کیونکہ وہ اپنے دل کی خواہش کو جلد سے جلد پوری کرنا چاہتا تھا اور جب یہ بات چلتی تو وہ اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتے، اس میں کچھ خوبیاں پیدا کئی تھیں اور ماہن شاہ اسے تو اتنے زبردست نگاہ تھے کہ وہ سچ چھوٹ اور اصل نقل کی پہچان کر سکیں اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کھلے دل سے بعد میں سانول شاہ کی باپ سے تعریف کی تھی اور یہ سب تو خود انہوں نے بھی محسوس کیا تھا، سانول شاہ اس حویلی کا حقیقتاً ہیرا تھا۔

☆☆☆

”سائیں! ہم نے عائشہ کے سلسلے میں آپ سے کوئی بات کی تھی آپ نے جواب نہیں دیا۔“

”مزل! ہمیں اس لحاظ سے پسند نہیں ہے، مگر ہم مناسب نہیں سمجھ رہے، اس لئے ہم نے خاموش رہنے کو بہتر سمجھا ہے۔“ وہ ریلیکس انداز میں لیٹ گئے تھے۔

”سائیں! مگر اس طرح لٹکا کر رکھنا بھی تو مناسب.....“

”ہم نے خاموشی کو سوچ سمجھ کر اپنایا ہے، انکار کو اتنا مسئلہ بنایا جا سکتا ہے اور رشتوں میں دوری آ سکتی ہے، مگر ہم کسی کی ناراضگی کے ڈر سے کوئی غلط فیصلہ نہیں لے سکتے مزل، کم تعلیم اخلاقی برائیوں سے مزین ہیں اور ہم اپنی بیٹی کی شادی اعلیٰ کردار کے شخص سے کریں گے، چاہے وہ ہمارے ہم پلہ نہ ہو، ہم اپنی حشمت و جاہ و جلال کے لئے اپنی بیٹی کو قربان نہیں کریں گے۔“ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے دھیمے دھیمے لیکن ٹھوس بے لچک لہجے میں بول رہے تھے۔



”اگر آپ کو خاموشی مناسب نہیں لگ رہی ہے تو آپ ہمارا صاف انکار ادا مہابت تک پہنچا دیں، خاموش رہیں یا کہیں، ہو گا انکار ہی، وہ آپ کے بھائی ہیں، ہم سے بہتر نہیں آپ بھتی ہیں اور سمجھا سکتی ہیں، رات بہت ہو گئی ہے، ہم سونے لگے ہیں، آپ بھی سو جائیں۔“ لیپ بچایا تھا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئے تھے اور وہ بھی ابھی سی ان کے پہلو میں دراز ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

”اماں سائیں! آپ اجازت دیں تو ہم کچھ دنوں کے لئے اپنے میکے چلے جائیں۔“ اس وقت بیٹھک میں وہ دونوں ہی تھیں، عاتشہ کے امتحانوں میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا اس لئے وہ زور و شور سے تیاری میں لگی ہوئی تھی، اس وقت بھی آیا آئی ہوئی تھیں، آپا گاؤں کے اگلو تے اسکول کی استانی تھیں۔

”ہاں، آپ چلی جائیں، دن بھی تو بہت ہو گئے ہیں، لیکن ماہن شاہ سے ضرور پوچھ لیجئے گا۔“ اماں سائیں! ہم سائیں سے پوچھ لیں گے، بس آپ کی اور بابا سائیں کی اجازت درکار تھی۔“ وہ خوشی سے بولی تھیں۔

”ہماری دھی کو ہم سے کیسی اجازت چاہیے؟“ وہ اپنے مخصوص انداز میں کھانتے اندر چلے آئے تھے اور ان کی کھنکار کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ شمسہ نے سر سے ڈھلک جانے والی چھری، سر پر ڈال لی تھی اور وہ دونوں کھڑی ہو گئی تھیں اور سلام کیا تھا تب وہ نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے تھے۔

”بابا سائیں! ہم میکے جانے کی اجازت۔۔۔۔۔“

”ہم ماہن سے کہہ دیں گے وہ آپ کو چھوڑ آئیں گے۔“ وہ بات بھی مکمل نہیں کر پائی تھی کہ وہ بول پڑے تھے، شمسہ ان کی عزت ایک باب کی طرح کرتی تھیں تو انہوں نے بھی اسے عاتشہ

کی طرح ہی مان و محبت دی تھی۔

”بہت شکریہ بابا سائیں!“

”صرف زبان سے شکریہ نہیں چلے گا، ہماری بیٹی اپنے ہاتھوں سے اپنے بابا کے لئے قبوہ بنا کر لائیں گی۔“

”جی بابا سائیں! کیوں نہیں، ہم ابھی لے آتے ہیں۔“ وہ جلدی سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھیں۔

”ہم بہت خوش نصیب ہیں، رفیعہ، ایسی نیک بہو تو نصیبوں والوں کو ہی ملتی ہے، ہمارے بیٹے کا انتخاب اعلیٰ تھا، ہماری حویلی کی رونق بڑھا دی ہے شمسہ دھی نے۔“ وہ شوہر کی بات کی تصدیق اثبات میں ملتے سر اور مسکراہٹ کے ذریعے کر رہی تھیں۔

”اور وہ دونوں شرارتی کہاں ہیں دکھائی نہیں دے رہے اور عاتشہ دھی بھی نہیں دیکھ رہیں۔“

”دونوں بچے پڑھنے لگے ہوئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے اور عاتشہ کو بڑھانے ان کی استانی آئی ہوئی ہیں اس لئے وہ بھی پڑھائی میں مصروف ہیں۔“ وہ آج کے دن، وہ کہہ کر چپ ہی ہوئی تھیں کہ وہ دونوں بستہ لئے چلے آئے تھے اور ادب سے سلام کرتے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئے تھے اور اپنے بسترے رکھ کر واپس آ گئے تھے، دادی کا لاڈلا ریان دادی کے پاس اور دادا کا لاڈلا عالیان ان کے پاس بیٹھ گیا تھا، حویلی میں کتنے ہی ملازم تھے مگر اپنے ذاتی کاموں کے لئے منٹ منٹ پر ملازموں کو آواز دینے کا یہاں رواج نہ تھا، مگر وہ دونوں عام بچوں کی طرح اسکول اور شام میں ٹیویشن جاتے تھے کوئی خاص پروٹوکول نہیں دیا جاتا تھا اور یہ اکلن شاہ کا حکم تھا ان دونوں کو بھی غلطی پر پانی بچوں کی ہی طرح ملتی تھی؟ اس سب سے اکلن شاہ کا مقصد اتنا ہی تھا کہ ان دونوں کے دل و دماغ میں اپنی برتری کا

خیال جگہ نہ بتائے، انسانیت ان کے اندر پختی رہے۔

”ہاں بھئی، شمسہ اے کیسی چل رہی ہے آپ کی بڑھائی؟“

”جی بہت اچھی دادا سائیں! مجھے استاد جی نے آج شاباش بھی دی ہے۔“ عالیان نے فخر سے بتایا تھا، رفیعہ نے خاموش بیٹھے ریان سے بھی وہی سوال پوچھا تھا جو کافی اداس لگ رہا تھا۔

”دادی اماں! ریان کو استاد جی سے ڈانٹ پڑی ہے۔“ اس سے پہلے ہی وہ بول گیا تھا۔

”کیوں ہمارے شمسہ اے کو ڈانٹ کیوں پڑی۔“ رفیعہ نے اس کے ماتھے پر آئے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے پیار سے اس کو دیکھا تھا۔

”سبق یاد نہیں کیا تھا ریان نے۔“

”اوہوں، عالیان آپ سے ہم نے کہا ہے نہ کہ جب آپ سے نہ پوچھا جائے تو آپ درمیان میں نہیں بولا کریں۔“ اکلن شاہ نے نرمی سے کہنے پر وہ شرمندگی سے سر جھکا گیا تھا اور انہوں نے ریان کو اپنے پاس بلایا تھا۔

”سبق دیا کیوں نہیں کیا تھا آپ نے؟“

”دادا سائیں! ہمیں سندھی اچھی نہیں لگتی، ہم سے یاد بھی نہیں ہوتی، ہمیں سندھی بالکل سمجھ نہیں آتی۔“ وہ زور دے پین سے بولا تھا۔

”آپ نے یہ سب اپنے استاد جی کو بتایا، ان سے کہا؟“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی تھی۔

”آپ یہ سب اپنے استاد جی سے کہہ دیں۔“

”نہیں دادا سائیں اس طرح تو وہ ہمیں اور ڈانٹیں گے۔“

”نہیں ڈانٹیں گے، آپ جب ان سے اپنی پرابلم شیئر کرو گے تو وہ آپ کو اس کا سیلوشن دیں گے کہاں آپ اپنی پرابلم ان سے شیئر نہیں کو گے تو انہیں بھی آپ کی کمزوری کا پتہ نہیں چلے گا اور کمزوری دور ہی جب ہوتی ہے جب اس کا

ادراک ہو جائے، آپ ہماری بات سمجھ رہے ہیں نہ۔“ پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے سمجھائے ہوئے استفسار کیا تھا اور وہ اثبات میں سر ہلا گیا تھا۔

”دادا سائیں! ہم کل ہی استاد جی سے اپنی پرابلم شیئر کر لیں گے۔“

”گڈ بوائے اور آپ کو بھی کوئی پرابلم ہوا کرے تو آپ اپنے استاد جی سے شیئر کر لیا کریں، ویسے آپ کو سندھی کیسی لگتی ہے؟“ اب وہ عالیان کو دیکھ رہے تھے۔

”ہمیں ہر مضمون اچھا لگتا ہے دادا سائیں! مشکل بھی نہیں لگتا، کیونکہ مشکل کچھ بھی نہیں ہوتا، ہمارا کمزور ارادہ مشکلات کو جنم دیتا ہے اور ہمارے ارادے ہر گز بھی کمزور نہیں ہیں۔“ اس کا اعتماد قابل ستائش تھا۔

”گڈ، لیکن خیال رہے، ہمارے ارادے صرف مضبوط ہونے چاہیے، اس میں باطل سوچ و عمل کا کردار نہیں ہونا چاہیے اور نہ اس کے لئے جگہ ہونی چاہیے۔“ وہ پوتے کی سوچ سے متاثر ہوئے تھے اور سمجھانا اپنا فرض سمجھا تھا۔

”سلام اماں سائیں!“ وہ ماں کو ٹرالی گھسیٹ کر لاتے دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے، شمسہ نے ان دونوں کے سلام کا جواب دیا تھا اور سب کو قبوہ دینے لگی تھی۔

”اماں سائیں! آپ کہاں جا رہی ہیں، ہمارے ساتھ قبوہ نہیں بیٹیں گی۔“ اس کو جاتے دیکھ کر عالیان جلدی سے بولا تھا۔

”ہم عاتشہ بواجی کو بھی بلا لاتے ہیں اماں سائیں۔“ ریان جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

”آپ رہنے دیں ریان ہم عاتشہ کو بلانے نہیں، قبوہ دینے جا رہے ہیں، ان کی ٹیچر صاحبہ آئی ہوئی ہیں۔“ وہ بیٹے کی عجلت پر مسکراتے ہوئے وہاں سے نکل گئی تھیں۔

☆☆☆



”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ شمسہ انہیں خاموش سا دیکھ کر پریشان سی ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ گئی تھیں۔

”آپ کو تو بخار ہے۔“ پریشانی ان کے لہجے سے ہوتی تھی۔

”ہم ابھی ڈاکٹر کو.....“

”دکھا چکا ہوں، دوائی بھی لی ہے، آپ ہمارے لئے اسٹراٹنگ سی چائے بنا لیں اور پلیر سر دبا دیں بہت زیادہ تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔“ وہ آنکھیں بند کیے دھیمے سے بول رہے تھے، وہ جلدی سے اٹھی تھی۔

”ہماری طبیعت کا کسی سے بھی ذکر مت کیجئے گا، فضول میں سب پریشان ہو جائیں گے۔“ وہ ان کی ہدایت کے ساتھ ہی باہر نکلی تھی۔

”شمسہ فارغ ہیں تو ہمارے کمرے میں آئیے ہمیں کچھ بات کرنی ہے۔“ انہیں دیکھتے ہی رفیعہ نے کہا تھا۔

”اماں سائیں! آپ ناراض نہ ہوں تو ہم سائیں کے لئے پہلے چائے بنالیں، آپ کی بات اس کے بعد سن لیں گے۔“

”آپ جا کر چائے بناؤ، ہم آپ سے بعد میں بات کریں گے اور یہ ماہن کی طبیعت تو ٹھیک ہے، کچھ ٹھکے ٹھکے سے لگ رہے تھے خیال آنے پر وہ پوچھ بیٹھی تھیں۔“

”جی اماں سائیں، بس سر میں درد ہے، اسی لئے ہم چائے بنانے آئے تھے۔“

”ٹھیک ہے آپ جائیں اور ماہن کے سر میں تیل کی مالش کر دیجئے گا، اپنی صحت کا وہ بالکل خیال نہیں رکھتے، مگر آپ ان کا خیال رکھا کریں۔“

”جی بہتر اماں سائیں!“ ان سے اجازت ملتے ہی وہ بچن میں آئی تھی، ایک کپ چائے بناتی تھی، ٹرے میں رکھ کر بچن سے لگی تھی کہ سیکس تیل کی بوتل لئے آگئی تھی وہ اپنے کمرے میں آگئی

تھی، چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھی تھی اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگی تھی۔

”آپ اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتے۔“ وہ سر دباتے ہوئے نرمی سے بولی تھی۔

”آپ جو ہیں میرا خیال رکھنے کے لئے۔“ مسہری کے سر ہانے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے تھے اور انہوں نے چائے کا گپ تھما دیا تھا اور وہ اس کی اتری صورت دیکھ کر آہستگی سے بولے تھے۔

”کچھ نہیں ہوا ہے شمسہ، معمولی سا بخار ہے اور آپ کی شکل ایسی ہو رہی ہے جیسے ہمیں کوئی بہت بڑی بیماری ہو گئی ہو۔“

”اللہ نہ کرے۔“ وہ دہل کر بولی تھی اور آنسوؤں کو آنکھوں سے باہر کا راستہ مل گیا تھا۔

”آپ کے معمولی سے بخار نے ہماری جان نکال دی ہے۔“

”او کے بابا سوری! آپ رونا بند کریں، ہمارے سر کی تکلیف بڑھ رہی ہے، آپ جیسی طبیب ہیں درد کا مداوا کرنے کی بجائے تکلیف بڑھا رہی ہیں۔“ اس نے آنسو رگڑ کر جلدی سے سوری کی تھی۔

”ہم آپ کے سر میں تیل لگا دیتے ہیں۔“ ان کا مثبت اشارہ یا کر وہ دھیرے دھیرے ان کے سر میں تیل سے مالش کرنے لگی تھی۔

”آپ بہت خراب ہیں۔“ آنکھیں بند کرنے لگے تھے کہ آواز آئی تھی۔

”ایسا کیا کر دیا ہے ہم نے؟“ وہ سکون محسوس کر رہے تھے۔

”کیا کر دیا ہے، ہمارے سارے پلان پر پانی پھیر دیا ہے اور محسوس ایسے بن رہے ہیں کہ جیسے کچھ کیا ہی نہ ہو، تیل کی بوتل کا ڈھکن لگا کر بوتل ٹیبل پر رکھی، وہ ہاتھ دوڑنے چلی گئی تھی اور تولیے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے ان کو دیکھ کر بولی تھی۔“ انہوں نے اسے اشارے سے اپنے

پاس بلایا تھا، وہ تولیہ اسٹینڈ پر ڈالتی ان کے قریب آ کر کھڑی تھی، ماہن شاہ نے اس کے بازو کو نرمی سے گرفت میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچا تھا، ایسے کسی عمل کی اسے توقع نہ تھی، وہ پورے وجود سے ان پر آگری تھی۔

”ہاں کیا کیا ہے ہم نے۔“ وہ اس کے سٹکی بالوں کی چند آوارہ لٹکیں اس کی صبح پریشانی سے ہٹاتے ہوئے شریہ لہجے میں پوچھ رہے تھے اور اس کی تو شرم و حیا سے بولتی ہی بند ہو گئی تھی۔

”کچھ دیر پہلے تو بہت بول رہی تھیں، اب کیا ہوا؟“ وہ اس کی حالت سے محفوظ ہوئے تھے اور اس کے اٹھنے کی ہر کوشش ناکام بنا دی تھی۔

”پلیز ماہن چھوڑ دے نہ۔“ ہلکی سی مزاحمت کی تھی مگر جسے درخور اعتنا نہیں جانا گیا تھا۔

”ماہن! دروازہ پر دستک ہو رہی ہے۔“

”یار کہہ کر آیا کرو نہ کہ کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے۔“ شوخ سی جھڑپ کے ساتھ اس کے وجود کے گرد سے اپنا حصار کھینچا تھا۔

”اوف، کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“ وہ سیدھی ہوئی تھی۔

”جانے کی ضرورت نہیں ہے، بہانہ کر کے آ جاؤ۔“ وہ اس کو نرم گرم نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور وہ ان کے دائیں پہلو سے اپنا آچل اٹھانے کو جھکی تھی کہ وہ پھر شرارت کر گئے تھے۔

”آپ کا بھی دل نہیں چاہ رہا نہ، دروازہ پر دستک ہونے دیجئے، جو بھی ہو گا تنگ آ کر چلا جائے گا۔“ وہ کان کی لوؤں تک سرخ پڑتی سیدھی ہو گئی تھی، آچل سلیقہ سے اوڑھا تھا اور دروازہ کھول دیا تھا۔

”اماں سائیں! ہم کب سے دستک دے رہے تھے۔“ ریان کو اندر آنے کی جلدی تھی، ماہن شاہ نے قہقہہ لگایا تھا اور وہ بری طرح ہنسنے لگی تھی۔

”آپ کو کوئی کام تھا۔“ انہیں گھورنا چاہا

تھا۔

”جی اماں سائیں! کل ہمارا ٹیسٹ ہے، آپ یاد کروادیں گی؟“ وہ باپ سے چپک کر بیٹھ گیا تھا۔

”ہاں، کیوں نہیں بیٹا، آپ اپنے کمرے میں چلو، ہم آرہے ہیں، عالیان کہا ہیں، انہوں نے ٹیسٹ کی تیاری کر لی؟“

”بابا سائیں! وہ ٹیسٹ دے چکے ہیں، ہمیں سندھی یاد نہیں ہوتی، اس لئے ہم آج ٹیسٹ میں ٹیل ہو گئے تھے، اس لئے کل ہمارا دوبارہ ٹیسٹ ہو گا۔“ وہ شرمندگی سے پتارہا تھا پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ رنگ گئی تھی، جبکہ اس نے سنا نہیں تھا۔

”کیوں یاد نہیں ہوتی سندھی ہمارے شہزادے کو۔“

”وہ داخل پایا سائیں! ہمیں بواجی پڑھاتی ہیں اور ان کے ایگزامز ہونے والے ہیں تو وہ بڑی ہیں، اسی لئے تو ہم اب اماں سائیں سے ہیلپ لینے آئے ہیں، اماں سائیں! آپ ہمیں سندھی کا سارا سبق یاد کروادیں گی نہ۔“ باپ کو ساری پر اہم بتاتے ہوئے اس نے یکدم پاں سے پوچھا تھا، بیٹے کی فرمائش پر حیران رہ گئی تھی اور برس ہاتھ سے ہی گر گیا تھا وہ اس کی حالت سے محفوظ ہوئے تھے اور وہ ماں کی حالت سے انجان اپنا سوال دہرا رہا تھا۔

”کیوں نہیں، ہمارے بیٹے کی اماں۔“ وہ مسکراتے ہوئے شرارت سے بولے تھے۔

”ہمیں ٹیل نہیں ہونا ہے بابا سائیں! ہماری کتنی انسٹ ہوئی ہے ہم نے اب اچھے سے سبق یاد کرنا ہے۔“ وہ باپ کی شرارت کہاں سمجھا تھا، برامان کر بولا تھا۔

”ہمارے شہزادے نے پاس ہونے کے لئے غلط استاد منتخب کیا ہے، بیٹا جانی! آپ کی اماں سائیں کو سندھی نہیں آتی۔“ وہ ان کے



گھورنے کی پرداہ کیے بغیر متبسم سے گویا ہوئے تھے۔

”اماں سائیں! کو بھی ہماری طرح سندھی بری لگتی ہوگی۔“ اس نے فوراً ہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے بیٹا اور آپ پریشان نہ ہو، آپ کے بابا سائیں کو بہت اچھی سندھی آتی ہے، یہ آپ کی ساری تیاری کروادیں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جوابی حملہ کیا تھا اور سکون سے چوٹی کے بل پورے کیے تھے۔

”بابا سائیں! آپ ہمیں یاد کروا دیں گے!“

”ہاں بیٹا آپ جا کر اپنی کتابیں لے آؤ اور بابا سائیں آپ کی اتنی اچھی تیاری کروائیں گے کہ آپ کے عالیان سے بھی اچھے مارکس آئیں گے۔“ وہ اسے جوش دلانے کو بولی تھی اور وہ چھلانگ مار کر مسہری سے اتر اٹھا اور ماہن شاہ کے کچھ بھی سمجھنے سے پہلے ان کے روم سے رنو چکر ہو گیا تھا اور وہ ان کو دیکھ کر ہنسنے لگی تھی۔

”ادھر آئیں ذرا۔“

”جی نہیں، ہم جا رہے ہیں، آپ کا ایک دم نیا فریش اسٹوڈنٹ آنے والا ہوگا۔“ وہ ان کے پلانے کو نظر انداز کرتی مسکراتے لہجے میں بولی تھی۔

”خدا کے لئے شمس! آپ ریان کو عائشہ یا پھر اماں سائیں کے حوالے کر دیں۔“ ماہن شاہ لجاجت سے بولے تھے، کیونکہ ریان پڑھنے میں عالیان سے بھی زیادہ اچھا تھا، مگر سندھی اسے بالکل نہ سمجھ آتی تھی، نہ ہی اسے یہ مضمون پسند تھا، وہ اس معاملے میں شمس پر گیا تھا، جو شادی کے نو برس بعد بھی سندھی سے نابلدہ ہی تھیں جبکہ یہاں کی مقامی زبان سندھی تھی، اکثر گھر میں سندھی میں بات بھی کی جاتی تھی، مگر وہ خود اپنا اردو سیکھانگ تھی اور سندھی ان کے سر سے گزرتی تھی، دونوں بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری عائشہ نے لی ہوئی

تھی اور عائشہ ریان کو جتنی محنت سے سندھی کی تیاری کرواتی تھی بس اس کا حوصلہ تھا اور یہ بات ماہن شاہ کے علم میں بھی اس لئے وہ اسے پڑھانے کا سوچ کر ہی پریشان ہو گئے تھے۔

”آپ ہنستے ہوئے بہت بری لگ رہے ہیں۔“ انہیں بیٹے پر کچھ غصہ سا آنے لگا تھا، جس نے ان کے رومینک موڈ کا ستیاناس کر دیا تھا اور اس پر نئی افتاد نازل ہونے لگی تھی۔

”آپ لیکن خفا خفا بہت اچھے لگ رہے ہیں۔“ وہ کھل کھل کر ہنس رہی تھی، وہ ان سے کافی دور تھی، بلانے پر بھی قریب نہیں گئی تھی۔

”اماں سائیں! بابا نے آپ کو جوک سنایا ہے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

”جی اور آپ اپنے بابا سائیں کو تنگ نہیں کر سکتے تو یہ آپ کو بھی جوک سنائیں گے۔“ وہ بیٹے کی پیشانی چوٹی ان کے سنارے اشارے نظر انداز کرتی، کمرے سے نکل گئی تھی اور وہ مرتے کہا نہ کرتے کے مصداق اسے کتابیں کھولنے کا کہنے لگے تھے، وہ جانتے تو اسے منع کر سکتے تھے مگر یہ انہیں مناسب نہیں لگا تھا، وہ اپنے بچوں کی شخصیت سازی کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بے حد خیال رکھتے تھے، گھر میں چونکہ سندھی زبان شاوژ نادر ہی بولی جاتی تھی اس لئے عائشہ بھی اس زبان کی ادائیگی میں ایکدم پر فیکٹ نہیں تھیں، جبکہ وہ اس زبان کے اسرار و رموز سے اچھے سے واقف تھے، کیونکہ حویلی سے باہر وہ یہی زبان استعمال کرتے تھے، وہ اسے چھوٹی چھوٹی باتیں سمجھانے، دھیرے دھیرے اسے یاد کروا رہے تھے، ایک ٹوان کا انداز اچھا تھا، زبان نے ان کی امید سے زیادہ جلدی یاد کر لیا تھا، مگر اتنے سے عرصے میں بھی ان کے دماغ کی چولیس تک بل گئی تھیں۔

”کھانا لگ گیا ہے، آپ دونوں.....“ وہ کمرے میں آ کر بولنے لگی تھی۔

”تھیک ہے بیٹا! آپ جاؤ۔“ وہ اسے نظر انداز کر گئے تھے۔

”تھینک یو بابا سائیں!“ وہ خوشی خوشی ان کے گال پر پیار کرتا اٹھا تھا۔

”آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟“ وہ انہیں پھر سے لیٹے دیکھ کر ان کے قریب چلی آئی تھی۔

”نہیں ہمیں بھوک نہیں ہے، آپ جائیں۔“ سب انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ قدرے برہمی سے کہتے اس کے ٹوہا تھ پاؤں ہی پھیلا گئے تھے۔

”آپ ناراض ہو گئے ہیں۔“

”شمس! اس سے پہلے کہ آپ کو کوئی بلانے آئے، آپ اس سے پہلے ہی چلی جائیں۔“

”آپ بازو سے اس کا ہاتھ ہٹا کر انہوں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”آپ چل کر کھانا.....“

”پلیز شمس، ڈسٹرٹ مت کریں، ہمارے کمرے میں پہلے یہ شدید درد ہو رہی ہے۔“ انہوں نے کر دٹ بدل لی تھی۔

”آئی ایم سوری، ہم نے تو بس مذاق کیا تھا۔“ اس کا لہجہ بھگنے لگا تھا اور ان کے جواب دینے سے بل دروازہ پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی اور وہ آنسو رگڑتی چار روٹا چار اٹھ لگی تھی، باہر سیکنہ بھی اور وہ اس کو جانے کا کہتی دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے ہی چل پڑی تھی۔

”ماہن شاہ نہیں آئے، کھانا نہیں کھائیں گے؟“

”بابا سائیں! ان کے سر میں درد ہے، ٹھہر کر کھائیں گے۔“ وہ دسترخوان پر بیٹھ گئی تھی اور سب کی خاطر چند لقمے زہر مار کیے تھے، قبوہ مانے اٹھی تھی کہ رفیعہ نے اسے منع کر دیا تھا۔

”قبوہ، عائشہ بنا لیں گی، آپ کھانا لے کر

اپنے کمرے میں چلی جائیں، ماہن شاہ بھی کھا لیں گے اور آپ بھی۔“ رفیعہ کے کہنے پر وہ کھانا لئے کمرے میں آ گئی تھی۔

”معاذ اللہ! کو بھی ہماری طرح سندھی بری لگتی ہوگی۔“ اس نے فوراً ہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے بیٹا اور آپ پریشان نہ ہو، آپ کے بابا سائیں کو بہت اچھی سندھی آتی ہے، یہ آپ کی ساری تیاری کروادیں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جوابی حملہ کیا تھا اور سکون سے چوٹی کے بل پورے کیے تھے۔

”بابا سائیں! آپ ہمیں یاد کروا دیں گے!“

”ہاں بیٹا آپ جا کر اپنی کتابیں لے آؤ اور بابا سائیں آپ کی اتنی اچھی تیاری کروائیں گے کہ آپ کے عالیان سے بھی اچھے مارکس آئیں گے۔“ وہ اسے جوش دلانے کو بولی تھی اور وہ چھلانگ مار کر مسہری سے اتر اٹھا اور ماہن شاہ کے کچھ بھی سمجھنے سے پہلے ان کے روم سے رنو چکر ہو گیا تھا اور وہ ان کو دیکھ کر ہنسنے لگی تھی۔

اپنے کمرے میں چلی جائیں، ماہن شاہ بھی کھا لیں گے اور آپ بھی۔“ رفیعہ کے کہنے پر وہ کھانا لئے کمرے میں آ گئی تھی مگر وہ سوچے تھے اس لئے پشیمان سی لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

”معاذ اللہ! تم بھی اپنے لئے کپڑے پسند کر لو۔“ زینت نے خاموش بیٹھی معصومہ کو متوجہ کرتا چاہا تھا، سانول شاہ نے تو شادی سے انکار کر دیا تھا اس لئے سونیا اور زینت کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔

رجب کی اٹھارہ تاریخ کو دونوں کی رخصتی تھی، معصومہ، زینت کی آواز پر اپنے خیال سے چوکی تھی اور اپنے لئے کپڑے پسند کرنے لگی تھی وہ آج کل کافی زور رنج ہو رہی تھی کیونکہ طے تو یہی تھا کہ سانول شاہ کے آتے ہی شادی ہوگی اور حویلی میں شادی کے ہنگامے جاگے تھے مگر اس کی نہیں اس کا دل اندر ہی اندر ڈوبا جا رہا تھا، وہ بچپن سے ہی سانول سے محبت کرتی تھی، وہ حسین تھی اس کی بچپن کی منگ تھی لیکن اس نے کبھی اسے توجہ بھری نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا، کوئی خوشبو جیسی بات اس کے کانوں میں نہیں کہی تھی، نہ کوئی تحفہ نہ کوئی پیغام، پھر شادی میں ٹال مٹول سے کام لینا، اس کا معصوم دل وسوسوں کا شکار نہ ہوتا تو کیا کرتا، مگر وہ یہ سب کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی، زینت اس کی خاموشی اور بے دلی محسوس کر رہی تھی اور ایسی لئے اس نے معصومہ کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔

”میں جانتی ہوں تم ادا سانول کو لے کر پریشان ہو۔“ اس کے صاف کہنے پر وہ اسے دیکھنے لگی تھی، اس کی آنکھیں بننے لگی تھیں۔

”اڈی مجھے لگتا ہے وہ مجھے بالکل پسند نہیں کرتے، وہ شاید کسی اور کو.....“

”ایسا کچھ نہیں ہے معصومہ!“

”ایسی ہی بات ہے اڈی! میں ان کی منگ

لے کر آئی ہوں۔“

”میں جانتی ہوں تم ادا سانول کو لے کر پریشان ہو۔“ اس کے صاف کہنے پر وہ اسے دیکھنے لگی تھی، اس کی آنکھیں بننے لگی تھیں۔

”اڈی مجھے لگتا ہے وہ مجھے بالکل پسند نہیں کرتے، وہ شاید کسی اور کو.....“

”ایسا کچھ نہیں ہے معصومہ!“

”ایسی ہی بات ہے اڈی! میں ان کی منگ

لے کر آئی ہوں۔“

”میں جانتی ہوں تم ادا سانول کو لے کر پریشان ہو۔“ اس کے صاف کہنے پر وہ اسے دیکھنے لگی تھی، اس کی آنکھیں بننے لگی تھیں۔

”اڈی مجھے لگتا ہے وہ مجھے بالکل پسند نہیں کرتے، وہ شاید کسی اور کو.....“



## گلاب رتوں کی ٹوید لائے

مشرہ ناز

حقیقتاً آگ کی طرح سلگا دیتا تھا۔

☆☆☆

میرے پیار کی عمر ہو تم پہ ختم  
میرے پیار کی ہو عمر اتنی صنم  
وہ حسب معمول موبائل پہ ایف ایم آن  
کر کے کپڑے استری کر رہی تھی اور ساتھ ہی گنگنا  
رہی تھی۔

”دیری گڈ خیالات تو بہت اچھے ہیں آپ  
کے مگر افسوس آپ کے یہ خیالات اگر نانی جان  
تک پہنچ گئے تو پھر آپ کی عمر نہ ختم ہو جائے۔“  
علی نے جب کمرے میں داخل ہو کر اسے  
گنگنائے دیکھا تو چیخڑے بغیر نہ رہ سکا۔

”ہاں ہاں تم تو چاہتے ہی ہو، میرا پتا صاف  
ہو تو تم اس ریاست پر قبضہ جماؤ۔“ ماہ نور تب کر  
کمر پہ ہاتھ رکھ کر اسے گھورتے ہوئے لٹاڑا تھا وہ  
غصے میں ہمیشہ کی طرح اپنے کام کو بھول گئی نیتجنا  
دادی جان کا نیا دوپٹہ استری کی زینت بن چکا  
تھا، مگر وہ ماہ نور ہی کیا جو علی کو ایک کے دس جواب  
نہ دے اس وقت بھی وہ خاموش نہ رہ سکی تھی اور

اسے بے بہا ستانے میں مصروف تھی اور علی کی  
نظریں استری سے چپکے دوپٹے پر جھبی اس کے  
خاموش رہنے کے ساتھ بے وجہ مسکرانے اور  
کمرے میں پھیلنے والی بو پر ماہ نور نے اس کی  
نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو دادی جان کا نیا  
نکور دوپٹہ جل کر راکھ بن چکا تھا، صدمے سے  
اس کی آواز گنگ ہو گئی اور اس کی حالت پر علی کا  
قہقہہ بلند ہو گیا سونے پہ سہاگہ اس وقت ہوا  
جب دادی بھی علی کے قہقہے اور ان دونوں کے

آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے  
تو بات بن جائے ہاں ہاں بات بن جائے  
نازیہ حسن کی خوبصورت آواز پورے کچن  
میں گونج رہی تھی ساتھ ہی ماہ نور اس کے خیالات  
و آواز سے ہنوا بنی ساتھ ساتھ گنگنا رہی تھی سنک  
کے ٹل سے زور و شور سے بہتا پانی اپنی بے قدری  
پے نالاں اس کو گنگنائے ہوئے دیکھ رہا تھا جبکہ  
ماہ نور بچے پانی سے بے پروا ہاتھ میں کھینچیں  
ریک میں لگا رہی تھی۔

”اری اوتان سین کی اولاد برتن دھو لیے تو  
پانی بند کر دے۔“ کچن میں بچے تخت پہ بیٹھی دادی  
جو بہت دیر سے اس کی حرکتیں ملاحظہ کر رہی تھیں  
بالآخر پھٹ پڑیں ماہ نور نے ایک لمحہ کو رک کر  
دادی کو چنگھاڑتی آواز اور ہزار والٹ کی طرح  
چپکتے چہرے کو دیکھا تو ایک ہاتھ سے ٹل بند کر کے  
”دوسرے ہاتھ سے موبائل آف کر دیا اور دوپٹے  
سے ہاتھ پونچھتی باہر آ گئی۔“

”جی دادی کیا کام تھا؟“  
”میرا شیوں والا شوق پورا ہو گیا ہو تو ذرا  
میرے سر میں تیل ڈال دے۔“ دادی جو ابھی  
تھوڑی دیر پہلے نہا کر آئی تھیں اور اب دھوپ  
سینک رہی تھی اس کی نرمی پر دوبارہ بھڑکتے اس  
کے گانوں کے شوق پر طنز کرتے ہوئے بولیں تو  
وہ سعادت مندی سے سر ہلائی حسب عادت  
گنگنائی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

آگ دے دے آگ لے لے  
آگ سے ہے زندگی آہاں  
اور نازیہ کے آگ نمبر نے اس پل دادی کو

تیرے ادا دلاور کی رگ رگ سے واقف ہوں ان  
کی ادھر ادھر منہ ماریوں کی بھی مجھے خبر ہے، مگر  
میں کچھ نہیں کر سکتی، کیونکہ میں صرف بیوی ہوں  
جس کے ساتھ وہ صرف اپنا وقت گزارتے ہیں،  
میں کوئی جواب طلبی نہیں کر سکتی، جس دن ایسا کیا  
وہ مجھے چوٹی سے پکڑ کر مجھے لات مار کر اسے  
کمرے سے نکال دیں گے، طلاق نہیں دیں گے  
کیونکہ وہ مجھے خوش رکھیں یا دھی مجھے رہنا ہر حال  
میں صرف انہی کے ساتھ ہے، یہاں کامرد عورت  
کو صرف ضرورت اور تسکین کا ذریعہ سمجھتا ہے، مگر  
وہی عورت جب مرد کے حواس پر سوار ہو جاتی ہے  
تو، تو چند پل خوشی کے عورت کو بھی نصیب ہو  
جاتے ہیں، تیرا مقدر یہاں کی عورتوں سے مختلف  
نہیں ہو گا، مگر تو بہت حسین ہے اور تیری یہ  
خوبصورتی اتنی اچھے کسی بھی مرد کے حواسوں پر  
سوار کر سکتی ہے۔“ زینت کے لفظ لفظ میں زہر کی  
سی آمیزش تھی، کیونکہ اس نے اپنے شوہر و ملاوڑ  
شاہ کے لئے شادی کے دس سالوں میں کیا کچھ  
نہیں کیا تھا اور وہ اسے صرف عزت تک نہیں  
دے سکا تھا، وہ اسے اپنے پیر کی جوتی سمجھتا تھا،  
تسکین کا وہ ساماں جو ہر برے رویے نفرت کو  
خاموشی سے سہتا جاتا ہے اور آنکھوں کو بھی  
تراوٹ پہنچاتا رہتا ہے جب چاہا استعمال کر لیا  
اور جب موڈ نہ ہوا تو کروٹ بدل کر سو گئے،  
سامان کیونکہ کیا ہی کیوں نہ ہو سامان ہی رہتا  
ہے، یہ مالک کی مرضی کہ اسے کب کہاں سجا کے  
رکھے اور کب اٹھا کر پھینک دے۔

(باقی اگلے ماہ)

☆☆☆

ہوں، کتنی دفعہ ہمارا سامنا ہوتا ہے، کبھی کچھ تو وہ  
کہہ سہی سکتے تھے، مگر ان کی آنکھوں میں میرے  
لئے سرد رویے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔“

”دیکھ مقصود! تو خوبصورت ہے اور اس  
خوبصورتی کے ذریعے تو ادا سانول کے دل پر  
راج کر سکتی ہے، بس انہیں اپنی خوبصورتی کا  
احساس دلا، تو مردوں کو نہیں جانتی، عورتوں کی  
اداول پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں، حویلی  
کے مردوں کو تو، تو جانتی ہی ہے، کتنی ہی عورتوں  
سے ان کے تعلقات ہیں اور اس لحاظ سے تو خوش  
قسمت ہے ادا سانول ایسے نہیں ہیں، اس لئے  
تھے انہوں نے کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا، نہ کر اس  
لئے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتے ہیں۔“

”اڈی! تو اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہے  
کہ ان کا کسی لڑکی سے چکر نہیں ہے، وہ بھی حویلی  
کے بانی مردوں جیسے ہی ہوں گے۔“

”یہ صرف میں نہیں حویلی کا ہر بندہ کہتا ہے،  
مگر میں تجھے اس لئے سمجھا رہی ہوں کہ ادا  
سانول بھٹکے نہیں ہیں مگر بھٹک سکتے ہیں، اس لئے  
تو پہلے ہی قابو کر لے۔“ زینت شادی شدہ عورت  
تھی وہ ان تجربوں سے گزر چکی تھی۔

”میں کیا کر سکتی ہوں اڈی! شادی تک کے  
لئے تو وہ راضی نہیں ہوتے، سچ اڈی مجھے تو ایسا  
ہی لگتا ہے کہ وہ کسی گوری میم کے چکر میں ہیں۔“  
وہ اس کی بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔

”دیکھ ایسا ہے نہیں اور ہے بھی تو بیوی تو  
تجھے ہی بننا ہے، گوری میم ہو یا کالی میم، وہ اس  
کے ساتھ محض وقت گزار سکتے ہیں، جیون ساھی  
تجھے ہی بننا ہے اور دیکھ میری مان تو فضول  
واہمات سے نکل کر ادا سانول کو اپنے قابو میں کر  
لے، بیوی میں اور محبوبہ میں زمین آسمان کا فرق  
ہوتا ہے، ان کی محبوبہ بن جائے گی تو وہ تجھ پر،  
تیری خاطر مریں گے اور بیوی بن جائے گی تو  
تجھے ان پر اپنا سب کچھ وارنا ہو گا، مجھے دیکھ لے



فرانز نکالے اور ایک پیالی میں ڈھیر سارا کچپ نکال کر اس میں چاٹ مصالحہ مکس کیا اور لاؤنج میں آگئی جہاں حسب معمول ساؤنڈ سسٹم پر ایک انگلش سونگ چل رہا تھا اس پل اسے کوئی دیکھ کر کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ لڑکی ہر رات کو کتنے ریزوں میں تقسیم ہوتی ہے اور صبح کا سورج اپنی روشنی سے کس طرح اس کے وجود کو جوڑ دیتا ہے، فل والیوم میں بجتے سونگ پر وہ پیر ہلائی ٹی وی پر ٹام اینڈ جیری کی حرکتوں پر ہلکھلا رہی تھی جیسی کمرے میں داخل ہوتا علی رک گیا، سرخ اور سیاہ مینیشن کا پرنٹڈ سوٹ پہنے کمر پر پھیلے غم بالوں کی آبشار پھیلائے ٹام اینڈ جیری کی حرکتوں پر ہلکھلائی وہ اسے اس ماہ نور سے بالکل الگ رہی تھی جس سے وہ لڑنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا اس پل وہ اتنی اچھی لگی کہ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا، نظروں کی تپش محسوس کر کے ماہ نور نے یکدم ٹی وی پر سے نظریں ہٹائیں تو علی کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی اس کے چھلکنے پر علی یکدم گڑبڑا گیا۔

”جہیں کھانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جب دیکھو کچھ نہ کچھ کھا رہی ہوتی ہو۔“ اپنی خفت مٹانے کے لئے وہ جلدی جلدی بولتا اس کے برابر والے صوفے پر بیٹھ گیا، ماہ نور نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے دوبارہ اپنی توجہ بی وی پر مرکوز کر دی۔

”میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی تم اتنی بڑی ہو چکی ہو مگر ٹام اینڈ جیری آج بھی بچوں کی طرح خوش ہو کے دیکھتی ہو۔“ دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی، اس نے اس کی خاموشی کو توڑنے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے فرینچ فرانز کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تو وہ حسب توقع بدک گئی۔

”کوئی ضرورت نہیں میرے فرینچ فرانز پر نظر رکھنے کی اور بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے اپنی شکل

بچاتے دیکھ کر ماہ نور کی آنکھیں بھر آئیں اور یہ دکھ اس سے زیادہ تھا جو اس کو دادی جان کی گالیوں کو سنوں اور پھٹروں سے ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ دو آنسو اس کے گالوں پر لڑھک آتے تھے۔

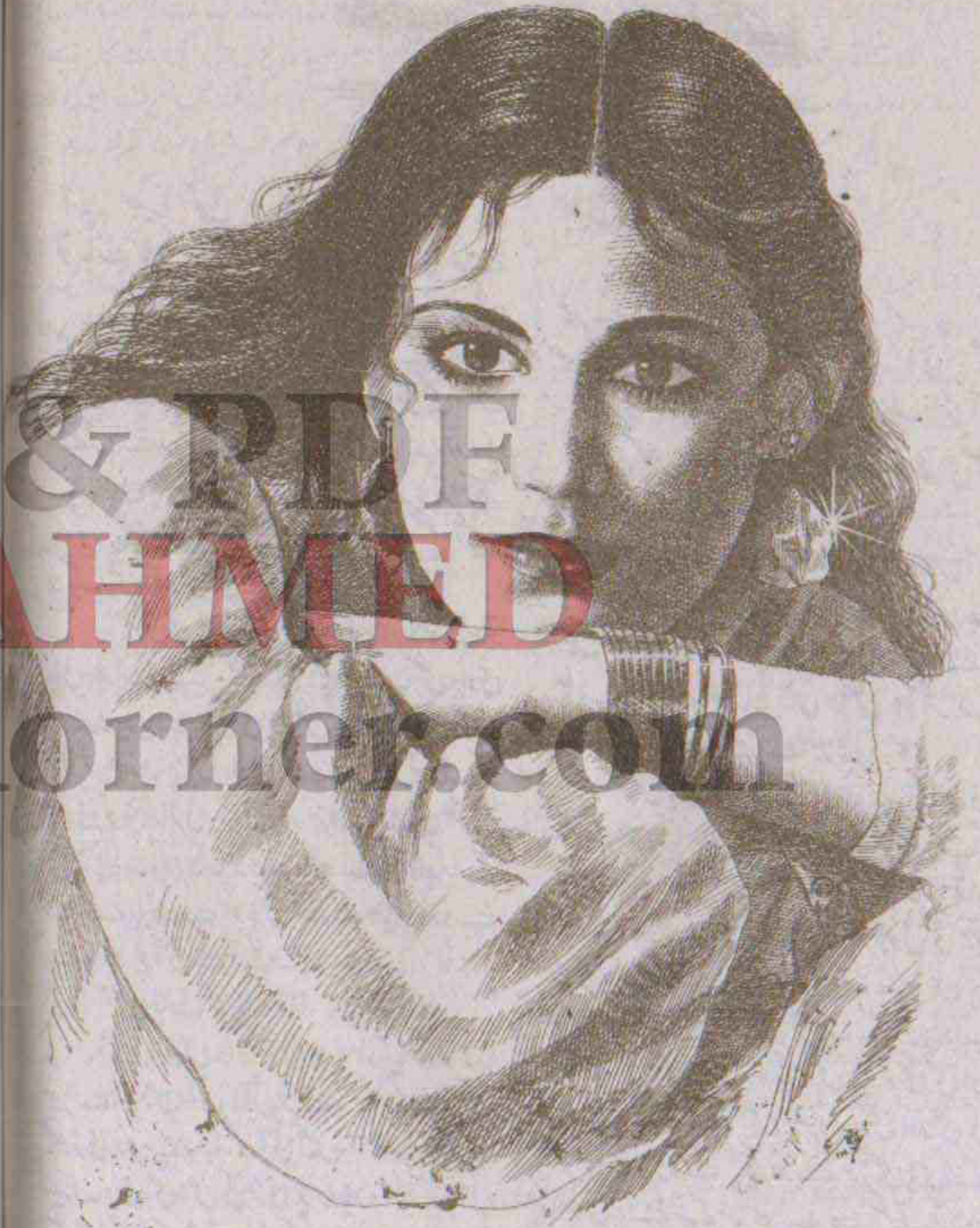
دیکھنے میں جو آنکھیں میلی لگتی ہیں تیز اچالے ان کے اندر ہوتے ہیں ان کے من میں کئی سمندر ہوتے ہیں روشنیوں کے دریا جن میں گرتے ہیں دیکھنے میں جو آنکھیں بھیگی بھیگی ہیں ان کی تہ میں کئی طوفان ہوتے ہیں ان کے پیچھے خشک بیابان ہوتے ہیں جن میں دن بھر رت کے بادل اڑتے ہیں ٹوٹے دل کی جڑیں جڑتے ہیں دیکھنے میں جو آنکھیں سہمی سہمی ہیں

ان کے اندر خواب اڑتے رہتے ہیں بھر بھر کے گہرے دریا بہتے ہیں جن کے کناروں پر خواہش بستی ہے یوں کب قسمت بنتی ہے

تاریک کمرے میں اس کی سسکیاں وقفے وقفے سے گونج رہی تھیں اس کی شفاف آنکھوں سے دکھوں کا گدلا پانی بہہ رہا تھا اس پل اسے اپنے اندر طوفان اٹھتے محسوس ہو رہے تھے دادی جان کی بددعائیں اور کوسنے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے اس پل اپنی ماں باپ کی یاد اتنی شدت سے آرہی تھی گویا کسی خشک صحرا میں بارش کی جھری لگ گئی ہو تکیے میں منہ چھپائے وہ اپنے اندر اڑتے طوفانوں کو چیخوں میں بدلنے کے لئے بے حال ہو رہی تھی اور قطرہ قطرہ ہلاتی رہی وہ رات اس لڑکی کی قسمت پر موم کی طرح پھلتی اس کے آنسوؤں سے اس کی قسمت لکھ رہی تھی۔

☆☆☆

پورے کچن میں آلوؤں کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی، ماہ نور نے کڑاہی میں سے فرینچ



لڑنے جھگڑنے کی آواز پر اندر آئیں تو اپنے بچے دوپٹے کی حالت دیکھ کر انہوں نے سر پٹ لیا۔ ”اوہ کجنت جلا دیا میرا دوپٹہ ٹھنڈ پڑ گئی کلیجے میں تیرے ہر وقت میرا شن بنی رہتی ہے نہ منہ سے خیر کا کلمہ لکھتا ہے نہ اللہ کا کلام بس ہر وقت کر



گم کر لو ایسا نہ ہو اس پلیٹ سے میں تمہارا سر توڑ دوں۔“

”شکر ہے کفر تو خدا خدا کر کے دیے یار تم اگر میرا سر توڑ دو گی تو ظاہر ہے جیل جانا پڑے گا کیونکہ ظاہر ہے سر ٹوٹنے کی صورت میں، میں زندہ تو رہوں گا نہیں۔“

”یہ گھر بھی کسی جیل خانے سے کم نہیں۔“ صوفی نے اسے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتے ہوئے ایسے ہی سے کہا تو علی اس کے لہجے میں چھپی گئی یہ چونک گیا۔

”کیا مطلب؟“

”سیدھا سادا مطلب ہے میرا مگر خیر تم جیسے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتا جن کے لئے زندگی صرف آسانیاں و خوشیاں اور محبتیں وصول کرنے کے لئے بنی ہو۔“

”کیوں کیا یہ سب تمہیں حاصل نہیں جواتی تلخ ہو رہی ہو۔“

”مجھے کیا حاصل ہے اور کیا نہیں یہ تمہارا درد مر نہیں۔“ ماہ نور نے علی کے لہجے میں چھپی سنجیدگی کو محسوس کر کے بات کا رخ موڑنا چاہا مگر اس کی بات پلٹنے کے انداز کو فوراً سمجھ گیا۔

”میں اور تم الگ تو نہیں تو پھر آج تم اتنی اجنبی کیوں بن رہی ہو یا پھر میں یہ سمجھوں کہ میں ہمیشہ سے تمہارے لئے اجنبی تھا۔“ علی نے دکھ و صدمے کی کیفیت میں گھرتے ہوئے کہا۔

”اجنبی ہو نہیں اجنبی بن جاتے ہو میری ہر غلطی، ہر کوتاہی پر کل بھی تم نے یہی کیا تھا میرے ساتھ تم جانتے تو مجھے دادی جان کے غصے سے بچا سکتے تھے مگر علی رضاتم نے ایسی کوشش کی ہی نہیں اس لئے کہ تمہاری نظر میں میری حیثیت صرف انجوائے منٹ تک ہے، دادی جان کے لئے میری ذات صرف خدمت گزاری کے لئے ہے جبکہ پھپھو کے دل میں صرف بیٹی کی نقشی کو مٹانے

کے لئے کبھی کبھار محبت جاگتی ہے، کیا میری کوئی حیثیت کوئی خواہش کوئی زندگی نہیں، نہ میں اپنی مرضی سے کہیں جاسکتی ہوں، نہ کھا سکتی ہوں، نہ مل سکتی ہوں، نہ پہن سکتی ہوں، نہ جی سکتی ہوں تو پھر میں کیوں زندہ ہوں علی کیوں۔“ اس نے روتے ہوئے ہسٹریک انداز میں ٹیبل کے شیشہ پر ہاتھ دے مارا، ایک لاوا تھا جو پھٹ گیا تھا اور علی رضا اس کی پیش و شدت پر حیران تھا، شیشہ ایک چھٹا کے سے ٹوٹ گیا تھا اور کرچیاں زمین پر گرنے کے ساتھ اس کے ہاتھوں میں چھب گئی تھیں ماہ نور شیشہ ٹوٹنے کی آواز پر وہ یکدم پلٹا۔

”یہ کیا بے وقوفی ہے ماہ نور۔“ اس نے ماہ نور کا خون سے بھرا ہوا ہاتھ تھاما تو ہاتھ سے نکلنے خون اور اس کی فکر مندی پر اس نے ایک پل اسے دیکھا اور دوسرے ہی پل ہسٹریائی انداز میں بننے لگی۔

”ماہ نور کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ اس کے ہسٹریک ہونے پر علی نے چلا کر اسے جھنجھوڑا مگر وہ اپنے ہوش و ہواس سے بیگانہ دیوانوں کی طرح ہنستے ہنستے یکدم رونے لگی، علی نے اس کی بدلتی کیفیت دیکھی تو اس کے ہاتھ کو چھوڑ کر بھاگتا ہوا صحن میں آ کے آوازیں دینے لگا۔

”ماما، بابا جان، ثانی آپ لوگ پلیز نیچے آئیں۔“ اس کے چیخنے پر ٹیرس پہ بیٹھے احمد رضا اور کرن رضا تیزی سے نیچے کی طرف لپکے تھے، جبکہ بیگم اختر حسن (دادی جان)۔

”کیا ہو گیا الہی خیر کنجٹ اب کیا کر بیٹھی۔“ کہتی ہوئی ہوتی گھبراتی اٹھنے لگی اس پل نیچے کی طرف لپکتے احمد رضا نے ان کے لہجے میں ماہ نور کے لئے فکر مندی و محبت کے بجائے نفرت و بیزاری کو ٹھٹھک کر دیکھا تھا پھر دوسرے ہی پل وہ سر جھٹکتے سیڑھیاں اترتے چلے گئے، علی ان دونوں کو آواز دے کر واپس پلٹ کر ماہ نور کی طرف آیا

تو وہ کٹی ہوئی، شاخ کی طرح بے ہوش پڑی تھی جبکہ کلائی سے نکلتا خون تیزی سے قالین میں جذب ہو رہا تھا، کرن رضا اور احمد رضا بھی اندر آ چکے تھے۔

”ارے یہ کیا ہوا؟“ کرن گھبرا کر تیزی سے اس کی طرف بڑھیں جبکہ احمد رضا اسے اٹھا کر باہر لانے کی ہدایت کرتے تیزی سے پورچ کی طرف بڑھ گئے، ہاسپٹل پہنچتے ہی اسے فوری ٹریٹمنٹ کے ساتھ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے فوری طور پر آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا تھا، اس کی کلائی میں جیسے کالچ کو فوری ٹریٹمنٹ سے نکال لیا گیا تھا اس کی کلائی پہ پانچ ٹانگے لگے تھے جبکہ خون کا فوری انتظام کرنے کی ہدایت بھی کی گئی تھی کیونکہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کی نبض ست پڑنے لگی تھی جبکہ دل کی دھڑکن کی رفتار بھی انتہائی سست ہو چکی تھی، احمد رضا کی

ہدایت پر ہی ان کا اور علی کا بلڈ گروپ چیک کیا جا رہا تھا، علی کا بلڈ گروپ یکساں ہونے کے باعث ڈاکٹر ز اسے لے کر اندر کی طرف بڑھ گئے، علی کے جسم سے خون اب ماہ نور کے جسم میں منتقل ہو رہا تھا اور خون کی رفتار بہتر ہونے پر اس کے دل کی دھڑکن معمول پر آنے لگی تھی، جب وہ خون دے کر باہر آیا تو کمزوری سے لڑکھڑاہٹ جبکہ آنکھوں میں اس دشمن جان کی حالت پر نمی تھی اس کے باہر آتے ہی احمد رضا نے آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا، وہ بیٹے کی دلی کیفیت سے واقف تھے اور اس پل باپ کے بازوؤں کا سہارا پانے کے ساتھ شیشے کے پارلیٹی ماہ نور کو دیکھ کر وہ باپ سے لپٹ کر رو دیا، احمد رضا نے اسے رونے دیا کیونکہ وہ جانتے تھے وہ ضبط کرتے کرتے تھک چکا ہے اور ضبط کا یہ بندھن آنسوؤں کی شکل میں اب بھی نہ ٹوٹا تو شاید علی رضا کو توڑ دیتا۔

☆☆☆

رات کے بارہ بج رہے تھے پورے ہاسپٹل پہ سکوت طاری تھا اور اس سکوت کو ڈاکٹروں اور نرسوں کے قدموں کی چاپ یا پھر دور کسی کمرے میں شیر خوار بچے کی رونے کی آواز توڑ رہی تھی، اس کے ٹانگے لگنے اور خون کی مقدار پوری کرنے کے بعد احمد رضا کی ہدایت پر ڈاکٹر نے اسے ایک رات انڈر آبزرویشن رکھا تھا اور علی اس وقت ساکت سا بیٹھا ماہ نور کو دیکھ رہا تھا جو ہوش و ہواس سے بیگانہ آنکھیں بند کیے پڑی تھی پہلے زخم اور خون زیادہ بہہ جانے کے وجہ سے اور پھر بعد میں سکون آور ادویات کے باعث، گھر میں بیگم اختر حسن کے اکیلا ہو جانے کی وجہ سے اس نے ماں باپ کو راضی کر کے اور ماہ نور کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھاتے ہوئے گھر بھیج دیا تھا، صبح کے قریب اس کی آواز سنائی دی۔

”پانی۔“ وہ جو ساکت بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا اس کے پانی مانگنے پر بے اختیار اس کے قریب آ گیا اور چمچ سے پانی اس نے قطرہ قطرہ کر کے اس کے منہ میں ڈالنے لگا، پانی پینے کے بعد اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

”اب کیسا ٹیل کر رہی ہو نور۔“ اس نے محبت سے اسے پکارا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اس نے آنکھیں کھول کر اسے جواب دیتے ہوئے ایک لمبا سانس بھرا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا نور۔“ بالآخر وہ سوال علی کے لبوں پر آ گیا جس نے اس کے دماغ میں ہچکل مچا رکھی تھی۔

”کیا؟“ اس نے نا سمجھی سے پوچھا۔

”کیا اب یہ بھی بتانا پڑے گا۔“ اس کے انجان بننے پر علی نے دکھ سے پوچھا تو ماہ نور نے کچھ کہنے کے لئے ابھی لبوں کی جھنجھکی دی تھی۔



”پلیز نور کوئی ایسا بہانہ مت بنانا یہی ایسا کوئی جھوٹ بولنا جو میرے لئے قابل قبول نہ ہو۔“ علی نے جتنی انداز میں ہاتھ اٹھا کے کہا تو وہ نظریں چراگئی کیونکہ اب اس کے لئے کوئی راہ فرار نہ تھی اس نے تھک کر سینے پہ رکھا زخمی ہاتھ بستر پر رکھتے ہوئے کہا۔

میں تھک گئی ہوں  
اس زندگی سے شاید اکتا گئی ہوں  
نہیں ہے اتنا حوصلہ کہ سہہ سکوں  
ان موسموں کی شدت  
اب برداشت نہیں کر سکتی

راتوں کو جاگ کر تارے گننا اب بہت دشوار لگتا ہے  
ہر صبح ایک امید اور ایک ان دیکھے احساس کے ساتھ طلوع ہوتی ہے

اور ہر اک شام اپنے دامن میں ایک انجانا دکھ اور اداسی

سمیٹے رخصت ہو جاتی ہے  
یہ پرانے منظر دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں پتھر کی ہو گئی ہیں

اور میرے پاؤں ان کٹھن راستوں پر چلتے چلتے  
شل ہو گئے ہیں

زندگی کے اس صحرا میں، میں بہت دور تک چلے جانا چاہتی ہوں

اپنے گرجی گرجی وجود کو سمیٹ کر مسکراہٹ کا لبادہ اوڑھنا

روز جینا چاہتی ہوں یا مرنا چاہتی ہوں  
بس روح کی تسکین چاہتی ہوں

زیر لب نظم بڑھتے ہوئے اس کے آنسو تہج کے دانوں کی طرح گر رہے تھے۔

”میں مرنا چاہتی ہوں کیونکہ اب وہ سکون مجھے موت ہی دے سکتی ہے جس کی مجھے تلاش ہے میں اس زندگی سے اکتا گئی ہوں نہیں سہی جانی

مجھ سے بے اعتباری اور قیدیوں کی سی زندگی۔“ بولتے بولتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور اس کے رونے پر علی نے دکھ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نور کیوں سوچ رہی ہو ایسا، کسی نے کچھ کہا ہے۔“  
”ہاں۔“ اور اس کی ہاں نے علی کو ہلادیا۔  
”کون ہے وہ نور جس کی وجہ سے آج تم مجھ کو بھی اعتبار اور بے اعتباری کے ترازو میں تول رہی ہو۔“  
”دادی جان!“

”کیا؟“ علی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”ہاں علی میں سچ کہہ رہی ہوں میں جو دادی جان کی ڈانٹ بھٹکار اور مار پیٹ کا شکار ہوئی ہوں، اس کے پیچھے میری ماں کی نفرت اور وہ اعتبار ہے جو بچپن سے آج تک انہیں مجھ پر نہیں ہے، مجھے دکھ ان کی مار پیٹ اور ڈانٹ بھٹکار پر نہیں ان کی بے اعتباری پر ہے اور اس سب کے پیچھے چھپی ہے میرے ماں باپ کی زندگی، انہوں نے میرے باپ کی محبت اور ماں سے کی جانے والی نفرت کے پیچھے مجھے قبول تو کر لیا مگر ان کو مجھ پر ذرہ بھر بھی اعتبار نہیں اور یہ بے اعتباری تو اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب تم مجھ سے انس کر بات کرتے ہو اور میں تمہارے چھیڑنے پر تم سے لڑ پڑتی ہوں دادی جان کہتی ہیں کہ انہیں تم پر اعتبار ہے کیونکہ تم ان کی بیٹی کی اولاد ہو مگر انہیں مجھ پر اعتبار نہیں کیونکہ میں اس عورت کی بیٹی ہوں جس سے میرے باپ نے محبت کرنے کا جرم کیا تھا اور بقول دادی جان کے محبت کے اس جرم میں سراسر ہاتھ میری ماں کا ہے، اس لئے کل جب دادی جان پچھو کے پاس گئی تھیں میں اس وقت اکیلی تھی اور تم نیچے آ گئے تو بس خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اب نہ جانے دارنی کیا کیا طعنے دیں گی

مجھے، مجھے تم پر خود سے بھی بڑھ کر ہے اعتبار ہے علی۔“ روتے ہوئے نہ جانے کس رو میں وہ اعتراف کر گئی تھی۔

”مگر دادی جان کی نظروں کی تاب سہنا اب میرے بس میں نہیں ہے اس لئے وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ وہ کہہ کر چپ ہو گئی اس کے خاموش ہونے کے بعد خاموشی کمرے میں سرسرا نے لگی تھی، اس نے علی کو دیکھا وہ ساکت غیر مرئی نقطے پر نظر جمائے بیٹھا تھا، علی نے اسے پکارا۔

”ہوں۔“ علی نے جواب دیا۔  
”تم کچھ تو کہو۔“

”کیا؟“  
”یہی کہ تمہیں ان سب باتوں پر یقین نہیں ہے ناں۔“

”مسو جاد نور تمہارے لئے زیادہ دیر جاگتا اور بولنا سچ نہیں ہے۔“ علی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اسے شانوں سے تھام کر دوبارہ لٹایا اور کیبل ڈال کر لائٹ آف کر دی گویا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

بیگم اختر حسن کی دو اولادیں تھیں ان کے شوہر اختر حسن وفات پا چکے تھے، قدرت نے ان کو بیٹے تیمور اور بیٹی کرن سے نوازا تھا، اختر حسن کی وفات کرن کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد ہی ہو گئی تھی، بیگم اختر حسن نے حالات کی تلخیوں اور زمانوں کے سرد و گرم کا بہت بہادری سے مقابلہ کیا تھا اور دونوں کو زہرِ تعلیم سے آراستہ کیا، یہی وجہ تھی کہ زمانے کی غمی ان کے لب و لہجہ میں گھل گئی تھی، تعلیم سے فارغ ہوتے ہی انہوں نے روایتی ماؤں کی طرح کرن کی شادی کر دی جبکہ کرن کی شادی کے سال بھر بعد انہوں نے تیمور

کی حسب خواہش اور کرن کے بے پناہ اصرار پر کرن کی دوست نبیلہ کو اپنی بہو بنالیا مگر بیٹے کی شادی کا وہ ارمان جو اپنی پسند سے کرنے کا تھا نبیلہ کو قبول کرنے کے بعد ان کے دل میں نفرت کی شکل اختیار کر گیا۔

کرن کو خدا نے اپنی نعمت علی کی شکل میں میں جبکہ تیمور کو ماہ نور کی شکل میں اپنی رحمت سے نوازا تھا مگر بد قسمتی سے تیمور اور نبیلہ خدا کی اس رحمت سے فیضیاب نہ ہو سکے اور ایک ایک سیڈنٹ میں دونوں کا انتقال ہو گیا، یوں ماہ نور ہمیشہ کے لئے بیگم اختر حسن کی ذمہ داری بن گئی حالانکہ کرن کی بہت خواہش تھی کہ وہ ماہ نور کی پرورش کرے مگر تیمور کی نشانی وہ اپنے پاس رکھنے پر بضد رہیں تو متفقہ فیصلہ سے کرن نے اوپر کے پورشن میں رہائش اختیار کر لی۔

ماہ نور کی پرورش کا ذمہ انہوں نے اپنے سر لے لیا اور اس کی شخصیت کو بے مثال بنانے کے چکر میں انہوں نے اسے سخی کر دیا وہ زندگی کے رنگوں اور خوشیوں سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگی اب یہ بیگم اختر حسن اپنی حاکمیت اور پرورش کے زعم میں اس معصوم کے ساتھ کر زہی تھیں یا نبیلہ سے انتقام لینے کی وجہ سے یہ اب تک کوئی نہیں سمجھ سکا تھا، کیونکہ ماہ نور ہو نبیلہ کی کاپی تھی یہی وجہ تھی کہ نبیلہ کے لئے دل میں پیدا ہو جانے والی وہ نفرت اور شک کی آڑ میں انہوں نے پہلے ماہ نور کی تعلیم میٹرک کے بعد ختم کروادی دوستوں سے میل ملاقات تو انہوں نے اسکول میں ہی کم کرواتے کرواتے ختم کروادیا، علی سے ہنسی مذاق بھی ان کو سخت ناپسند تھا اس لئے وہ وقتاً فوقتاً ٹوکتی رہتی تھیں یہ کہہ کر کہ علی ایک مرد ہے اور نامحرم بھی ہے جبکہ نامحرم کی لاجک ماہ نور کی سمجھ سے باہر تھی کیونکہ گھر میں آنے والے دادی کے بھانجے اور بھینچوں کے لئے چائے پانی تیار





کر کے ماہ نور ہی لے کر جاتی تھی، حتیٰ کہ انہوں نے اس کے اوپر زندگی کو تنگ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، یہ ماہ نور کا صبر تھا جو اسے ماں سے ورثہ میں ملا تھا اور جواب تک ہر بات میں آمنا صدقنا کہنے کی صورت میں اب تک قائم تھا اس کی اس فرمانبرداری علی اسے کئی بار ٹوک چکا تھا مگر وہ مسکرایا کہ رہ جاتی تھی، اس کی صرف ایک ہی تفریح تھی موبائل پر ایف ایم سننا ساؤنڈ سسٹم پہ گانے چلانا بیگم اختر حسن اس کی اس دلچسپی کو بھی ختم کر دینا چاہتی تھیں مگر ان کی اس کوشش کو علی نے ناکام بنا دیا تھا۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر چل رہا تھا علی کی سوچیں بیگم اختر حسن کے روپوں اور ماہ نور کے صبر و ضبط کے ساتھ اس کے رد عمل کے گرد گھوم رہی تھیں اسے پوری جزیات سے دو دن پہلے کا واقعہ یاد آ گیا تھا۔

”آسمان پر آندھی کے آثار تھے تھوڑی دیر میں رنگ بدلتے آسمان نے آندھی کی صورت اختیار کر لی تھی، زور دار آندھی کی وجہ سے پورا گھر دھول مٹی میں اٹ گیا تھا، دادی جان جو کچھ دیر پہلے ہی قبولہ کے لئے لیٹی تھیں، آندھی کی آواز اور گھڑکیوں کے شور سے ان کی آنکھ کھل گئی تھوڑی دیر میں جب آندھی ختم ہو گئی تو ماہ نور ان کی ہدایت کے پیش نظر صحن میں بالٹی بھر بھر کے پانی بہانے لگی، ماہ نور نے دوپٹہ کو کاندھے اور کمرے گرد لپٹا اور بڑے سے صحن میں واپر چلانے لگی پانچے وہ پہلے ہی فولد کر چکی تھیں، پورے صحن میں واپر چلانے کے بعد جب وہ صحن کے اختتامی حصے میں پہنچی تو دروازے سے علی داخل ہو رہا تھا۔

”ماسی ہمارا گھر بھی دھول مٹی سے اٹ رہا ہے وہ بھی ذرا صاف کر دینا۔“ ماہ نور کو چھیڑتا ہوا مٹی بھرے جوتوں سے اندر داخل ہوا۔

”علی!“ اس کے گندے جوتوں سے صحن میں نقش و نگار بنتے دیکھ کر ماہ نور چیخ پڑی اس کے اتنے قریب سے چلانے پر وہ بوکھلا گیا اور اسی بوکھلاہٹ میں اس کا پاؤں رپٹا تھا قریب تھا کہ وہ گر جاتا ماہ نور نے اسے ہاتھ سے سہارا دیا وہ اس کے ہاتھ کے سہارے سے ابھی سنبھلا ہی تھا کہ دادی جان کی غیض و غضب سے گونجتی آواز سنائی دی جو نجانے کب اپنے کمرے کے دروازے میں آکھڑی ہوئی تھیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”وہ دادی جان علی کا پاؤں.....“ اس کی زبان لڑکھڑائی علی نے بغور دیکھا اس کا چہرہ زرد ہونے لگا تھا جبکہ ٹانگوں کی لرزش بھی علی سے مخفی نہ رہ سکی تھی، علی کا پاؤں رپٹا تھا یا ہاتھ انہوں نے علی کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دیکھ کر طعنے کیا تو ماہ نور خفت سے پیچھے ہٹ گئی۔

”میرے گھر میں اپنے ماں والے پھن دکانے کی ضرورت نہیں اور تم کو میں نے صحن صاف کر کے چائے تیار کرنے کے لئے کہا تھا، مگر تم کو ہر وقت علی سے لڑنے جھگڑنے اور دل لگی کرنے سے فرصت ملے تو بوڑھی دادی کی بات یاد بھی رہے۔“ ان کے الفاظ پر ماہ نور کی آنکھوں میں زور و شور سے پانی جمع ہونے لگا اور علی کے سامنے اپنی پاک دامن ماں کی اس عزت افزائی پر ماہ نور کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے وہ واپر چلاتی تیزی سے وہاں سے نکلتی چلی گئی جبکہ علی ماہ نور کی کیفیت اور اپنی نانی کے زبان کے جوہر دیکھ کر جہاں کا تھاں رہ گیا۔

صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی ہنستے مسکراتے روشن سورج کی کرنوں نے کھڑکی سے جھانک کر خوش آمدید کہا تو وہ آنکھیں مسلتا اٹھ بیٹھا، ہسپتال کے کارڈور میں آوازیں گونجنے

لگیں کہیں زندگی سے بھرپور اور کسی جگہ امید کی کرن تلاش کرتی آوازیں اس نے صوفے سے اٹھ کر دیکھا ماہ نور بغور اسے دیکھ رہی تھی اس نے اس کی آنکھوں میں اپنے نام کے جلتے بجھتے دیئے کئی بار دیکھے تھے مگر اس پل آنکھوں میں چمکتی محبت کی لو کو خوف کے بادلوں میں تھر تھراتے دیکھا تو نہ جانے کیوں اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

”صبح بخیر علی رات کیسی گزری، میری وجہ سے پریشان رہے ناں تم، ساری رات آئی ایم سوری پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ وہ فکر مندی سے بولتی بیڈ سے اترنے لگی تو علی نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھوں پہ ہاتھ رکھ کے اسے اترنے سے روک دیا اور اس کی اس حرکت نے ماہ نور تیمور کو لرزادیا۔

”کہاں جا رہی ہو تم۔“ اس کی فکر مندی کو نظر انداز کر کے اس نے پوچھا۔

”منہ ہاتھ دھو کے فریش ہونے۔“ اس نے زخمی ہاتھ سے بے دھیانی میں ماتھے پہ آئے بالوں کو پیچھے کیا تو زخم میں اٹھنے والی تکلیف پر وہ لب بلیج کر رہ گئی تکلیف کی یہ شدت علی سے مخفی نہ رہ سکی تھی۔

”کوئی ضرورت نہیں تم بیٹھو میں نرس کو بلاتا ہوں وہ تمہارا منہ وغیرہ دھوا دے گی تمہارا ہاتھ پہ زور ڈالنا مناسب نہیں۔“

”مگر علی میں.....“ وہ اسے روکنا چاہ رہی تھی جسے علی نے ایک بار پھر ناکام بنا دیا۔

”مجھ تم سے محبت ہے نور، تمہاری فکر بھی ہے اور تمہاری ضرورت بھی مگر وہ ضرورت جس میں کوئی غرض نہ ہو بلکہ ایسی ضرورت جو زندگی کی شاہراہ میں ملنے والے غموں اور خوشیوں میں میرا سہارا بن سکے، بولو بنو گی ناں میرا سہارا کیونکہ رات تم نے خود اعتراف کیا تھا کہ تمہیں مجھ پر اعتبار ہے بولو بنو گی ناں میری۔“ وہ اسے

جھنجھوڑنے لگا اس پل ماہ نور کا جی چاہا وہ اسے ہاں کہہ دے مگر دوسرے ہی لمحے دادی کے الزامات کے خوف نے اسے اپنے شکنجے میں جکڑنا شروع کر دیا اور وہ کوئی جواب نہ دے سکی اس کی طرف سے جواب نہ یا کر علی اسے جھٹکے سے چھوڑ کر کمرے سے نکلتا چلا گیا اور ماہ نور اس اعتراف محبت پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

وہ سرشام جب گھر میں داخل ہوا تو اس کا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا جبکہ آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو چکی تھیں وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا بیڈ پہ جوتوں سمیت سینے کے بل لیٹ کر نجانے کون سا سکون اس کے اندر اترنے لگا تھا جس نے اندر بکتے لاوے کو آنکھوں کا رستہ دکھا دیا اس نے آنکھیں بند کر کے اس لاوے کو پہنچنے دیا وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا جسے پور پور بے اعتباری کی دلدل میں دھکیل دیا گیا تھا ایسی بے اعتباری جسے چاہ کر بھی وہ ختم نہیں کر پا رہا تھا، وہ اپنی نانی کے رویے اور رشتوں کی پیالٹ پر حیران تھا ان کے بیٹے نے جس لڑکی سے محبت کی شادی کی تھی وہ اس لڑکی کو معاف نہ کر سکیں اور نہ ہی اس کے لئے اپنے دل میں محبت جگا پائیں مگر کتنی عجیب بات تھی اس کے باپ نے بھی اس کی ماں سے محبت کی شادی کی تھی یہ اور بات کہ ان کی محبت شادی کے بعد سامنے آ گئی تھی جسے بیگم اختر حسن نے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اس کے باپ احمد رضا کو بھی کھلے دل سے قبول کر لیا وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اپنے بڑوں کے سامنے ماہ نور سے محبت کا اعتراف کیا تو یہ جرم بھی ماہ نور کے کھاتے میں لکھا جائے گا اس لئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر اسے اس کی محبت نہ مل سکی تو وہ اپنے وجود اور محبت سے بھی دوسروں کو محروم کر دے گا اس پل اس کے



ذہن میں ماہ نور کا ہسٹریائی انداز پوری شدت سے اجاگر ہوا جیسی کھلنے کی آواز پر وہ چونکا مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

”علی بیٹا تم کب آئے۔“ کرن نے حسب عادت اس کے پاس بیٹھتے ہوئے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”بیٹا کیا ماما سے ناراض ہو۔“ انہوں نے اس کے چہرے پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

”کیونکہ اتنا تو وہ بھی جان لیتی تھیں کہ وہ سو نہیں رہا اپنے چہرے پر جھکی شفقت بھری آواز کو اس نے پوری شدت سے محسوس کیا مگر آنکھیں نہیں کھولیں۔“

”ماما میں آپ سے یا بابا سے ناراض نہیں ہوں۔“ اس نے ان کے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے ان کی گود میں سر رکھ دیا مبادا آنکھوں کی جلن اور سرخی کے ساتھ ان میں ٹھہری نمی کرن کو نظر نہ آجائے۔

”تو ماما کی جان اتنی خاموشی سے آکر کیوں لیٹ گئے اور صبح سے کہاں غائب تھے۔“ انہوں نے فکر مندی سے پوچھا۔

”کہیں نہیں ماما، ماما آپ سے ایک بات کہنی تھی۔“

”بولو بیٹا!“ انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔

”ماما میں ماہ نور سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے رک رک کر کہتے ہوئے بغور کرن کے چہرے کو دیکھا۔

”بس اتنی سی بات کے لئے میرا بیٹا اتنا پریشان تھا۔“ کرن نے مسکرا کر کہا مگر ان کی ہنسی دھڑکنے کی شبیہ صاف محسوس ہو رہی تھیں۔

سکھ دیا، ہر خوشی دی، ہر خواہش پوری کی اور سب سے بڑی خوشی احمد کا ساتھ ہے کہیں پتا ہے علی یہ تیمور بھائی تھے جن کی وجہ سے میں آج اتنی خوش و خرم اور سن چاہی زندگی بسر کر رہی ہوں اگر تیمور بھائی نہ ہوتے تو شاید میں اتنی خوش و خرم نہ ہوتی مگر دکھ صرف اس بات کا ہے کہ قدرت نے میرے اس بھائی کی عمر بھی اتنی کم رکھی اور زندگی کی خوشیوں میں حصہ بھی، ماہ نور کے ساتھ اماں جی کا رویہ دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے میرے لاڈلے بھائی کی اولاد کے ساتھ انہوں نے کیا رویہ رکھا ہوا ہے اگر آج تیمور بھائی اپنی اولاد کے ساتھ یہ ناروا سلوک دیکھتے تو شاید ایک پل بھی نہ جی پاتے۔“ کرن علی کے کاندھے پر سر رکھ بھائی کی یاد میں رو دی تھیں اور علی مستحضر تھا کہ اس کی ماں جانتی ہے کہ نانی جان کا رویہ ماہ نور کے ساتھ کتنا خراب ہے پھر بھی کچھ نہیں ہوتی اس نے ان کے گرد بازو پھیلا کر انہیں تسلی دی۔

”ماما پلیز روئیں نہیں اگر آپ کو تیمور ماموں سے محبت ہے تو پلیز ماما ماہ نور کو اس گھر میں لے آئیں، ورنہ نانی جان کے شکوک اور الزامات سے وہ مر جائے گی، ماما وہ دھیرے دھیرے اندر سے مر رہی ہے اسے مرنے سے بچالیں ماما اسے بچالیں۔“ علی نے رقت آمیز لہجے میں کہتے ہوئے ان کی گود میں منہ چھپالیا اور اس پل بیٹے کے لہجے اور انداز میں چھپی محبت پر کرن بھیگی آنکھوں سے مسکرا دیں۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں چھائی خاموشی میں صرف ان چاروں کے سانسوں کی آوازیں تھیں، سزا خیز حسن بھی خاموش تھیں اور ان کی اس خاموشی کو توڑنے کے لئے کرن کو ایک بار پھر اپنا مدعا بیان کرنا پڑا۔

”اماں جان میں ماہ نور کو اپنے آنگن کا چاند

بنانا چاہتی ہوں وہ میرے اکلوتے بھائی کی اکلوتی نشانی ہے اور اس پر سب سے پہلا حق بھی میرا ہی ہے پلیز اماں جان ماہ نور کو مجھے دے دیں۔“ کہتے کہتے کرن کی آواز بھرا گئی، ماں کی آنکھوں کو جھپٹا دیکھ کر علی اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا، جبکہ کمرے کے باہر کھڑی ماہ نور ساکت تھی۔

”نہیں یہ ممکن نہیں اور نہ ہی یہ شادی ہو سکتی ہے۔“

”کیوں اماں جان بالآخر احمد رضا نے بھی زبان کھول لی صرف اس وجہ سے کہ آپ کی بناء اجازت علی نے ماہ نور سے محبت کی یا آپ کا بیٹا نبیلہ بھائی سے محبت کرنے کا تصور وار تھا۔“ احمد رضا نے وجہ دریافت کی تو وہ نظریں جھپٹا لیں۔

”آپ مجھے وجہ بتائیں اماں جان، کیونکہ مجھے اپنے بیٹے کی خوشی ہر حال میں عزیز ہے۔“ احمد رضا نے ان کے نظریں چرانے کو بغور دیکھا۔

”آپ کو محبت سے اپنی جڑ کیوں ہے یہ میں نہیں جانتا مگر اس بچی کا تصور تو بتا دیں جو بچپن سے آج تک آپ کی حاکمانہ طبیعت کا شکار رہی جس نے نہ ماں باپ کی شکل دیکھی اور نہ کسی اور رشتے کی اگر خدا نے اس کے لئے تمام رشتوں کو علی کی صورت میں جیون ساتھی کے رشتے میں سمونے کی سبیل پیدا کی ہے تو آپ اتنی مخالفت کیوں کر رہی ہیں، اگر تیمور کا نبیلہ بھائی سے اور علی کا ماہ نور سے محبت کرنا جرم ہے تو یہ جرم تو آپ کی بیٹی نے مجھ سے محبت کر کے بھی انجام دیا ہے۔“ احمد رضا بولنے پر آئے تو رکے نہیں اور اس پل داماد کے منہ سے اپنی ذات کے انکشافات اور اعترافات سننے ہوئے ان کی آنکھوں میں دھند اترنے لگی۔

”محبت ایک آسمان صحیفہ ہے اماں جان مگر معاف کیجئے گا آپ جیسے بزرگوں کی پست اور تاریک ذہنیت نے اس رشتے کو آلودہ کر دیا ہے

اور آج مجھے یہ کہنے میں بالکل عار نہیں کہ تیمور اور نبیلہ بھائی کی موت بھی آپ کی پست اور تاریک ذہنیت کے علاوہ آپ کی حاکمیت پسندی کی وجہ سے ہوئی ہے، آپ کو نجانے کیوں اپنی حاکمیت کا زوال آتا محسوس ہونے لگا تھا جبکہ نبیلہ بھائی تو صرف محبتوں میں حصہ دار بننے آئی تھیں جسے آپ کی حاکمیت پسندی نے گوارا نہ کیا اور آپ کی اس حاکمیت نے نہ صرف اس نازک لڑکی کو موت کے گھاٹ اتار دیا بلکہ آپ کے بیٹے کو بھی آپ سے چھین لیا، چلو علی اور کرن۔“ اپنی بات کہہ کر احمد رضا ان دونوں کو اٹھنے کی ہدایت کرتے کمرے سے نکلنے چلے گئے۔

☆☆☆

شکسپیر کہتا ہے، ”حاکمیت پسندی سے آپ قلعے تو فتح کر سکتے ہیں مگر دل نہیں اور اگر آپ دل فتح کر بھی لیں تو وہاں آپ کو سوائے خواہشوں کے اندھیروں اور خوابوں کی گرچیوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔“

کمرہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا سزا خیز حسن صبح سے کمرہ نشین تھیں رات بھی انہوں نے جاگتی آنکھوں سے گزاری تھی آج کا دن ان کے لئے احتساب کا دن تھا، انہوں نے اپنا احتساب کیا تو گوشوارہ زندگی میں ان کے لئے خسارے کے سوا کچھ نہ تھا اور آج جب عمر کے اس حصے میں زندگی کسی بھی پل انہیں الوداع کہہ سکتی تھی انہوں نے اپنا احتساب کرنا تھا اور اس بات کا شدت سے انہیں احساس ہوا تھا، لفظ محبت سے انہیں نفرت کیوں اور کیسے ہوئی شاییت اس وقت جب وہ صرف اٹھارہ سال کی تھیں اور ان کے لئے آنے والے شخص کا رشتہ ان سے دو گنی عمر کا تھا، ان کی بہن رچمانہ کی شادی ان ہی کے خالہ زاد بھائی عطاء الرحمن سے ہوئی جو تقریباً ان کے ہم عمر تھے اور ان دونوں کی جوڑی بہت شاندار تھی



انہوں نے بھی اپنے لئے عطاء الرحمن جیسے وجہ و خوبرو مرد کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے مگر قسمت نے ان کا جوڑ پینتیس سالہ اختر سے لکھا تھا قسمت کی ستم ظریفی جہاں وہ بیاہ کر گئیں وہاں ان سے بیس سالہ بڑی مٹی بیگم اور پانچ سالہ بڑی گلزار بی بی تھیں جو اختر حسن کی بہنیں تھیں، یہ دور ان کے لئے بہت ٹھن تھا دس سال انہوں نے اپنے سسرال کے ساتھ انتہائی صبر و ستم میں گزارے اور یہ جبر و ستم ہی تھا جنہوں نے ان کی اندر کی حاکم پسند عورت کو جگا دیا تھا اس دوران تیمور ان کی گود میں آچکا تھا، بالآخر قسمت نے پلٹا کھایا اور اختر حسن کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا، سسرال سے علیحدہ ہوتے ہی اندر چھپی حاکمیت زرد عورت عود آئی تھی انہوں نے اپنے شوہر اور بچوں کو اپنی رعایا سمجھنا شروع کر دیا اس کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی کہ ان کو اولاد بھی فرماں بردار ملی تھی، وہ نہیں جانتی تھیں کہ قسمت اپنی گود میں ان کے لئے کیا انکشافات اور پہاڑ جیسے دکھ سنبھال بیٹھی ہے، کراچی شفٹ ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد ان کے ہاں کرن کی پیدائش ہوئی، کرن کی پیدائش کے سال بھر بعد اختر حسن کا انتقال ہو گیا اسی دوران ان کی دیگر بہنوں کی بھی شادیاں ہو گئی تھیں ان کی باقی تین بہنوں کے شوہر بھی ان سے دو یا تین سال بڑے تھے یا پھر ان کے ہم عمر شاید یہی وجہ تھی کہ ماں باپ کے گھر سے جانے والے نامساعد حالات اور پھر جیون ساھی سے ہم آہنگی نہ ہونے کی بناء پر وہ ساری زندگی تنہا رہیں انہوں نے شادی کے بعد ہی اپنے اور اپنے گھر والوں کے درمیان ان دیکھا فاصلہ حائل کر لیا تھا اور یہ فاصلہ بڑھتے بڑھتے خلیج کی صورت اختیار کر گیا پھر جب تیمور نے اپنی پسند سے نازک اندام اور خوبصورت سے نبیلہ کو اپنا جیون ساھی منتخب کیا تو بیگم اختر حسن بیٹے کی پسند اور محبت کو دل سے

قبول نہ کر سکیں ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو خود محروم رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی خوشی سے محروم دیکھنا چاہتے ہیں جو ان کو نہیں ملی ہوئی انہوں نے خدا سے شکوے بھی کیے اور تقدیر کو بھی اپنی محرومیوں کے لئے مورد الزام ٹھہرایا اس کے باوجود انہوں نے دوسروں کو خوشیوں اور سکھ دینے کے بجائے محرومیاں دیں جس میں ان کی اولاد بھی شامل تھی اور آج اس تاریکی میں انہوں نے اعتراف کر لیا کہ وہ نفسیات کے اس عارضے کا شکار تھیں جس میں انسان اپنی حاکمیت غرور اور خود پسندی کے آگے ہمیشہ دوسروں کی مسکراہٹیں اور خوشیاں ختم کرنے کے درپے ہوتا ہے چاہے ان مسکراہٹوں اور خوشیوں کے ختم ہونے میں انسان کا قریبی رشتہ ہی کیوں نہ ختم ہو جائے اور اس بل یہ جان لیوا اعتراف کہ ان کی حاکمیت اور خود پسندی نے ان کی اولاد کو ختم کر دیا ان کے دل نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ریو الونگ چیئر پہ بیٹھی بیگم اختر حسن ساکت ہو گئیں ان کے ساکت ہونے پر ریو الونگ چیئر بے جان انداز میں جھولتی رہ گئی۔

☆☆☆

”پاپا اگر آپ اور ماما ماہ نور اور میرے لئے کچھ ہیں گر سکتے تو پھر مجھے بھی یہاں رہنا منظور نہیں کیونکہ جب میری محبت پر میرا حق نہیں ہو سکتا تو پھر مجھے آپ سب کی محبتیں بھی منظور نہیں ہیں ہمیشہ کے لئے لندن جا رہا ہوں حمزہ کے پاس۔“ علی نے کمرے میں ٹپکتے ہوئے سوچ میں گم احمد صاحب کو با آواز کر دیا تو احمد رضا کے ساتھ بیٹھی کرن بیٹے کے فیصلے پر تڑپ کر اٹھی تھیں۔

”یہ کیا کہہ رہے تم علی میں تم کو کسی ایسے فیصلے کی اجازت نہیں دوں گی۔“

”میں آپ سے اجازت نہیں لے رہا ماما اپنا فیصلہ بتا رہا ہوں کیونکہ یہ میرا

آخری فیصلہ ہے اور ماما قصور وار تو آپ بھی اتنی ہیں جتنی کہ نانی جان آپ پہ جان چھڑکنے والے اور ہر بل آپ کی خوشیوں کا احساس کرنے والے بھائی نے آپ کے لئے اتنا کچھ کیا اور آپ اس بھائی کی اولاد کی خوشیوں کے لئے اتنا نہیں کر سکتیں۔“ علی نے اپنے لفظوں سے ماں کو نرمندہ کیا تو کرن کی آنکھیں بھینکنے لگیں اور کرن کی آنکھیں بھینکتی دیکھ کر احمد رضا بولے تھے۔

”علی شاید تم بھول رہے ہو کہ اس وقت تم اس سے مخاطب ہو۔“

”پاپا میں.....“ اس کی بات ماہ نور کی آواز ادھوری رہ گئی، علی، پھوپھا جان، ماہ نور کی آواز یہاں کرن اور علی چومکے تھے وہیں احمد رضا بھی لڑکی سے لپکے تھے، علی بھاگتا ہوا نیچے کی طرف بھاگا تھا۔

”کیا ہوا ماہ نور!“ وہ دادی جان بیگم اختر سن کے کمرے کی طرف اشارہ کرتی ماہ نور ہانکتی ہوئی ان کے کمرے میں داخل ہوئی تھی اس کے پیچھے علی اور احمد رضا بھی آچکے تھے علی نے آگے بڑھ کر ان کی نبض چیک کی جو بالکل ڈوب رہی تھی۔

”علی تم اماں جان کو اٹھاؤ میں گاڑی نکالتا ہوں۔“ احمد رضا علی کو ہدایت کرتے باہر کی طرف تیزی سے نکلے علی ان کے پیچھے بیگم اختر حسن کو اٹھائے باہر کی طرف بھاگا تھا اور پھر قریبی ہسپتال پہنچے ہی انتہائی تیزی سے ان کو آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا تھا ڈاکٹرز کے مطابق کوئی ایسا صدمہ یا انکشاف تھا جسے ان کا دل برداشت نہ کر سکا اور اس انٹیک ہو گیا وہ تو غنیمت تھا کہ ماہ نور ان کے رات سے مستقل کمرے میں بند ہونے پر پریشان ہوئی ان کی اجازت کے بغیر کمرے میں داخل ہوئی اور ان کو اس حالت میں دیکھ کر اس نے شور مچا دیا، کرن اور ماہ نور کی آنکھوں سے

آنسو رواں تھے جبکہ لبوں پہ دعائیں تھیں کرن نے احمد رضا کو شکوہ بھری نظروں سے دیکھا تو احمد رضا نے آنکھیں چرا لیں، ان کے اعترافات ہی تھے جنہوں نے اس کی ماں کو اس حال میں پہنچا دیا تھا، تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی تسلی دینے کے لئے آگے بڑھے تھے۔

”پھوپھا جان دادی جان تو مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گی ناں ماما کے بعد بابا بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے اور اب دادو۔“ وہ ان کے کاندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رو دی تھی جبکہ احمد رضا کے پیچھے کھڑا علی اس کے لفظوں پر حیران تھا۔

کیا تھی وہ دھوپ چھاؤں سی لڑکی کبھی زندگی سے شکوہ کرتی، کبھی ناراضگی دکھاتی، کبھی موت کا رستہ دکھانے والے لوگوں کے دکھوں پر روتی اور کبھی انہی لوگوں کے پھڑ جانے کا خوف لئے بلک بلک کر روتی کتنے رنگ تھے اس کے۔

”پاپا!“ پیچھے کھڑے علی نے احمد رضا کا کاندھے پر ہاتھ رکھا تو علی کی آواز سن کر وہ پیچھے ہو گئی۔

”ایوری تھنگ از آل رائٹ پاپا ڈاکٹرز نے شام تک جانے کی اجازت دے دی ہے، ماما پلیز اس آل رائٹ نانی جان بالکل ٹھیک ہیں۔“ احمد رضا کو بتا کر وہ روتی ہوئی کرن کے شانوں پر بازو پھیلا کر انہیں تسلی دے رہا تھا، مگر نظریں اس کی ماہ نور پر تھیں جس کی کالی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں جبکہ چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اس کے منہ کی بانہہ کر دیکھنے پہ اس نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر نظریں چرا لیں، اس کی معصومانہ حرکت بڑے ساختہ علی کے چہرے پہ مسکراہٹ آ گئی۔

بیگم اختر حسن کو ڈیپ چارج ہوئے آج تیسرا دن تھا مگر وہ ہنوز خاموش تھیں ماہ نور نے ان سے کئی دفعہ بات کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا وہ ان کے آگے



کھانا رکھتی وہ خاموشی سے کھانا کھا لیتیں، وہ ہال سنوارنے کا کہتی وہ خاموشی سے آگے ہو کر بیٹھ جاتیں، وہ ان کو دوائیوں کا شیدول دیکھ کر دیتی بھی خاموشی سے کھا لیتی بھی منہ پھیر لیتیں، کرن اور احمد رضا حتیٰ کہ علی نے بھی ان سے بات کرنے کی اور ان کو بولنے پر اکسانے کی۔ سر توڑ کوشش کر لی مگر کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا اس دن بھی علی انہیں سب کاٹ کر دینے کے ساتھ بے تکی ہانک رہا تھا مقصد ان کو بولنے پر اکسانا تھا، ساتھ ہی کرن اور احمد رضا بھی بیٹھے تھے جبکہ ماہ نور ان کے پیروں پہ تیل کا مساج کر رہی تھی مگر ان کے لبوں پہ ایک سنگراہٹ بھی نہ آ سکی وہ بے تاثر انداز میں سب کو دیکھتی رہیں تو علی نے غصے سے چھری بیچ دی۔

”انف از انف نانی جان بہت ہو گیا، آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کی خاموشی ہمارے لئے کتنی تکلیف دے ہے، مگر آپ کو کسی سے کوئی سروکار نہیں اور خاص طور پر میری تو کوئی ضرورت نہیں تو پھر میں بھی جا رہا ہوں ہمیشہ کے لئے صحرہ کے پاس (اس نے اپنے چچا زاد کا نام لیا جو لندن میں مقیم تھا اور کئی بار اس کو وہاں آنے کی آفر بھی کر چکا تھا) جب چلا جاؤں گا ناں یہاں سے جب آپ کو اپنے نواسے کی قدر آئے گی۔“ علی انہیں جذباتی بلیک میل کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”ہاں ضرور جاؤ۔“ ان کے جواب پر سب حیران رہ گئے کہاں تو سب ان سے بات کر کے تھک گئے تھے مگر وہ کسی کی بات کا جواب نہیں دیتی تھیں اور اب جب انہوں نے علی کی بات کا جواب دیا تو وہ بھی ادھر اسب سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ان کے جواب کے پورا ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

”آپ نے کیا کھانا نانی جان!“ سب سے پہلے علی نے اس کے کو توڑا۔

”میں نے کہا ضرور جاؤ لندن مگر اکیلے نہیں ماہ نور کو اپنے ساتھ لے کر جاؤ۔“ انہوں نے پرسکون انداز میں اس کی بات کا جواب دیا اور اس کی حیرت کو نظر انداز کرتی اپنے کمرے میں آ گئیں جبکہ ماہ نور اور کرن ساکت سی علی اور احمد رضا کو دیکھ رہی تھیں جو ان ہی کی طرح بیگم اختر حسن کے جواب اور رضامندی پر ساکت تھے۔

☆☆☆

ایشن اور مہندی کی خوشبو پورے حسن والا میں رچی ہوئی تھی آج ماہ نور کی مایوں بھی بیگم اختر حسن کی ہدایت پہ شادی بے حد سادگی سے ہو رہی تھی مگر کرن نے پھر بھی اپنی خوشی اور اگلو تے بیٹے کے ارمان کو پورا کرنے کے لئے ماہ نور کو ایک دن کے لئے مایوں بٹھا دیا تھا، کرن اور احمد رضا کے جوٹن چار جانے والے اور قریبی عزیز تھے وہ بھی جا چکے تھے، اب پورے حسن والا میں صرف پانچ نفوس تھے کرن، علی اور احمد رضا اپنے پورٹن میں جا چکے تھے، جبکہ ماہ نور اپنے کمرے میں اور بیگم اختر حسن اپنے کمرے میں جا چکی تھیں، ماہ نور ماں باپ کی تصویر ہاتھ میں لئے بیڈ پہ بیٹھی تھی آنسو بیچ کے دانوں کی طرح ٹوٹ کر تصویر پر گر رہے تھے یکدم تصویر کے آگے دو بندھے ہاتھ آ گئے اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا سامنے بیگم اختر حسن ہاتھ باندھے کھڑی تھیں اور ان کے آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

”مجھے معاف کر دینا نور۔“ دادی جان ان کے آنسو بندھے ہاتھوں اور نور کہنے پر ماہ نور کے ہاتھ سے تصویر گر گئی، اس نے ان کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو کھولا اور ان پر چہرہ رکھ کر رودی۔

”رو نہیں نور تم تو میرے گھر کا اور میرے دل کا نور ہو جواب اس گھر سے چلا جائے گا تم خوش ہوناں علی کے ساتھ پی۔“ انہوں نے اس کے حیرت بھری نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے

پوچھا، وہ جانتی تھیں کہ وہ کیوں حیران ہے اس کی بیس سالہ زندگی میں انہوں نے بھی اس کو نور کہہ کر نہیں پکارا تھا اور آج یہ اعتراف کہ وہ ان کے گھر کے ساتھ ان کے دل کا نور ہے ماہ نور کے لئے ناقابل یقین تھا، اس نے فوراً چہرہ جھکا لیا۔

”خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔“ انہوں نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دعا دی۔

”ایک بات کہوں نور۔“ ان کے سنجیدگی کو غم میں بدلنے محسوس کر کے اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”میرا بیٹا مجھے معاف نہیں کرتا اس سے کہو مجھے معاف کر دے مجھے سکون دے دے ایک بار مجھ سے مل لے میں اسے اپنے پاس بلائی ہوں مگر وہ نہیں آتا۔“ وہ بچوں کی طرح روتی اس سے شکایت کر رہی تھیں، ماہ نور نے ان کے آنسو پونچھے تو وہ ہوش کی دنیا میں لوٹ آئیں انہوں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو خول میں بند کر دیا اور بے دردی سے آنسو پونچھتی باہر کی طرف بڑھ گئیں کرن تیزی سے ان کے پیچھے لگی۔

”دادی جان پلیز مجھے اپنے پاس رہنے دیں مجھے اپنے سے دور نہ کریں مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔“ وہ ٹپ ٹپ کر رودی۔

”دادی جان آپ مجھے اتنی دور کیوں بھیج رہی ہیں آپ کے پاس گون رہے گا آپ کا خیال کون رکھے گا؟“

”اللہ ہے ناں۔“ اس نے ایک بار پھر ان کو روتے ہوئے منانے کی کوشش کی۔

”دادی جان میں یہاں بھی تو رہ سکتی ہوں آپ کے پاس، پھپھو کے پاس۔“

”نہیں۔“ انہوں نے ایک دم غضبناک لہجے میں جواب دیا تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

اگلے دن وہ ایک بار پھر سر شام کرن کے ساتھ پارلر جانے سے پہلے بیگم اختر حسن کے پاس آئی تھی، کیونکہ بیگم اختر حسن کی ہدایت پر

رخصتی آج ہی ہونا طے پائی تھی، مگر بیگم اختر حسن خاموش تھیں اس کے ٹپ ٹپ کر رونے پر بھی ان کا دل نہیں پیجا تھا بالآخر ان کی خاموشی سے تھک ہار کر کرن اس کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے باہر لے آئیں ماں کے رویے پر وہ بھی حیران تھیں مگر اتنا ضرور جان گئی تھیں کہ ماں خود احتسابی کے عمل سے گزر رہی ہے ماں کے پہلے حاکمانہ رویے کے بعد خود احتسابی نے ان کی پٹلوں کو بھگو دیا تھا کیونکہ یہ سچ تھا کہ اب ان کے پچھتاوے ان کے بھائی کو واپس نہیں لا سکتے تھے۔

کمرے میں نیم تاریکی اور قبرستان کی سی خاموشی تھی یہ وہ کمرہ تھا جہاں بیگم اختر حسن کی جاہ و جلال سے بھرپور آوازیں گونجتی تھیں مگر آج اس خاموشی میں صرف ان کی سسکیاں کر لا رہی تھیں اور کرن و ماہ نور کے جانے کے بعد دو آنسو ٹوٹ کر ان کی کپڑی میں جذب ہو گئے، تنہائی اور خود احتسابی یہی میری زندگی کی سزا ہے اور ساری عمر کی فصل وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوئیں میں نے جو کچھ اپنی زندگی میں بویا وہ اب تنہائیوں اور وحشتوں کے ناگ کے صورت میں مجھے کاٹنا ہی ہوگا، میں نے اپنے اولاد شوہر اور اپنی آنے والی نسل کے جو حقوق حسد و ظلم اور حاکمیت کی آگ میں جلائے ہیں ان کا خراج اب مجھے ان تنہائیوں میں ادا کرنا ہوگا کیونکہ اب ضمیر کی عدالت میں، میں اکیلی مجرم ہوں اور اکیلی ہی جوابدہ اور اس جوابدہی کے لئے مجھے ماہ نور سے دوری کا فیصلہ کرنا ہی تھا تا کہ میں احتساب کے عمل سے آسانی سے گزر سکوں اور ماہ نور زندگی کی راہوں سے خوشیوں کے پھل چنتے ہوئے۔

(کیا میرا یہ فیصلہ صحیح ہے یہ آپ لوگ بہتر بتا سکتے ہیں)۔

☆☆☆





اس نے بے حد سرد و سیاٹ نگاہوں سے ماہا کو دیکھا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سناہٹ دوڑ گئی تھی، الفاظ آپس میں ہی گڈمڈ ہو کے اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے، اپنی بے بسی پہ اسے نئے سرے سے رونا آنے لگا تھا۔  
”آؤ صاحب! اندر آ جاؤ۔“ اسے دروازے میں ہی ایستادہ دیکھ کر وہب نے اندر آنے کا اشارہ کیا تھا۔

### ناولٹ

”یہ لو آ گیا ہے صاحب تم خواہ مخواہ پریشان رہی تھی۔“ وہب نے نرمی سے اس کا گلہ چھپتاتے ہوئے کہا۔  
صاحب صبح آفس ٹائم سے گھر سے نکلا تھا اور ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا رات کے دس بجے رہے تھے، اس کا سیل بھی مسلسل آف جا رہا تھا ان سب کا پریشان ہونا اپنی امر تھا، وہب بیچارہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ صاحب کی وجہ سے پریشان

تھی، اس کا دل بھی تو چڑھا ہے زیادہ چھوٹا تھا، ذرا سی بات پہ رونے لگتی تھی اور صاحب کے ایکسپریٹ کے بعد سے تو وہ سب اس کے معاملے میں بھی کوشش ہو گئے تھے۔  
ابھی چند لمحات قبل ہی وہ لوٹا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ آفس کے سلسلے میں آج اسے ایم ڈی کے ساتھ کہیں جانا پڑ گیا تھا، موبائل کی چارجنگ ختم ہو گئی تھی اور گھر میں سے کسی کا فون نمبر بھی اسے زبانی یاد نہیں تھا اسی لئے وہ کسی کو اطلاع نہیں کر سکا تھا۔

اس کی آمد پہ سب نے شکر کا سانس لیا تھا، وہب ماہا کو یہی اطلاع دینے کے لئے اس کے کمرے میں آیا تھا کہ اسے یوں ہلکے ہلکے سے روتا دیکھ کر از حد پریشان ہو گیا تھا، لیکن یہ جان کر اسے تسلی ہوئی تھی کہ وہ صاحب کے معاملے کی وجہ سے پریشان ہوئی ہے۔

”دیکھ رہے ہو، سب تمہاری وجہ سے کتے پریشان ہو رہے ہیں، آئندہ اگر ایسی حرکت کی تو





# رمضان کی رحمتیں مبارک ہوں



Enter the contest on our Facebook page to win fabulous prizes!

DAWN 111-111-9999  
www.dawnbread.com  
www.dawnfoods.com

آیا تھا، صالح کی پریشانی میں کسی نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا، ابھی ہالہ اور منال نے دسترخوان لگایا ہے۔ وہب نے اٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچتے ہوئے اسے بھی اٹھانا چاہا تھا۔ ”میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ بے دلی سے بولی تھی۔

”اوں ہوں بری بات کھانا کھانے بغیر نہیں سوتے ورنہ جلد بوڑھے ہو جاتے ہیں۔“ اس نے اپنی طرف سے بڑے گری کی بات بتائی تھی۔

”ایک دن نہ کھانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ بضد ہوئی۔

”کیوں نہیں پڑتا ایک دن جلد بوڑھی ہو جاؤ گی۔“ وہ بھی اپنی بات یہ قائم تھا، خلاف توقع صالح بڑی خاموشی سے ان کی ٹکرا رہا تھا، اس نے یہ تو وہب سے کچھ کہا تھا اور نہ ہی ماہا کو سرزنش کی تھی۔

”میں جا کر تائی امی کو بتاتا ہوں آپ کی لاڈلی تشریف نہیں لارہی، جب وہ بہ نفس نفیس خود اوپر آئیں گی تب تم تیر کی طرح سیدھی ہو جاؤ گی۔“ وہب نے آنکھیں نکالتے ہوئے آخری حربہ آزمایا تھا، جو کہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر لگ رہا تھا کہ کارگر ثابت ہوا ہے۔

”اچھا بابا آ جاتی ہوں۔“ وہ پیزاری سے کہتی اپنی چپل پہننے لگی۔

”یہ ہوئی نہ بات، شاہباش۔“ وہب نے خوش ہو کر اس کے بالوں کو بکھیرا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

ماہا بھی چپل گھسیٹتی اس کے پیچھے چل پڑی کیونکہ اسے پتہ تھا تائی امی کو اگر اس کی خرابی طبیعت کی بنک بھی پڑ گئی تو وہ از حد پریشان ہو جائیں گی، عزیز تو وہ اسے پہلے بھی رھتی تھیں، لیکن جب سے اس کی صالح سے متعلق ہوئی تھی وہ انہیں عزیز تر ہو گئی تھی، وہ الماس سے بھی پڑھ کر اس کا خیال رھتی تھیں، ماہا بھی ان کا مان پر قرار

تمہیں سخت سزا ملے گی۔“ وہب نے مصنوعی غصے سے اسے لتاڑا تھا۔

”تم چاہو تو اب بھی سزا دے سکتے ہو، میں تیار ہوں۔“ اس نے سر تسلیم خم کیا۔

”چلو چھوڑو یہی غلطی تو انسان معاف کر ہی دیتا ہے۔“ وہب نے شاہانہ انداز میں آیا تھا، صالح مسکرا دیا۔

”یہ بات اپنی بہن کو بھی سمجھا دو۔“ اس کے ذومغنی لہجے پر ماہا ہنسنے لگی۔

”اس کی کچھ نہ پوچھو، یہ تو شروع سے ہی نہایت بزدل واقع ہوئی ہے، چڑیا ہے بھی چھوٹا دل ہے اس کا، ابھی تک چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھال بھال رونا شروع ہو جاتی ہے، اب بچپنا بس کرو اور بڑی ہو جاؤ۔“ اس کے سر پہ ہلکی سی چیت رسید کرتے ہوئے اس نے لاڈ بھرے انداز میں کہا تھا۔

”آہ، میرے بھائی کاش تم جان لیتے تمہاری بہن کا دل اب کتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اس میں بڑے بڑے راز دفن ہو گئے ہیں۔“ آنسو اس کے دل پہ گرنے لگے تھے اس نے مضطربانہ انداز میں لب کھلتے ہوئے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔

اسے اس حالت میں دیکھ کر صالح کا دل بے قرار ہوا تھا، نجانے کیا بات تھی اس لڑکی کے سامنے وہ کمزور پڑنے لگتا تھا، اس کے سارے ارادے مٹی کے ڈھیر کی مانند ڈھے جاتے تھے، یہی بات تھی کہ وہ ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا، اس کا بے ساختہ جی چاہا تھا کہ کوئی ایسی بات کر دے وہ سارے غم بھلا کر اپنے مخصوص سادہ انداز میں کھلکھلا کر ہنس پڑے لیکن کوشش کے باوجود وہ ایسا کچھ نہیں کر سکا تھا، بس خاموش نظروں سے اس کے ضبط سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھے گیا تھا۔

”چلو باہر آؤ میں تمہیں ڈرنے کے لئے بلانے





## Chicken Cubes

## Recipe Card

شرین انور کی نوابی انڈے کی بریانی

تیل..... 1/2 کپ	1 کپ
مٹر..... 1/2 کپ	1 عدد
تلی پیاز..... 1/2 کپ	2 عدد
عنابت گرم مصالحہ..... 1 کھانے کا چمچ	3 عدد
2 چائے کے چمچ لال مرچ	6 عدد
2 چائے کے چمچ دھنیا پاؤڈر	8 عدد
1/2 چائے کا چمچ ہلدی	1/2 کلو
1/2 چائے کا چمچ پسوازیروہ	1/2 گنشی
1 چائے کا چمچ گرم مصالحہ پسواہوا	

1 کپ تیل گرم کر کے 1 کھانے کا چمچ ثابت گرم مصالحہ، 1/2 کپ تلی پیاز، 2 کھانے کے چمچ اورک بھن 2 چائے کے چمچ لال مرچ، 2 چائے کے چمچ پسواہوا دھنیا، 1/2 چائے کا چمچ ہلدی، 1/2 چائے کا چمچ پسوازیروہ اور 1 چائے کا چمچ پسواہوا گرم مصالحہ ڈال کر اچھی طرح فرمائی کر لیں۔ پھر 2 عدد چھوٹے کئے آلو، 1/2 کپ بے مزہ اور 1 کپ دہی ڈال کر جھک کے سبزیاں گل جانے تک پکائیں۔ اب اس میں 6 عدد ابلے انڈے شامل کر لیں۔ ایک دوسرے پین میں آلو بے چاولوں کی آدھی مقدار ڈال کر پھیلا دیں۔ اس پر انڈے اور آلو کا مصالحہ ڈال لیں۔ اب اس پر 1/2 گنشی کٹا چھوٹا دھنیا، 8 عدد ثابت ہری مرچ، کنور پکمن کیوب 1 عدد اور 2 کھانے کے چمچ لال مرچ کے پتے پھیلا دیں۔ اس پر سلائس میں کئے 3 عدد نمائزنگی پھیلا دیں۔ اب بقیہ چاولوں کی ایک تہہ بنالیں۔ 1 کھانے کا چمچ کیوڑہ اور 1/4 چائے کا چمچ زردے کا رنگ مکس کر کے بریانی کے اوپر پھیلا دیں آخر میں اسے 15 منٹ دم پر رکھیں۔

Shireen Anwar.

(Shireen Anwar)



عام کھانوں میں  
چکن کا مزہ





freedom to live happily!



رکھنے کی بھرپور کوشش کرتی تھی، اب بھی صرف ان کی وجہ سے وہ کھانے میں شریک ہو رہی تھی اگرچہ دل تو ہرگز نہیں چاہ رہا تھا کہ کچھ کھائے یا کسی سے بات کرے لیکن صرف منزہ کی خاطر وہ وہب کے پیچھے چل پڑی تھی۔

☆☆☆

”کہاں چلے گئے یہ سب؟“ وہ ازحد پریشان ہو کے سوچنے لگی اور واپس آ کے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

”ہو سکتا ہے دروازہ لاک نہ ہو میں نے اسے ڈھنگ سے کھولا ہی نہ ہو۔“ اس کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا تو وہ برق رفتاری سے اٹھ کے دروازے کی سمت بڑھی، لیکن ہینڈل کو بار بار گھمانے کے بعد بھی نتیجہ سبز ہی رہا تھا۔

”مائی گاڈ!“ اس کی پریشانی حد سے بڑھ گئی۔

سکندر اور مونا تو پہلے ہی اس کے ساتھ اندر نہیں آئے تھے وہ اور میری ہی کمرے میں آئی تھیں اور اب میری بھی اسے اطلاع کیے بغیر نجانے کہاں غائب ہو گئی اور پھر سے دروازہ بھی لاکڈ تھا، وہ ایک مرتبہ پھر صوفے پہ آ کے گری گئی اور ان سب کا انتظار کرنے لگی۔

یونہی پریشانی کے عالم میں بیٹھے بیٹھے اسے تقریباً دو گھنٹے گزر گئے تھے، جب دروازہ کھلا اور میری اور مونا اندر داخل ہوئیں۔

”ارے یہ کیا تم بیٹھی ہوئی ہو، میں تو تمہیں اس لئے چھوڑ کے گئی تھی کہ تم آرام کر لو تا کہ فریش ہو جاؤ۔“ ایسے یوں صوفے پہ بیٹھے دیکھ کر میری فکر سے بولی تھی۔

”تم سب بغیر بتائے غائب تھے میں اندر آ گئی تھی تو سوچا ذرا ہول کی سیر ہی کر لوں لیکن دروازہ باہر سے لاکڈ تھا۔“ یاد جود کوشش کے وہ اپنے لہجے کی ترشی پہ قابو نہیں پاسکتی تھی۔

”ہاں وہ تو میں نے ہی احتیاطاً لاک کیا تھا

یہاں ویٹرز حضرات ٹپ لینے کی خاطر یونہی بار بار ڈسٹرب کرنے آ جاتے ہیں، میں نے کہا تم فرسٹ ٹائم آئی ہو ابھی یہاں کے ماحول سے واقف نہیں ہو ایسے ہی پریشان ہوتی رہو گی، ویسے اس کی دوسری چاہیاں بھی ہینڈ کے دراز میں موجود ہیں اگر تم دیکھ لیتی تو باہر گھوم پھر آتی۔“ میری نے شاید اس کے لہجے کی ترشی کو محسوس نہیں کیا تھا، اسی لئے اپنی ہی رو میں اسے تفصیل سے آگاہ کرنے لگی تھی۔

”اف مائی گاڈ، میں کیا الٹا سیدھا سوچتی رہی۔“ ایسے بے حد دامت نے آن گھیرا۔

”واقعی میں کون سا یہاں کے ماحول سے شناسا تھی جو باہر گھومتی پھرتی، اپنی اتنی مختص دوست کے بارے میں میں نے کیا کچھ نہیں سوچ ڈالا، کیا صرف اپنا ملک چھوڑتے ہی میں اتنی خود غرض ہو گئی کہ میری اپنی دوست کے اخلاص پر شک کرنے لگی۔“ اس کا اپنا دل ہی اسے بار بار ملاحت کیے جا رہا تھا، وہ میری سے اپنی شرمندہ تھی کہ اس سے نظریں ہی نہیں ملایا رہی تھی۔

”اچھا چلو یوں کرو، کہ ٹھوڑا سا تیار ہو لو، تمہیں کہیں باہر گھمالاتے ہیں، پھر شام کو تو عدیل باغی کی طرف جانا ہے۔“ میری نے خود ہی اٹھ کے اس کا سوٹ کیس کھولا اور اس میں اس کی اسکاٹی کلر کی ساڑھی نکالی۔

”یہ ٹھیک رہے گی، تمہارے لک میں بھی تھوڑی Changing آ جائے گی۔“ میری نے ساڑھی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے تائید طلب نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”اوکے۔“ نازو نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ساڑھی تھامی اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

وہ ساڑھی پہن کے باہر نکلی تو اس کا سڈول جسم ساڑھی میں خوب بچ رہا تھا، میری نے اس کا نہایت مہارت سے اونچا سا جوڑا بتایا اور نفاست



سے میک اپ کیا، ساتھ میں میچنگ جیولری اور جوتی بھی نکال دی، اس کا حسن آنکھوں کو اس قدر خیرہ کر رہا تھا کہ نگاہیں اس کے وجود سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

”ویل ڈن، چلو آ جاؤ اب سکندر باہر منتظر ہے۔“ میری نے بے حد سراہتی نظروں سے اسے دیکھا۔

میری کی آنکھوں میں ستائش دیکھ کر اس کے لبوں پر بڑی فاخرانہ مسکان پھیلی تھی اور گردن میں خود بخود اکڑاؤ پیدا ہو گیا تھا۔

وہ لوگ باہر نکلیں تو سکندر گاڑی لئے ان کا منتظر تھا ان دونوں کے بیٹھتے ہی گاڑی فریٹے بھرنے لگی تھی، اب کی دفعہ نازو سبھل کے پیٹھی تھی اور ادھر ادھر حیرت و شوق سے دیکھنے کی بجائے مطمئن و پرسکون ہو کے بیٹھی تھی۔

”ہیلو مس مہرین! اور ان کا تعارف.....؟“

”ارے..... راؤ صاحب آپ؟ کیسے مزاج ہیں؟“ اندر داخل ہوتے ہوئے ہی سکندر کا ٹکراؤ ایک آدمی سے ہوا، تو وہ نہایت خوشدلی سے اس کے ساتھ معافہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”بالکل فٹ ہیں تم سناؤ۔“ جواباً انہوں نے بھی خوشدلی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ تقریباً چھیالیس سترالیس سالہ ایک مرد تھا، سر کے بال کافی حد تک جھڑ چکے تھے، انتہائی قیمتی ٹوپیں میں ملبوس تھا اس کی اک اک ادا سے امارت ٹپک رہی تھی۔

”ہیلو، مس مہرین! اور ان کا تعارف.....؟“

میری سے مصافحہ کرنے کے بعد اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے سوالیہ نظروں سے سکندر کو دیکھا تھا۔

”یہ مس نازنین ہیں۔“ سکندر نے فوراً تعارف کروایا تھا۔

”ہیلو مس نازنین، ہاؤ آر یو۔“ فدا ہو جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

”فائن۔“ پتہ نہیں کیوں لیکن اسے اس شخص کی نظروں سے عجیب سی گھبراہٹ ہوئی تھی، اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو راؤ صاحب نے نہایت گوجوشی سے اسے دبایا تھا، نازو کے ماتھے پہ پسینہ پھوٹ پڑا۔

یہ ٹھیک ہے کہ عدیل ہاشمی کے ساتھ اس نے کئی لحاظ تہائی میں گزارے تھے لیکن عدیل کے سوا اس نے بھی کسی مرد کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

”نازنین! یہ جنات راؤ صاحب ہیں، عدیل ہاشمی کے بزنس پارٹنر ہیں، نہایت کھلے دل اور کھلے ہاتھ ہیں اور ہمارے تو محسن ہیں۔“ سکندر نے اب اس سے تعارف کروایا تھا۔

”سکندر تو شاید کچھ زیادہ ہی کہہ گیا ہے۔“ انہوں نے ایک بلند قہقہہ لگایا، پھر ان سے مخاطب ہوئے۔

”میرا خیال ہے کہیں بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔“

”جی بالکل، کیوں نہیں آئیے۔“ سکندر تو بالکل ہی ان پہ نثار ہونے کو تیار تھا، وہ چاروں نسبتاً ایک الگ تھلگ میز کے گرد بیٹھے تھے۔

”اور سائیں مس نازنین کیا مصروفیات ہیں آپ کی۔“ آرڈر کے بعد وہ پھر اس سے مخاطب ہوا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ اسے سمجھ نہیں آئی کہ کیا جواب دے، البتہ یہ سن کر کہ وہ عدیل کے بزنس

پارٹنر ہیں وہ نارمل ہو گئی تھی، میری کی صحبت میں رہتے ہوئے اتنا تو اسے علم ہو ہی چکا تھا کہ ہر کاروباری شخصیت کے ساتھ کس طرح پیش آنا ہے۔

”چلیں ہم خاص بنا دیں گے۔“ ذومعنی لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے نہایت بے تکے سے انداز میں قہقہہ لگایا تھا۔

نازو نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ سے ان کا ساتھ دینا تھا، البتہ اسے عجیب کوفت سی ہوئی تھی تاہم وہ خود کو چھپا گئی تھی۔

”آپ کی کیا بات ہے راؤ صاحب! آپ تو بے جان چیزوں میں بھی جان ڈال دیتے ہیں۔“ اس نے صاف میری کے لہجے سے خوشامد کی بو کو محسوس کر لیا تھا۔

”لیکن یقین مانے مس مہرین ایسی جاندار چیز ہم نے آج تک اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔“ ان کی نگاہیں نازو کی طرف اٹھتی تھیں تو بے لگام ہو جاتی تھیں، بمشکل جیسے تپے کر کے وہ خود یہ جبر و ضبط کیے بیٹھے تھے، ورنہ دل تو چاہ رہا تھا حسن کے اس پیکر کو ایک سیکنڈ کی بھی دیر کیئے بغیر خود میں چھپا لیں۔

”پھر تو آپ کا حسن نظر ہے راؤ صاحب!“ میری کی آنکھوں کی چمک ایک دم بڑھ گئی تھی۔

”پھر کب تشریف لارے ہیں آپ میرے گریب خانے پر۔“ بے قراری ان کے لہجے میں انہیں آنکھوں سے بھی پکی بڑ رہی تھی۔

”غریب خانہ کہہ کر تو آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں۔“ سکندر نے مصنوعی شکوہ کناں لگا ہوں سے انہیں دیکھا تھا۔

”اجی حسن کے اس مجسمے کے آگے تو وہ گریب خانہ ہی ہوا، حسن کی ساری دولت تو لگتا ہے کہ یہی سنبھالے بیٹھے ہیں۔“ نازو کے بے لال میں میز پر دھرے مرمریں ہاتھ کو انہوں نے یکدم ہی اپنی گرفت میں لے لیا تھا وہ چونکہ

اس ”جملے“ کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے ایک دم بوکھلا سی گئی، راؤ صاحب نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھاتے ہوئے ہاتھ کے دباؤ کو مزید بڑھایا تھا۔

”عدیل ہاشمی سے ملاقات ہوئی آپ کی؟“ ان دونوں نے گویا رائے صاحب کی اس حرکت کو نوٹ ہی نہیں کیا تھا، ویسے بھی وہ جس اسٹیشن اور کلاس سے تعلق رکھتے تھے وہاں اس جیسی چھوٹی موٹی شرارتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی، بلکہ ان حرکات کو تعلق بڑھانے کا ایک سبب گردانا جاتا تھا۔

”ہاں، آج صبح ہوئی تھی۔“ انہوں نے سرسری سا لہجہ بنایا تھا۔

اتنے میں ویٹر سرود کرنے لگا تو وہ چاروں بلکہ تینوں خاموش ہو گئے کیونکہ نازو تو پہلے ہی خاموش تھی، پھر کھانے کے درمیان جس طرح راؤ صاحب نے نازو کو اہمیت دی تھی اور جس طرح اس کے واری صدے جارہے تھے اس نے نازو کو اچھی بھلی کوفت میں مبتلا کر دیا تھا، تاہم اگر اس نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی تو حوصلہ شکنی بھی نہیں کی تھی۔

شکر تھا کہ انہیں کوئی ضروری کام یاد آ گیا تو وہ جلدی چلے گئے، وہ تینوں بھی شاپنگ کا ارادہ ملتوی کرتے واپس آئے تھے۔

☆☆☆

اس کا سیل فون ایک تو اتر سے بچتا چلا جا رہا تھا، وہ باہر کسی کام میں مشغول تھی اندر کمرے میں داخل ہوئی تو موبائل کی ٹون سنائی دی۔

”یہ کس کا نمبر ہے۔“ ایک انجان نمبر کی ڈھیروں مسڈ کال چیک کرتے ہوئے وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے پریشان بھی ہوئی۔

اس نے اپنا رابطہ نمبر چند گنے گئے افراد کو ہی دیا تھا، کچھ اس کا حلقہ احباب بھی اتنا وسیع نہیں



تھا، اس لئے جتنے بھی نمبرز اس کے Contact میں Save تھے وہ سب اس کے اچھی طرح جاننے والے ہی تھے۔

”السلام وعلیکم!“ بالآخر اس نے فون رسیو کر ہی لیا تھا۔

”علیکم السلام! بڑا انتظار کروا ہا تم نے۔“ دوسری طرف ارغان تھا لہجہ کسی قدر شکوہ لئے ہوئے تھا، اس کی ساری پریشانی پل بھر میں ہوا ہو گئی۔

”اچھا تو یہ آپ تھے۔“ اس کے لبوں پہ خود بخود ہی تبسم پھیل گیا تھا، وہ ریلیکس انداز میں اپنے بیڈ پہ آ کے بیٹھ گئی۔

”جی بالکل اس ناچیز کے علاوہ اور کون ویلا نکلا ہو سکتا ہے۔“ وہ تب کے بولا تھا، رمشاء کی مسکراہٹ ہلکی میں تبدیل ہو گئی۔

”اسی لئے کڑکٹی دوپہر میں لوگوں کے گھر لڑکیاں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔“ اس نے پہلی ملاقات کے حوالے سے چھیڑا۔

”لڑکیاں نہیں لڑکی کہو، کچھ تو خوف خدا کرو، مجھ معصوم پہ اتنے بڑے بڑے الزام تو مت دھرو۔“ اس نے جلدبلا کے فوراً سچ کی تھی۔

”آپ اور معصوم؟“ وہ احتجاجا چلائی۔

”معصوم ہی تھا تو تمہیں نکاح کے بعد بھی ہیں چھوڑ آیا، ورنہ دل تو کر رہا تھا کہ تمہیں بھگا کر لے جاؤں۔“ اس نے آنکھیں بند کر کے اس دن کا تصور کیا۔

”نکاح کے بعد بھگا کر نہیں بیٹھا کر لے جایا جاتا ہے۔“ اس نے گویا اس کی ناقص معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

”تمہیں تو میں سر آنکھوں پر بٹھانے کو تیار ہوں۔“ وہ شوخ لہجے میں بولا۔

”لیکن میں نہ تو آپ کی آنکھوں پر بیٹھ سکتی ہوں نہ سر پہ کیونکہ گرنے کا اندیشہ قوی ہے، ویسے بھی لوگ کیا کہیں گے کیسی لڑکی ہے، سر پہ بیٹھی

ہے۔“ رمشاء قطعاً اس کے لہجے کو خاطر میں لائے بغیر اپنی ہی ہانکنے لگی۔

”میں نے محاورتا کہا ہے حقیقتاً نہیں۔“ وہ بد مزہ ہوا۔

”اوہ..... اچھا..... اچھا پھر ٹھیک ہے محاورتا تو آپ مجھے آسان پہ بھی بٹھا سکتے ہیں۔“ وہ شان بے نیازی سے گویا ہوئی۔

”اچھا یہ بتاؤ کیا کر رہی تھی، میں اتنی دیر سے ٹرائی کر رہا تھا تم میرا فون ہی رسیو نہیں کر رہی تھی۔“ وہ موضوع تبدیل کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”میں کچن میں تھی اور موبائل میرے روم میں تھا، ابھی آگئے دیکھا تو مسٹر کالز کا لنبار لگا ہوا تھا نمبر بھی Unknown تھا میں نے کہا پتہ نہیں کون ہے، رسیو کیا تو دوسری طرف سے آپ نکلے۔“ وہ بڑے مزے سے بتا رہی تھی۔

”میں نکلا؟“ وہ اس کی بات پہ اچھلا۔

”اے لڑکی! سوچ مجھ کے تو بولا کرو، میرا موبائل سے نکل پڑا تھا، میں تو یہاں آرا سکون سے بیٹھا ہوا ہوں۔“ وہ مصنوعی حلقی سے بولا۔

”تو میں نے کب کہا ہے کہ اچھل کود کر رہے ہیں اپنے گھر میں ہر کوئی آرام سکون سے ہی ہوتا ہے۔“ وہ بھی اس کے لہجے میں بولی تھی۔

”اچھا..... ساری باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ کل تمہیں ملنے آ جاؤں؟“ اس نے بڑے نرم گیمیر لہجے میں استفسار کیا تھا۔

”جی..... ای..... ای۔“ اس کا لہجہ کیا ہوا تھا رمشاء کے ساتھ ہی شمی گم ہو گئی تھی۔

”کتنے دن ہو گئے ہیں ناں تمہیں دیکھ ہوئے، آئی مس یو سوچج رمشاء۔“ اس کا لہجہ جذبول کی آنچ لئے ہوئے تھا۔

رمشاء کی ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھی، ہاتھ لمحات قبل اس کی پٹر پٹر چلتی زبان اب گویا تار

سے چپک گئی تھی، چہرہ الگ تب کر سرخ ہوا جا رہا تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے ارغان اس کے سامنے بیٹھا ہو۔

”تم بھی تو کچھ بولو، یہ بتاؤ مجھے مس کیا؟“ وہ اب اسے بولنے پر اکسار رہا تھا۔

رمشاء کے لئے اچھا خاصا مشکل سوال تھا، اس نے اگر کچھ بولنا بھی چاہا تھا تو زبان نے ساتھ نہیں دیا تھا۔

”میں اسی لئے اس ٹاپک کی طرف نہیں آ رہا تھا، مجھے پتہ تھا تمہاری بولتی بند ہو جائے گی اور مجھے تو چاہیے ہوئی رمشاء ہی اچھی لگتی ہے۔“ وہ اس کی طوٹتی خاموشی پر سرد آؤ بھر کے بولا، البتہ آخر میں لہجہ کچھ شرم سے ہوا گیا تھا۔

”ویسے یہ تم نے اتنا زور نہ بڑھا کہاں سے نکلا ہے۔“ وہ اپنے جوتے کو لولا۔

”یہ بھی کوئی کچھنے کی چیز ہے، یہ تو خدا داد صلاحیت ہے، فطری آرٹ ہے۔“ اس کی زبان کا ہلکا ہلکا چپکا تھا، خلاف توقع جوتے کی بجائے اس نے گردن اڑائی تھی۔

”بابا رے پھر تو مارے گئے۔“ اس نے ہلکلا کے کہا، تو رمشاء اس کے انداز پہ ہنسنے لگ گئی۔

”ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہو میری زندگی او کے لکھی بات ہوگی اب مجھے نہیں جانا ہے۔“ اس کی ہنسی ہوئی تھی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے خدا حافظ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا تھا، رمشاء مسکراتے ہوئے اس کی باتوں کو سوچنے لگ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس دن کے بعد سے لے کر وہ صبح کا سامنا کرنے سے ہی کترانے لگ گئی تھی، عموماً اب کھانے پہ ہی ملاقات ہوئی تھی اس کے گھر آنے کے اوقات میں وہ دائیں بائیں ہو جاتی تھی، اب بھی یونہی ہوا تھا، وہ الماس کے پاس جا

رہی تھی جب اسے ہال کمرے سے الماس اور منزہ کے ساتھ ساتھ صبح کی آواز بھی سنائی دی تو وہ اندر جانے کی بجائے وہیں ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس رکھے سنکڑے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

”بھابھی! کیا آپ سے سعدیہ نے ایسا کوئی اظہار کیا تھا۔“ الماس کی چیز کے متعلق منزہ سے پوچھ رہی تھیں۔

”نہیں اظہار تو نہیں کیا الماس لیکن ان کے ارادوں سے لگتا ہے کہ وہ زیادہ دیر نہیں کریں گے، سعدیہ کو گھر بھولانے کا بہت شوق ہے، میرا تو خیال ہے کہ رمشاء کو ماسٹر ز بھی نہیں کرنے دیں گے، بی اے کے بعد ہی رخصتی کا کہہ دیں گے۔“ منزہ نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”لیکن ارغان ایک سلجھا ہوا لڑکا ہے، میرا نہیں خیال کہ وہ رمشاء کے اسٹڈی جاری رکھتے یہ پابندی لگائے گا۔“ صبح نے کہا تھا۔

”بیٹا! تمہاری بات تو ٹھیک ہے اور اگر باغرض وہ شمی پڑھنے دے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا، ان کے گھر کا معاملہ ہوگا جیسے وہ اپنے لئے بہتر سمجھیں، ویسے بھی اب تو وہ ان کی امانت بن چکی ہو، وہ جب چاہیں آ کر لے جائیں، میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ شمی کی ماں ہونے کی حیثیت سے اس ہم تیاری شروع کر دیں، تا کہ وہ جب بھی رخصتی کرنا چاہیں ہمیں اس سلسلے میں کوئی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔“ منزہ نے تفصیلاً اسے اپنا موقف سمجھایا تھا۔

”آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، رمشاء کا بھائی موجود ہے، میرے اکاؤنٹ میں اتنی سیونگ ہے کہ میں اپنی دونوں بہنوں کی شادی بہت دھوم دھام سے کر سکتا ہوں۔“ اس نے بڑا بھائی ہونے کا حق ادا کیا تھا۔

اس کے لہجے میں ہالہ اور رمشاء کے لئے جو محبت تھی اس نے ماہا کو کھٹک جانے پر مجبور کر دیا

رہی تھی جب اسے ہال کمرے سے الماس اور منزہ کے ساتھ ساتھ صبح کی آواز بھی سنائی دی تو وہ اندر جانے کی بجائے وہیں ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس رکھے سنکڑے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

”بھابھی! کیا آپ سے سعدیہ نے ایسا کوئی اظہار کیا تھا۔“ الماس کی چیز کے متعلق منزہ سے پوچھ رہی تھیں۔

”نہیں اظہار تو نہیں کیا الماس لیکن ان کے ارادوں سے لگتا ہے کہ وہ زیادہ دیر نہیں کریں گے، سعدیہ کو گھر بھولانے کا بہت شوق ہے، میرا تو خیال ہے کہ رمشاء کو ماسٹر ز بھی نہیں کرنے دیں گے، بی اے کے بعد ہی رخصتی کا کہہ دیں گے۔“ منزہ نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”لیکن ارغان ایک سلجھا ہوا لڑکا ہے، میرا نہیں خیال کہ وہ رمشاء کے اسٹڈی جاری رکھتے یہ پابندی لگائے گا۔“ صبح نے کہا تھا۔

”بیٹا! تمہاری بات تو ٹھیک ہے اور اگر باغرض وہ شمی پڑھنے دے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا، ان کے گھر کا معاملہ ہوگا جیسے وہ اپنے لئے بہتر سمجھیں، ویسے بھی اب تو وہ ان کی امانت بن چکی ہو، وہ جب چاہیں آ کر لے جائیں، میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ شمی کی ماں ہونے کی حیثیت سے اس ہم تیاری شروع کر دیں، تا کہ وہ جب بھی رخصتی کرنا چاہیں ہمیں اس سلسلے میں کوئی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔“ منزہ نے تفصیلاً اسے اپنا موقف سمجھایا تھا۔

”آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، رمشاء کا بھائی موجود ہے، میرے اکاؤنٹ میں اتنی سیونگ ہے کہ میں اپنی دونوں بہنوں کی شادی بہت دھوم دھام سے کر سکتا ہوں۔“ اس نے بڑا بھائی ہونے کا حق ادا کیا تھا۔

اس کے لہجے میں ہالہ اور رمشاء کے لئے جو محبت تھی اس نے ماہا کو کھٹک جانے پر مجبور کر دیا

☆ ☆ ☆

اس دن کے بعد سے لے کر وہ صبح کا سامنا کرنے سے ہی کترانے لگ گئی تھی، عموماً اب کھانے پہ ہی ملاقات ہوئی تھی اس کے گھر آنے کے اوقات میں وہ دائیں بائیں ہو جاتی تھی، اب بھی یونہی ہوا تھا، وہ الماس کے پاس جا

رہی تھی جب اسے ہال کمرے سے الماس اور منزہ کے ساتھ ساتھ صبح کی آواز بھی سنائی دی تو وہ اندر جانے کی بجائے وہیں ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس رکھے سنکڑے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

”بھابھی! کیا آپ سے سعدیہ نے ایسا کوئی اظہار کیا تھا۔“ الماس کی چیز کے متعلق منزہ سے پوچھ رہی تھیں۔

”نہیں اظہار تو نہیں کیا الماس لیکن ان کے ارادوں سے لگتا ہے کہ وہ زیادہ دیر نہیں کریں گے، سعدیہ کو گھر بھولانے کا بہت شوق ہے، میرا تو خیال ہے کہ رمشاء کو ماسٹر ز بھی نہیں کرنے دیں گے، بی اے کے بعد ہی رخصتی کا کہہ دیں گے۔“ منزہ نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”لیکن ارغان ایک سلجھا ہوا لڑکا ہے، میرا نہیں خیال کہ وہ رمشاء کے اسٹڈی جاری رکھتے یہ پابندی لگائے گا۔“ صبح نے کہا تھا۔

”بیٹا! تمہاری بات تو ٹھیک ہے اور اگر باغرض وہ شمی پڑھنے دے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا، ان کے گھر کا معاملہ ہوگا جیسے وہ اپنے لئے بہتر سمجھیں، ویسے بھی اب تو وہ ان کی امانت بن چکی ہو، وہ جب چاہیں آ کر لے جائیں، میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ شمی کی ماں ہونے کی حیثیت سے اس ہم تیاری شروع کر دیں، تا کہ وہ جب بھی رخصتی کرنا چاہیں ہمیں اس سلسلے میں کوئی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔“ منزہ نے تفصیلاً اسے اپنا موقف سمجھایا تھا۔

”آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، رمشاء کا بھائی موجود ہے، میرے اکاؤنٹ میں اتنی سیونگ ہے کہ میں اپنی دونوں بہنوں کی شادی بہت دھوم دھام سے کر سکتا ہوں۔“ اس نے بڑا بھائی ہونے کا حق ادا کیا تھا۔

اس کے لہجے میں ہالہ اور رمشاء کے لئے جو محبت تھی اس نے ماہا کو کھٹک جانے پر مجبور کر دیا



تھا۔

”الحمد للہ، اللہ میرے بیٹے کو خیر و عافیت والی لمبی زندگی عطا کریں، بیٹا یہاں بھی جو کچھ ہے وہ بھی آپ کا ہی ہے۔“ منزه نے نہال ہوتی نظروں سے اپنے بے حد وجہہ بیٹے کو دیکھا تھا جس کے ایک جھلنے نے ہی ان کا ڈھیروں خون بڑھا دیا تھا۔

”تمہارے ابو نے شروع سے ہی میرا نہ روی کا سبق اپنے بچوں کو پڑھایا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے دنیا کی ہر نعمت مہیا کی ہے، ہم نے حج بھی کر لیا اولاد کو پڑھا لکھا بھی لیا اور ان کی شادیوں کے لئے انتظام کر رکھا ہے بس اب آگے اللہ پاک تم سب کی قسمت اچھی کرے جیسے ہمیں مناسب جوڑ ملتے جائیں گے ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو کے خدا کا شکر ادا کریں گے۔“ منزه نے کہا۔

”لیکن پھر بھی میں بھائی ہوں میرا حق تو بنتا ہے۔“ وہ اپنی بات پہ بضد تھا۔

”کیوں نہیں بنتا میرے لعل! بس جب وقت آئے گا تو پھر دیکھ لیں گے ابھی تو تم اپنی شادی کی تیاری کرو اور ہاں الماس، میں ایک بیٹی کو رخصت کروں گی تو ایک کو اپنے گھر لے آؤں گی، رمشاء اور صالح کی شادی تو ایک ساتھ ہی ہو گی انشا اللہ۔“ منزه نے بڑی مان بھری دھولس سے الماس سے کہا تھا، ماہا کو اپنا سانس بند ہوتا محسوس ہوا تھا۔

”انشا اللہ ماہا اب میری نہیں آپ کی امانت ہے، آپ جب چاہیں لے جائیں۔“ الماس نے ان کی بھرپور تائید کر کے ان کے مان کو برقرار رکھا تھا۔

ماہا کی آنکھوں کے سامنے تو اندھیرا چھانے لگا تھا، ہر چیز اسے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی الماس کے الفاظ گویا پکھلا ہوا سپسہ تھے جو کسی نے اس کے کانوں میں انڈیا تھا، مزید سننے کی

اس کے اندر ہمت نہیں تھی، اپنے چکراتے ہوئے سیر کو مشکل قابو کرتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

”یا خدا! یہ شخص ہم سے کیا چاہتا ہے۔“ ماہا عجب متضاد کیفیتوں میں گھری ہوئی تھی، اس نے نہایت ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ بچار کی تھی اور صالح کی ایک ایک حرکت پہ نظر رکھی تھی، اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اس طرح کچھ کھوج لگا لے گی، لیکن ہر زوالے سے دیکھ لینے کے بعد اسے کوئی قابل گرفت بات نظر نہیں آتی تھی۔

بڑوں کا وہ ہر ممکن احترام کرتا تھا، غوری اور وہیب کے ساتھ رو بہ نہایت دوستانہ تھا اور ہر خاتون کے لئے اس کی آنکھوں میں احترام تھا، رمشاء اور ہالہ کو بھی بہنوں کی طرح عزت رکھتا تھا، اس کی غیر موجودگی میں وہ کئی بار اس کے کمرے کی تلاشی بھی لے چکی تھی، ہر ہر چیز کو کھنگال لیا تھا، لیکن اسے ہر طرف سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا، آخر ہار تھک کے وہ بری طرح زبچ ہو گئی تھی۔

”خیر ہے تم یوں سر جھکائے بیٹھی ہو۔“ وہ پیرس پہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامے بیٹھی تھی، جب صالح کی آواز پہ اس نے ایک جھٹکے سے سر اوپر اٹھایا تھا۔

”آپ چاہتے کیا ہیں ہم سے؟“ وہ چونک اسی کے متعلق سوچ رہی تھی اب جو اسے سامنے موجود پایا کہ دماغ میں کلبلاتے سوال کو لبوں تک لانے میں اس نے ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں کی تھی۔

”تم سے تو کچھ نہیں چاہتا البتہ ”جھپٹ“ ضرور چاہتا ہوں۔“ اس نے بات کو دو متنی رنگ دیا۔

”جسٹ کنٹرول یور لینگویج۔“ اگرچہ اس کا چہرہ گلابی پڑ گیا تھا تاہم اس نے لہجے کو سخت ہی رکھا تھا۔

”کنٹرول ہی تو کیے ہوئے ہوں اتنے دنوں سے، ورنہ تم تو مجھے دیکھتے ہی بھاگ جانی ہو اور میرے ممکنہ موجودگی والے کمروں کا رخ بھی نہیں کرتی ہو۔“ تو وہ گویا اتنے دنوں سے اس کی حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔

”ہونا بھی یونہی چاہیے، اک غیر سے انسان خود کو جس قدر بجا کے رکھے اتنا ہی اس کے لئے بہتر ہے۔“ وہ الفاظ چبا کے ترشی سے گویا ہوئی تھی۔

اس کی بات پہ صالح کی رنگت مل بھر کے لئے متحیر ہوئی تھی، اضطرابی انداز میں ہونٹ کاٹتے ہوئے اس نے جن نظروں سے ماہا کو دیکھا تھا، اس سے تو ایک لمحے کے لئے وہ بھی گڑبڑا سی گئی تھی، وہ اس سے مزید کچھ بھی کہے بغیر دوسری طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ ریلنگ پہ رکھے نیچے کی نادیدہ چیز کو کھوجنے لگا تھا۔

”آپ کا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے اور..... اور آپ کون ہیں آخر بنا کیوں نہیں دیتے۔“ وہ بھی کرسی چھوڑ کے کھڑی ہو گئی اور نہایت عاجز ہو کے وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

”اگر صالح کے علاوہ کوئی یہ سب باتیں جان پایا تو وہ شاید تم ہی ہوگی ماہا عبداللہ۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اس سے مخاطب ہوا تھا، لہجہ اک عجب سا احساس لئے ہوئے تھا، ماہا لمحہ بھر کے لئے جھٹک گئی۔

”کیا صالح آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے؟“ اس نے رک رک کر مدہم لہجے میں دریافت کیا۔

”ہاں۔“ اس نے رخ اس کی طرف موڑا۔ ”وہ کہاں ہے اس وقت۔“ ماہا نے بے قراری سے اگلا سوال داغا۔

”میری کسٹڈی میں ہے۔“ اس کا لہجہ طمینان سے گہرا تھا۔

”وہ پاکستان میں ہیں یا لندن میں؟“ وہ تو

گویا آج کھوج لگا لینا چاہتی تھی۔

”لندن میں۔“ وہ بھی نجانے کبھی موڈ میں تھا کہ اس کے ہر سوال کے جواب دیے جا رہا تھا، لندن کا سن کر ماہا کا دل ایک لمحہ کے لئے ڈوب کے ابھرا تھا۔

”تو گویا وہ ابھی ہم سے دور سات سمندر پار ہیں۔“ اس نے دکھ بھرنے لہجے میں خود کلامی کی۔

”وہ پاکستان کب آئیں گے؟“ اس کے لہجے سے بے تابی عیاں تھی، ظاہری بات ہے اسے اپنے اس تایا زاد سے ملنے کا شوق تھا، اس کے حالات کے بارے میں جاننا اور سامنے موجود شخص کی حقیقت پہچاننا یہ اس کا حق تھا۔

”جب میں لندن چلا جاؤں گا۔“ وہ بغور اس کے انداز کو نوٹ کرتا ہوا بولا۔

”اور آپ لندن کب جائیں گے۔“

”جب تم چاہو گی۔“ کندھے اچکا کر اطمینان سے کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ جینز کی پاکٹ میں گھسائے، چند لمحات قبل اس پہ جو کیفیت طاری ہوئی تھی، وہ یکسر ختم ہو چکی تھی، اس کا ازلی اعتماد دعو کر آیا تھا اور وہ پھر سے اپنے خول میں مقید ہو چکا تھا۔

”میں چاہوں گی؟“ اس نے متعجب ہو کرنا سمجھ آنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

”ہاں، کیونکہ میں تمہیں ساتھ لئے بنا تو نہیں جاؤں گا کیونکہ میں نے آج تک وہی کیا ہے جو میرا دل چاہا ہے۔“ اس کے لہجے میں اپنی ذات کا غرور بول رہا تھا۔

”یہ آپ کی بہت بڑی بھول ہے کہ آپ مجھے لے جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

اس کے لب و لہجے پہ اسے یقین ہی تو لگ گئے تھے، وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک ایک لفظ چبا کے بولی تھی۔

”یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون اپنے قول کا



پکا لگتا ہے۔“ وہ بھی اسی کے انداز میں بولا تھا۔  
”میں اتنی بھی کمزور نہیں جتنا آپ خیال کر رہے ہیں، آپ کو کیا لگتا ہے اگر میں ابھی تک خاموش ہوں تو کیا آپ ساری زندگی میری زبان کو بند رکھ سکیں گے؟“ وہ دلیری سے اس کے سامنے تن کے کھڑی تھی۔

”ٹھیک ہے تم اپنی سی کوشش کر لو لیکن یہ بات بھی ذہن میں بٹھا لینا کہ تمہاری زبان کی ہلکی سی لغزش صانع عبد الرحمن کو ناقابل نقصان پہنچا سکتی ہے۔“ یکدم ہی اس کا لہجہ شعلے اگلنے لگا تھا، ماہا کے پورے جسم میں پھریری دوڑ گئی، اس کی ساری تیزی طراری پل بھر میں ہوا ہو گئی تھی۔

وہ چند سیکنڈ سرد برقی لگا ہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل گیا، اس کے قدموں کی دھمک سے ماہا کو اپنا دماغ سناتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اس کا لہجہ جن جارحانہ عزائم کی سختی لئے ہوئے تھا اس نے ماہا کے سارے ارادوں کو بھر پوری منی کی مانند ڈھیر کر دیا تھا۔

”یا میرے خدا!“ وہ ایک مرتبہ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کے بیٹھ گئی تھی، لیکن اب اس کی سوچوں میں بے شمار پریشانیوں کا مزید اضافہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”آپ کا نام نازنین ہے؟“ وہ انہیں تیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی تھی، جس نے بڑے اشتیاق سے اس سے دریافت کیا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے وہ میری کے ہمراہ یہاں پہنچی تھی، میری اسے یہاں چھوڑ کے خود نجانے کہاں غائب تھی، یہ ایک وسیع و عریض عمارت تھی، بناوٹ کے لحاظ سے کوئی اتنی خوبصورت نہ تھی، البتہ سہولت کی ہر چیز موجود تھی، نازو کو تو عجب پراسرار اور مجید بھری محسوس ہوئی تھی۔  
درو دیوار سے گویا خوشست شب رہی تھی،

ابھی فی الحال اس نے اس بلڈنگ کا راؤنڈ نہیں لگایا تھا البتہ باہر کے شور شرابے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے میری اسے جس کمرے میں بٹھا کے گئی تھی کہ قدرے الگ تھلگ ایک کمرہ تھا، مونا بھی ان کے ساتھ آئی تھی لیکن میری کے ساتھ وہ بھی غائب تھی۔

اسے یہاں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی جب ایک خوبصورت لڑکی مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اس کے پیچھے نازو کو اور بھی ریشم کی آچل نظر آئے تھے، اس کا مطلب تھا یہاں کافی لڑکیاں موجود تھیں۔

”ہاں میرا نام نازنین ہے۔“ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نازو نے خود ہی ہاتھ بڑھانے میں پھل کی تھی، جسے اس نے گرجوٹی سے تھام لیا تھا۔

”میرا نام ریشم ہے مجھے آپ سے ملنے کا بڑا شوق تھا، آپ میری کسے کالج پڑھتی تھیں ناں؟“ اس نے بھی اپنا تعارف کرواتے ہوئے قدرے جوش سے کہا، اگرچہ وہ عمر میں نازو سے چند ایک سال بڑی لگ رہی تھی لیکن اپنی باتوں اور لب و لہجہ سے وہ بچی سی محسوس ہوئی تھی۔

”مجھ سے ملنے کا شوق تھا؟ لیکن آپ مجھے کیسے جانتی ہو۔“ اس کی بات سن کے نازو کو حیرت کا شدید جھجکا لگا تھا۔

”آپ کو کون نہیں جانتا، حسنا راؤ اس بلڈنگ میں رہنے والی ہر لڑکی کو رنچنگ کر چکے ہیں لیکن آپ کی تو صرف تصویر دیکھ کر ہی وہ آپ پر فدا ہو گئے تھے، آپ کو یہاں تک لانے میں جتنا بھی خرچہ ہوا ہے وہ سارا انہوں نے برداشت کیا ہے، سنا ہے انہوں نے پورا مہینہ آپ کو اپنے پاس رکھنا ہے، ہم تو وہاں ایک رات گزارنے کے لئے ترستے ہیں، کیا عالی شان محل ہے ان کا۔“ آنکھیں میچ کے گویا اس نے اس گھر کا تصور

کیا تھا، ریشم کافی سے زیادہ باتونی تھی اسی لئے بات سے بات نکالتی جا رہی تھی۔

”واٹ.....؟“ نازو اپنی جگہ سے اچھل کے کھڑی ہوئی تھی، شدید غصے سے اس کے گلے کی رگیں ابھر آئی تھیں، اس نے شرر بار نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”تمہیں شاید کوئی شدید قسم کی غلط فہمی لاحق ہوئی ہے، کیونکہ مجھے یہاں عدیل ہاشمی نے بلوایا ہے اور بہت جلد ہمارا نکاح ہونے والا ہے۔“ اس نے اپنے تئیں اسے بہت بڑی خبر سنائی تھی۔  
”ہا ہا ہا ہا۔“ ریشم کا قبضہ بلند ہونے کے ساتھ ساتھ کافی طویل بھی تھا، نازو نے اس کی نزکت سے گواہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اگر عدیل ہاشمی یونکی ہر ایک سے نکاح کرنے کے لئے تو وہی میں آدھے سے زیادہ لڑکیاں اس کی بیویاں ہوں۔“ اس نے اپنی بات کا خود کو بخارا رہ لیا تھا۔

”میرا تو خیال تھا کہ آپ کو سب کچھ پتہ ہو گا، لیکن آپ تو مجھے ناظم لگتی ہیں، چلیں آئیں میں آپ کو آپ کی آنکھوں سے دکھا دوں، میری زبان پر تو شاید آپ کو یقین نہ آئے۔“ اس نے نازو کا ہاتھ پکڑ کے اسے اٹھایا۔

کچھ ایسا ایقان و اطمینان ضرور تھا اس کے لہجہ میں جس نے نازو کے دل کو گویا اتھاہ پر گھرائیوں میں گرا دیا تھا، لیکن پھر بھی وہ اپنا اعتماد جمع کر لی اس کے پیچھے چل پڑی۔

اس کمرے کے باہر ایک چھوٹا سا لان تھا، جس میں خوبصورت اور قیمتی پھول لگے ہوئے تھے، ان کو عبور کر کے ایک تنگ سی راہداری تھی جس کے آخری کونے پر ایک بڑا سا کمرہ تھا، جس کا دروازہ دوسری طرف کھلتا تھا، البتہ اس کمرے میں ایک کھڑکی راہداری میں کھلتی تھی، کھڑکی کا ایک پٹ وا تھا اور دوسرا بند تھا، اندر سے لی جلی آوازیں آرہی تھیں، ریشم نے پہلے خود دیکھ کر اپنی

تصدیق کی تھی، پھر نازو کا ہاتھ کھینچ کے اسے کھڑکی کے آگے کر دیا اندر کا منظر دیکھ کر زمین و آسمان نازو کی آنکھوں میں گھوم گئے تھے۔

عدیل ہاشمی، سکندر اور میری تینوں کمرے میں موجود تھے، ان کے سامنے ٹیبل پر گلاسوں میں غالباً و سکی تھی، وہ تینوں نہایت خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہے تھے۔

”یہ عدیل! ایک بات تو ماننے کی ہے، نازو جیسا میرا پہلی دفعہ ہمارے ہاتھ لگا ہے، اگر نازو ہمیں نہ ملتی تو حسنا راؤ یقیناً مہ جبین بائی کے پاس ہی جاتا اور یوں اچھی بھلی سونے کی چڑیا ہمارے ہاتھ سے از جالی۔“ یہ سکندر تھا، و سکی کا ایک بڑا سا ٹھونٹ لیتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو مخاطب کیا تھا۔

”سچ کہتے ہو، کیا قیامت لڑکی ہے پار میت پوچھو اس کے ساتھ خلوتوں میں مجھ پر کیا گزرتی رہی ہے، اگر حسنا راؤ کی ڈیمانڈ Intuch لڑکی نہ ہوتی تو میں یقیناً اتنا عابد، زاہد و امح نہ ہوتا۔“ عدیل کی بات پر ان دونوں نے قبضہ بلند کیے تھے۔

نازو کی آنکھیں حیرت و بے یقینی کی شدت سے بچنی کی چھنی رہ گئی تھیں لیکن حقیقت کڑوے سچ کی مانند اس کے سامنے تھی، کیونکہ نہ تو اس کی بصارت دھوکہ کھا رہی تھی اور نہ ہی سماعت۔

”تو تم دونوں کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ایسا ناپاب میرا میں نے ہی ڈھونڈ نکالا تھا۔“ یہ میری تھی جو اس کی ذات کے پر خچے اڑا رہی تھی۔

میری جس پہ اس نے خود سے بڑھ کے اعتماد کیا جس کو وہ اپنی بہترین دوست سمجھتی رہی جس کے مشورے کے بغیر وہ ایک قدم اٹھانا بھی حرام سمجھتی تھی اور میری کو وہ اپنی محسنہ خیال کرنی لگی تھی۔

اور عدیل ہاشمی جو اس کی اولین چاہت تھا،



جس کی سنگت میں وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی، جس کے آگے اسے دنیا کا ہر مرد ہیچ لگتا جس کی خاطر وہ اپنا سب کچھ چھوڑ آئی، اسے نیلام کرنے میں سب سے پیش پیش تو وہی تھا۔

”بھئی ہم تو تمہارے پاؤں دھو کے بیٹے کو تیار ہیں۔“ عدیل ہاشمی نے اس کے گرد اپنے بازو کا حصار قائم کرتے ہوئے اسے خود سے قریب کیا تھا، نازو کو اپنا پورا وجود بلاسٹ سے اڑتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

اسی وقت مرکزی دروازہ کھلا تھا اور مونا دندناتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں کچھ ڈالر کی گڈیاں تھیں، جو آتے ہی اس نے سامنے ٹیبل پہنچ دی تھیں، دو سیاہ گلاس آپس میں ٹکرائے تھے اور دھڑام سے ان کے ٹوٹ کے نیچے گرنے کی آواز آئی تھی۔

”پھر تم تینوں نے مل کے میرے ساتھ گھلا کیا ہے، اس دفعہ پھر مجھے کم رقم ملی ہے، لاسٹ ٹائم بھی یہی ہوا تھا جو ہمارے درمیان طے پایا تھا تم لوگوں نے اسے سے دس فیصد مجھے کم دیا تھا اور اس کا دفعہ پورے بیس فیصد کم ہے۔“ وہ سخت متعجب نظر آ رہی تھی۔

”ارے مونا جان! اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہوتا، تم یہ بھی تو دیکھو ناں تمہارے ایئر لائن کے تمام اخراجات بھی ہم نے پے کیے ہیں۔“ سکندر فوراً اٹھا اور دونوں کندھوں سے اسے تھام کر شانت کرتے ہوئے بولا۔

”کیوں، وہ نازو نام کی بھیک جو تمہیں حسانت راؤ کی طرف سے ملی تھی، جس میں ایئر لائن کے تمام اخراجات بھی شامل ہیں، وہ کیا ہوا میں تحلیل ہو گئی؟ وہ کھاتہ الگ ہے مسٹر سکندر! میں اب اتنی بھی بچی نہیں۔“ اس کے دونوں ہاتھ شفر سے جھٹکتے ہوئے وہ بغیر کسی لحاظ کے بولی۔

”اگرچہ کھاتہ الگ ہے لیکن تم تو کسی بھی

پانی پیسے کے بغیر ہی آئی ہوتاں۔“ اس نے بھی بظاہر ہی محل کا لبادہ اتار پھینکا اور چیخ کے بولا۔

”پیسہ تو تم تینوں میں سے بھی کسی کا نہیں لگا۔“ اس نے سلکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بہر حال بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، ہم تمہیں اس سے زیادہ نہیں بے کر سکتے۔“ عدیل ہاشمی نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے حتیٰ انداز میں کہا، وہ اس طویل پکڑتی بحث سے اکتانے لگا تھا۔

”Its ok لیکن تم لوگ کسی بھول میں مت رہنا کیونکہ میرا نام بھی مونا ہے، مجھے اتنی آسانی سے نہیں نکل سکتے تم لوگ۔“ اس نے نہایت شرر رہا نگاہوں سے انہیں دیکھا اور دھمکی آمیز لہجے میں کہتی تن کرتی وہاں سے نکل گئی۔

ریشم نے اس کا ہاتھ پکڑ کے جیسے کی طرف کھینچا تو وہ جیسے حواس کی دنیا میں لوٹ آئی، اس کا دھواں دھواں چہرہ اور احساس زیاں سے لبریز آنکھیں دیکھ کر ریشم کو اس پر نہایت ترس آیا تھا، وہ اس کے نیم مردہ وجود کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی واپس اسی کمرے میں لے آئی تھی۔

”یہ لیں، پانی پی لیں۔“ اس نے اسے بٹھایا پھر جگ سے پانی کا گلاس بھر کے اس کی طرف بڑھایا۔

ناز و پورا گلاس خالی کر گئی تھی، لیکن اندرونی آگ کی تپش اس کے وجود سے جھٹے جا رہی تھی، اس کا پورا وجود کسی بھانپڑ کی مانند جل رہا تھا، اسے مونا کی طنزیہ نگاہوں کا مفہوم اب سمجھ میں آیا تھا۔

”کیا میری نے آپ کو کسی بھی بات کے متعلق آگاہ نہیں کیا تھا؟“ ریشم اس سے پوچھ رہی تھی، اس کا سر خود بخود ہی نفی میں ہلنے لگا۔

”یہ تو ان لوگوں کا بزل ہے نازنین جی! خوبصورت لڑکیاں ڈھونڈنا اور پھر ان کی بولی لگانا، جب تک ان کے جسم میں جان رہتی ہے، انہیں ہر رات اس کا خراج دینا پڑتا ہے۔“ وہ صراحت

لہجے میں بڑے سلکتی سی ہنسی ہنسی، شاید بھی انہی حالات کی ستائی ہوئی تھی۔

”میری کا کام لڑکی تلاش کرنا ہے، عدیل ہاشمی کا کام اسے پانا اور سکندر نے اس کے گاہکوں کو تلاش کرنا، ترتیب آگے پیچھے بھی ہو جاتی ہے۔“ وہ اسے مزید تفصیل بتانے لگی۔

”ریشم! اب آ بھی جاؤ، پہلے ہی تمہاری وجہ سے دیر ہو چکی ہے۔“ ایک لڑکی نے اندر جھانک کر باک ناگواری نظر نازنین پہ ڈالی پھر ریشم سے مخاطب ہوئی۔

”لو کے میں آ رہی ہوں۔“ وہ شاید اسے مزید تفصیلات بھی فراہم کرتی لیکن بلاسنے پہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں میں آپ کو چائے بھیجتی ہوں، کچھ دیر آرام کریں کیونکہ آج رات آپ نے حسانت راؤ کے عالی شان محل میں جانا ہے۔“ وہ اسے آج کے پروگرام سے بھی آگاہ کرتی باہر نکل گئی، جبکہ نازو کو اپنا آپ ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆ وہ اور رمشاہ کن میں ڈر تیار کر رہی تھیں، جب انہیں دھڑام سے کسی زوردار چیز کے گرنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ بھی سنائی دی، وہ دونوں بے حد گھبراہٹ کے عالم میں اپنے پاؤں باہر کی طرف بھاگی تھیں اور یہ دیکھ کر ان دونوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی کہ منزہ میٹھیوں سے نیچے گری تھیں اور ان کے سر سے بری طرح خون بہہ رہا تھا اور وہ خود بے ہوش ہو چکی تھیں۔

”امی جان!“ رمشاہت چیخ مار کے وہیں نیچے بیٹھ گئی اور ان کا خون سے لت پت سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

جبکہ ماما نے بروقت عقل استعمال کرتے ہوئے اوپر صراحت کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی

تھی، دھاڑ سے دروازہ کھول کے وہ اندر داخل ہوئی تو وہ ہیڈفون کانوں سے لگائے کیپیوٹر پر بری طرح بڑی تھا، شاید اسی لئے اس نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔

”صراحت.....!“ وہ بھاگتے ہوئے اس تک پہنچی اور بری طرح اس کا کندھا جھوٹ ڈالا، وہ بے حد چونک کر سامنے متوجہ ہوا اور ماما کے ہوائیاں اڑاتے چہرے کو دیکھ کر اس نے گھبرا کے ہیڈ سیٹ اتار کے دور اچھالا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے تشویش زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

”وہ..... وہ..... نیچے..... تائی امی.....“ آنسوؤں کا پھندا اس کے حلق میں اٹک گیا، وہ اس کی پوری بات سننے بغیر اسے ہاتھ سے دھکیلتا برق رفتاری سے نیچے لپکا، منزہ کو اس حال میں دیکھ کر ایک لمحے کے لئے تو اس کا اپنا دماغ چکرا گیا، لیکن اگلے ہی اپنے حواس کنٹرول کرتا وہ تیزی سے دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتا نیچے لپکا تھا۔

گھر میں موجود سب افراد ان کے گرد جمع ہو چکے تھے، اس نے جلدی سے منزہ کے بے ہوش وجود کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا، پھر وہب سے مخاطب ہوتا باہر کی جانب بھاگا۔

”وہب میرے کمرے سے گاڑی کی چابی لاؤ جلدی۔“

”میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“ وہب کے آتے ہی وہ آنا فانا گاڑی بھاگ لے کر وہ اندر آئی تو رمشاہ اور ہالہ صوفے پہ بیٹھیں زار و قطار رو رہی تھیں۔

”روؤ نہیں اللہ سے دعا کرو، اللہ تعالیٰ ہماری تائی امی کو صحت کاملہ عطا فرمائیں۔“ اس



نے دونوں بہنوں کو تسلی دی، اگرچہ اس کا اپنا دل ڈوبا جا رہا تھا، لیکن اسے خود کو مضبوط بنا کے انہیں سنبھالنا تھا، کیونکہ یہ وقت اللہ پاک کے سامنے رونے کا تھا۔

”چلو اٹھو وضو کر کے آؤ اور صلوٰۃ الجاجت پڑھ کے تائی امی کے لئے دعا مانگو کہ یہی سبق انہوں نے ہمیں سکھایا ہے۔“ اس نے ہدایت کی تو وہ دونوں خاموشی سے اٹھ گئیں۔

ماں نے خود اٹھ کر پہلے فرش پر بہتا خون صاف کیا، پھر تائی ابو اور ابو جان کو اطلاع دی، جو گھر سے باہر تھے، غوری اور منال دو دن پہلے ہی اپنے گھر راولپنڈی گئے تھے فی الحال انہیں اطلاع دے کر اس نے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔

”اللہ پاک تائی امی کو صحت سلامت بھیجیں پھر صائمہ پھوپھو کو اطلاع کر دیں گے۔“ اس نے سوچا اور کھڑی ہو گئی، رمشاہ اور ہالہ نوافل پڑھ رہی تھیں وہ بھی وضو کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

”پترا! یہ نہیں کیا بات ہے آج میرا دل بہت گھبرا رہا ہے تو آج چھٹی کر لے۔“ یہی ہے قراری تھی اس کی ماں کے لئے تھی بے چینی تھی اس کے انداز میں۔

وہ ماں تھی ناں شاید کسی انہونی کا خطرہ انہیں پہلے ہی محسوس ہو گیا تھا۔

دن یاد آیا جب ہانڈی پکاتے وقت اسلم رسوئی میں آ گیا تھا، وہ اپنے حسن کا خراج لینے اس کے سامنے گئی تو کیسے اس نے فوراً نگاہیں جھکالی تھیں، اس وقت اس نے اس کی حرکت کا کتنا مذاق اڑایا تھا، مگر آج اسے اسلم کی قدر پتہ چلی تھی۔

”آہ، سچ تو یہ ہے اسلم! کہ مجھ جیسی نفس کی باری ہوئی لڑکی تم ایسے شریف مرد کے قابل ہی نہیں تھی، میری بے لگام خواہشیں کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرے بے تحاشا حسن کو ہر مرد پر کھے۔“ آج وہ احتساب کے ٹھہرے میں کھڑی تھی۔

”Enjoy your life“ یہ وہ نعرہ تھا جو ہر وقت اس کے لبوں پر رہتا تھا، ایک باحیا اور با کردار عورت کے لئے زندگی کی لطف کو محسوس کرنا یہ تھا کہ وہ خود کو کسی کی امانت سمجھے اور جب یہ امانت حقدار کے پاس پہنچ جائے تو وہ صرف اسی کے ہو کے رہے، یہی وہ بات تھی جو اس کی ماں اسے سمجھانا چاہ رہی تھی۔

”ہاں، کاش وہ میری ماں کی زبان ہی سمجھ جاتی، لیکن جو کسی بڑے کی باتیں مانتے تو پھر حالات انہیں سمجھاتے ہیں، آج جب گردش دوراں نے اسے عدیل باجی کا اصل چہرہ دکھایا تھا تو اسے اسلم کے اندر چھپے کردار کے خزانے کی قدر و منزلت کا احساس ہوا تھا۔“

”اور وہ عدیلہ نقوی کتنی کوشش کی اس نے مجھے سمجھانے کی، لیکن میری آنکھوں پر تو حروص و ہوس کی گہری پٹی بندھ چکی تھی، آج اگر میں یہاں ہوں جہاں آنے سے پہلے ہر عورت مر جانا چاہتی تھی تو اس میں سراسر قصور میرا اپنا ہی ہے، میری منہ زور خواہشات، میرے مچلتے چبڑات، میری بے لگام آرزوئیں، میں چاہتی تھی کہ مجھے چاہا جائے، مجھے سراہا جائے، اب ہر کوئی مجھے سراہے گا، ہر مرد میرے حسن کو خراج تحسین پیش کرے گا، آج سے میرا وجود ہر مرد کے لئے ایک حسین گزرگاہ بن جائے گا، لیکن کوئی مرد بھی میرے

لئے ایک شجر سایہ زاد نہیں بنے گا، اب میں سب کی ہوں گی لیکن میرا کوئی نہیں ہوگا۔“

”کاش، کاش میں اپنے اس حسین چہرے کو آگ لگا سکتی۔“ اپنا حسن جس پر اسے ناز تھا، آج اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے حیزاب میں جھونک دے، جس کے دیاں نے آج اسے یہاں تک پہنچا دیا تھا۔

”اماں! کاش تو اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیتی تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“ وہ ہلکے ہلکے رونے لگی۔

احساس زباں، پچھتاوے، ندامت، ذلت، جرم، شرمندگی، کتنے ہی دھڑکنے لگے ناگ تھے جو بغیر رکے اس کے وجود کو سیل و سیل کرتے جا رہے تھے، چاروں طرف سے اسے ڈس رہے تھے، کوئی جانے پناہ نہیں تھی، نہ ماں کی مشائیت، نہ باپ کی شفقت، نہ چھائی کا سہارا، نہ بہنوں کا آسرا، نہ سہیلیوں کی تسلی، ہر چیز کو تو وہ اپنے ہاتھوں سے برباد کر آئی تھی، ملیا میٹ کر آئی تھی، واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا، وہ ساری کشتیاں جلا کر آئی تھی، اس دلدل کی گہرائی میں نے بے رضا و خوشی خود قدم رکھے تھے انہیں کوئی ہاتھ دینے والا سہارا نہیں تھا۔

”یا اللہ!“ اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی تھی، پتہ نہیں کتنے عرصے بعد یہ مبارک نام اس کے لبوں تک آیا تھا۔

”یا اللہ! مجھے بچالے..... مجھے بچالے.....“

”جھے بچالے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ آج جب ساری دنیا اس کے لئے اندھیر ہو گئی تھی تو اسے وہ ذات نظر آئی تھی جو نظروں سے پوشیدہ مگر رگ جاں سے بھی قریب تھی، وہ بے خود ہو گئی، خود پر ضبط کھو بیٹھی۔

آج اسے پتہ چلا تھا کہ خدا ہے جب کچھ نظر نہیں آتا تو پھر وہی نظر آتا ہے، اسے بھی گھپ اندھیرے میں روشنی کی صرف ایک ہی کرن نظر آ

رہی تھی۔

”اچھا پترا! اللہ تیری حفاظت کرے۔“ اس کے کانوں میں اپنی ماں کے دعائیہ الفاظ گونجنے تو اسے اور شدت سے رونا آنے لگا۔

”یا اللہ! میں بد کردار سہی، گناہوں کی دلدل میں پور پور ڈوب چکی ہوں پر اے میرے رب میری ماں تو باحیا، با کردار اور با عزت عورت ہے تو اس کی دعا کی لاج رکھ لے، مجھے بچالے، مجھے بچالے، مجھے بچالے۔“ ندامت کے آنسو اس کے پورے وجود کو بھگوتے جا رہے تھے۔

اسے یونہی روتے بلکتے فریاد کرتے، مجھے بچالے کا ورد کرتے نجانے کتنی دیر گزر چکی تھی جب دھاڑ سے کمرے کا دروازہ کھلا، اس نے سہم کر دروازے کی سمت دیکھا، مونا نہایت خوفناک تیور لئے اندر داخل ہوئی تھی، نازو کا سانس رک گیا۔

”سمجھتے کیا ہیں یہ اپنے آپ کو ان تینوں (سوئی سی گالی) کو تو میں نے زمین چاٹنے پر مجبور نہ کر دیا تو میرا نام بھی مونا نہیں۔“ وہ غصے سے بھری ہوئی تھی، کمرے کے کارنر میں دھرے اپنے سوٹ کیس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ خود ہی بڑبڑائے جا رہی تھی۔

”اور تم..... تم بھی بچ کے رہنا ان حرام خوروں سے، حسنت راؤ سے کوئی ذاتی تعلق قائم کر لینا اور ان سے جان چھڑا لینا، فائدے میں رہو گی۔“ ڈالرڈ کو سوٹ کیس میں رکھنے کے بعد اس کی نظر نازو کی طرف اٹھی تو نجانے کس رو میں وہ تند لہجے میں اسے بھی مشورے سے نواز گئی، نازو چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی جواب بھی مسلسل ان تینوں کو گالیوں سے نواز رہی تھی۔

”یہ ان کی دشمن بن چکی ہے یقیناً میری مدد کر سکتی ہے۔“ یکدم نازو کے ذہن میں جھمکا کا ہوا۔

”لیکن یہ ہے تو ان ہی کی قبیل سے، میرا



فائدہ اسے کیونکر عزیز ہو سکتا ہے؟“ اگلی سوچ کے آتے ہی مایوسی اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔

”قسمت آزمایا لیتے ہیں اور کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔“ اس نے خود کو حوصلہ دیا اور اپنی ہمت جمع کرتی اٹھ کے مونا کے پاس آگئی۔

”میں یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں آپ میری مدد کر سکتی ہیں؟“ اس نے ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں استفسار کیا تھا۔

”کیا..... آ..... آ.....“ مونا اپنی جگہ سے اچھل کے گھڑی ہوئی تھی اور یوں اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تھا گویا اس کی دماغی حالت پہ شبہ ہو۔

”آتم سیریس مونا!“ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا اپنی بات کی تصدیق کی تھی۔

”نکلنا چاہتی ہو تو کیا یہیں سڑکیں ناچنے آئی تھی۔“ استہزاء یہ کہتے ہوئے اس نے اس کے ساتھ کوچھڑکا۔

”میرا یقین کرو میرے ساتھ انہوں نے دھوکا کیا ہے۔“ اس کے لہجے میں زہر بھر گیا، پھر اس نے مختصر اپنی کہانی اسے سنا ڈالی۔

”اوہ..... آئی سی۔“ مونا نے ”اوہ“ کو خوب سمجھنے کے لمبا کیا۔

”یہ جو میری (گالی) ہے ناں اس کا ہی کام ہے، انٹرنیٹ، ٹیلی فون، بیوی پارلر کا ججز اور جگہ جگہ سے لڑکیاں ڈھونڈنا خیر یہ بتاؤ تم یہاں سے جاؤ گی کہاں؟“ مونا کو اس کی بات پہ یقین آ گیا تھا، اس کی سرخ متورم آنکھیں بھی گواہ تھیں کہ وہ روتی رہی ہے، پھر ایک دم کوئی خیال اس کے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا تھا۔

”بدلہ لینے کا یہ بہترین موقع ہے، پارٹنر شپ تو میں ویسے بھی ختم کر رہی ہوں، کیوں نہ اس ناز کو بھی لے اڑوں، ویسے بھی سونے کی چڑیا ہے، مہ جبین باقی تو اسے پلوں پہ بٹھائے گی

اور حسنا راؤ بھی خود ہی کھینچا چلا آئے گا اور یہ تینوں سر پختے رہ جائیں گے، حسنا راؤ جتنا مہربان ہے اصول کا اتنا ہی پابند ہے، جب نازو اس تک نہیں پہنچے گی تو میرے حصے کا بدلہ بھی وہ ہی ان سے لے گا۔“ اس سوچ کے آتے ہی اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

”جہاں بھی جاؤں گی لیکن ان کے چنگل سے تو نکل جاؤں گی، ایک دفعہ اپنی قسمت تو ضرور آزماؤں گی۔“ نازو کہہ رہی تھی اس کے لہجے میں کچھ کرگزر نے کا پختہ عزم تھا۔

”اوکے، ٹھیک ہے لیکن اگر پکڑی گئی تو میرا نام درمیان میں نہ آئے۔“ مونا اپنا پلان ترتیب دے چکی تھی۔

”تھنک یو سوچ۔“ مارے تشکر کے نازو کی پلکیں بھیگ گئیں اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے کچھ دیر پہلے بہائے گئے ندامت کے آنسو اس کے کام آگئے ہیں، وہ مونا کی ہدایات کو غور سے سننے لگی۔

☆ ☆ ☆  
”میرا تو مانو کسی نے دل منھی میں لے لیا، مجھ سے تو ایک منٹ بھی صبر نہ ہوا میں نے غوری سے کہا بس اٹھو اور تیاری پکڑو۔“ صائمہ پھپھونے سیب کی قاشیں چھیل کر منزہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا، مثال اور غوری بھی ان کے ساتھ ہی آ گئے تھے۔

”حادثہ تو اتنا بڑا نہیں تھا بس بچے ہی زیادہ گھبرا گئے تھے، میں نے منع کیا تھا کہ کسی کو بھی اطلاع نہ کرو، خواہواہ ہی سب پریشان ہو گے۔“ منزہ نقاہت زدہ لہجے میں بولیں۔

شکر تھا کہ بروقت ٹریمنٹ مل جانے کی وجہ سے مسئلہ زیادہ بگڑا نہیں تھا، صالح اور وہب چند گھنٹوں بعد ہی انہیں واپس لے آئے تھے، کوئی اندرونی چوٹ تو نہیں آئی تھی البتہ کمزوری کافی ہو گئی تھی، جسے ختم کرنے کی وہ سب بھرپور جدوجہد

کر رہے تھے، پھل جوس دودھ گشت کچھ نہ کچھ دتا تو قتا نہیں کھلائے جاتے، صالح تو ہر چیز اتنی دافر مقدار میں لے آیا تھا کہ اب فریج اور فریزر دونوں میں ہی مزید گنجائش نہیں تھی۔

”پریشان ہونے والی کیا بات ہے بھابھی! دکھ سکھ میں اپنے ہی تو کام آتے ہیں۔“ سیب کے چھلکے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

”بس میں اب پنڈی نہیں جاؤں گا، مجھے پتہ چل گیا ہے، میرے بعد کوئی بھی ڈھنگ سے آپ ک خیال نہیں رکھتا۔“ ہالہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر غوری جھٹ سے بولا تھا، مقصد صرف اسے سنانا اور چڑانا۔

”اس چا پلوس لومڑی تو بعد میں چٹنی بناؤں گی۔“ ہالہ جو منزہ کے لئے جوس لے کر اندر آ رہی تھی اس کی بات پہ دانت کچکا کے عزم باندھا تھا۔

”ارے بیٹا! سب نے ہی بہت خیال رکھا ہے، بچیوں نے تو اس دن سے نیندیں حرام کر رکھی ہیں، اللہ تعالیٰ سب کو اجر دیں۔“ وہ محبت سے معمور لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔

”لیکن ماما جان! ایک بات تو آپ کی مانی پڑی گی جو آپ کا بیٹا ہے وہ آپ ہی کا بیٹا ہے۔“ اس نے فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں بھئی جو میرا غوری ہے وہ کوئی اور کہاں ہو سکتا ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے بال بگاڑے تھے۔

اس نے جتنی نظروں سے ہالہ کو دیکھا تھا، اس کی زبان میں جھلی تو بہت ہو رہی تھی، لیکن بڑوں کے ادب کی وجہ سے وہ خاموش تھی اور اس بات کا اسے بھی بخوبی اندازہ تھا اسی لئے تو چڑا رہا تھا۔

”امی جان! یہ جوس لیں۔“ ہالہ بظاہر اسے

نظر انداز کرتی اور دل میں بعد میں انتقام لینے کا منصوبہ بناتی، منزہ کو جوس دینے لگی۔

”ماما سے کہو، آج مجھے کوئی سادہ سی سبزی بنا دو، میٹ کھانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا۔“ ہالہ کے ہاتھ سے جوس لیتے ہوئے انہوں نے غوری کو مخاطب کیا تھا۔

”جی اچھا۔“ وہ سر ہلاتا اٹھ گیا۔ ہالہ کچن میں بڑی تھی، صائمہ پھپھو کے ساتھ انکل شہزاد بھی تھے تو کھانے کا اہتمام تو کرنا تھا، رمشاء بھی اس کے ساتھ تھی ہوئی تھی، کل سے وہ کالج بھی نہیں جا رہی تھیں، غوری نے منزہ کا پیغام دیا تو وہ سر اثبات میں ہلانے لگی۔

”میرا خیال ہے گھیا بنا لیتی ہوں تائی امی شوق سے بھی کھاتی ہیں اور صحت کے لئے بھی مفید ہے۔“ وہ رمشاء سے کہنے لگی۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ رمشاء نے اتفاق کیا۔ اسی وقت گاڑی رکھنے کی آواز آئی اور کچھ لمحات بعد صالح لدا پھندا کچن کے دروازے پہ تھا۔

”رمشاء..... ہالہ! یہ سنبھالو۔“ ”میں نے آپ کو منع کیا تھا اب مزید کچھ مت لایئے گا جب تک پہلا ذخیرہ ختم نہ ہو جائے۔“ ماما شاہرز کا ڈھیر دیکھ کر کہے بنا رہ نہ سکی۔

”ابھی تک ختم نہیں ہوا؟“ وہ لہجے میں مصنوعی حیرت سمو کے بولا۔

”یہاں جنات کا سیرا تو نہیں جو اتنی جلدی سب ہڑپ کر جائیں گے۔“ اس نے جھنجھلا کے کہا۔

ایک تو پہلے ہی کچن لدا پڑا تھا اوپر سے پھر اتنا ڈھیر، وہ کہاں رکھتی سنبھالتی۔

”حیرت ہے تم یہ کہہ رہی ہو حالانکہ تمہاری اپنی خوراک کسی جن سے کم نہیں ہے۔“ وہ خود ہی شاہرز اٹھا کر آگے بڑھ کے ٹیبل پہ رکھتے ہوئے



صاف اسے چڑاتے ہوئے بولا۔

”کیا..... آ..... آ۔“ ماہا احتجاجاً جلا اٹھی۔  
”تو اور کیا تم تو کباڑہ کروایا کرو گی میرا۔“  
وہ خود بھی چیخ کر گھسیٹ کے بیٹھ گیا۔

”جی نہیں، یہ آپ کی ظلم خیالی ہے، آپ اپنا دولت بینک سنبھال کے رہیں۔“ وہ تڑاخ کے بولی تھی، صانع کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔  
”توبہ..... آپ تو ابھی سے میاں بیوی کی طرح جھگڑنے لگ گئے ہیں۔“ رمشاء ان کی نوک جو تک سے محفوظ ہوتی صانع کے لئے فریج سے پانی نکالنے لگی، رمشاء کے کمنٹ پہ ماہا کا چہرہ نکت سے سرخ ہو گیا۔

”تم اپنی بولتی بند رکھا کرو، جو منہ میں آتا ہے بولتی جاتی ہو۔“ وہ غصے سے اسی پہ الٹ پڑی۔

”دیکھا..... یہ ابھی سے بھابھی کا رول پلے کرنے لگ گئی ہے۔“ صانع نے حاسد عورتوں کی طرح نکلڑا لگایا تھا، رمشاء بے اختیار ہنس گئی، جبکہ اسے تو اس قدر غصہ آیا کہ وہ پاؤں پختی باہر نکل گئی۔

”سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔“ اپنے کمرے میں گھستے ہوئے وہ غصے سے بڑبڑائی۔  
”ابھی اگر سب کو اس کی اصلیت بتا دوں تو کیا عزت رہ جائے گی۔“ اس نے کھولتے ہوئے دماغ سے سوچا۔

”لیکن ماہا عبد اللہ! اگر یہ شخص اپنی بات سے مکر جائے اور کہے کہ ماہا کو کوئی غلطی لاحق ہو گئی ہے، میں ہی صانع عبد الرحمن ہوں، تو اس گھر میں کتنے افراد ہوں گے جو تمہاری بات کا یقین کریں گے؟ شاید ایک فیصد بھی نہیں۔“ کوئی اس کے اندر سے بولا تھا، وہ ایک دم ٹھٹھک کے رک گئی، کسی تکلیف دہ احساس نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا تھا اس کا دل کسی انہونی کے احساس سے رک رک کے دھڑکا تھا۔

”جیسا رویہ اس کا سب گھر والوں کے ساتھ تھا، وہ کہیں سے بھی ان سے الگ نہیں لگا تھا، جس طرح اس نے منزہ کی دیکھ بھال کی تھی، کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ان کا بیٹا صانع عبد الرحمن نہیں؟ شاید خود منزہ بھی نہیں اور اگر وہ خود بھی اپنی بات سے مکر جاتا تو کون تھا، جو اس کی بات کا اعتبار کرتا؟“ یہ حقیقت پہلی بار اس پہ آشکار ہوئی تھی اور اس کے پورے وجود کو لرزے کے رکھ دیا تھا۔

اسے گزشتہ دنوں کا واقعہ یاد آیا جب منزہ بیڑھیوں سے گر گئی تھیں حالانکہ وہ بے گھر تھیں ہی تھیں اس کے باوجود اس کے قدم خود بخود صانع کے کمرے کی طرف اٹھ گئے تھے، اس کا یہ قدم کس چیز کی نشاندہی کرتا تھا؟ کیا اسے بھی صانع کی درجہ اعتماد تھا؟ کیا اس کے لاشعور میں بھی صانع کی محبت تھی؟ موجودگی؟ ان گنت سوالات اس کی آنکھوں سے گرد چکرانے لگے تو وہ سر تھام کے رہ گئی، آگاہی کا جھوڑ آج اس پہ دھوا ہوا تھا اس سے پہلے وہ اس سے بے خبر اور انجان تھی، یہ ایک پریشانی تھی جس نے اسے آن گھیرا تھا، وہ ایک نئی کشمکش میں پڑ گئی تھی۔

”اس مسئلے کا کوئی حل تو ہونا چاہیے۔“ اس نے تھک ہار کے خود سے کہا تھا، مضطرب وجود کو اب کسی پل قرار نہیں آتا تھا اسے لگتا تھا اگر مزید چند دن اس کی یہی حالت رہی تو عنقریب ہاتھ کسی دن وہ پھٹ جائے گی یا کوئی سائیکو کیس بن جائے گی۔

”اور دونوں صورتوں میں سزا وار تم ہی ہو گے۔“ اس نے مٹھیاں پہنچ کر تصور میں اسے مخاطب کیا اور پھر سوچوں کا تانا بانا بننے لگی۔

☆☆☆

وہ سفید پھولوں سی اک دعا  
میرے ساتھ ساتھ رہی سدا  
یہ اسی کا فیض ہے بارہا

میں بکھر بکھر کے سنور گیا  
”بس تم پریشان مت ہونا جیسا میں نے کہا  
ہے ویسا ہی کرنا، کوئی پریشانی نہیں ہوگی، میں بھی صبح وہاں پہنچ جاؤں گی۔“ مونا نے اسے سارا پلان سمجھا دیا تھا۔

جب انسان کسی کے ساتھ گروہ کی شکل میں کام کرتا ہے تو وہ اپنی انفرادی حیثیت پانے کا لاشعوری طور پر متنی ہوتا ہے اور اس کے لئے سب سے پہلے وہ اپنے حواری تلاش کرتا ہے تاکہ الگ ہونے کی صورت میں وہ ان سے فائدہ اٹھا سکے، اسی طرح مونا نے بھی اس عمارت میں موجود چند لڑکیوں کو نہ صرف اپنے ساتھ ملا رکھا تھا بلکہ وہ خفیہ طور پر انہیں مہ جین بانی کے اڈے پہ بھی پہنچ دیتی تھی، جہاں سے وہ پرائیویٹ طور پر کچھ اضافی رقم کماتی تھیں۔

آج ان میں سے وہ لڑکیاں شاپنگ کے لئے جا رہی تھیں، مونا نے نازو کو اسی گاڑی میں دونوں سیٹوں کے درمیان چھپانا تھا اور خود بھی رہنا تھا تاکہ اس پر کسی کا شک نہ چا سکے، شاپنگ پلازہ کے سامنے the one ہوٹل تھا، جہاں انہوں نے نازو کو اتارنا تھا، مونا نے اسے ایڈریس لکھ دیا تھا وہاں سے وہ نہایت آسانی سے مہ جین بانی کے پاس پہنچ سکتی تھی، خوش قسمتی سے اس کا سوٹ کیس جو وہ پاکستان سے لائی تھی یہیں پڑا تھا، اس نے مونا کے کہنے پر اپنے تمام کاغذات اور نقدی لے لی تھی۔

یقین تو اسے مونا کی ذات پر بھی نہیں تھا مگر وہ اپنے رب کی ذات پر بھروسہ کر کے نکل رہی تھی، نئی الحال وہ یہاں سے نکلنا چاہتی تھی تاکہ حسنا راؤ کے چنگل سے نکل سکے، اس کے بعد اسے کیا کرنا تھا یہ فی الحال اس نے طے نہیں کیا تھا، ابھی تو وہ ایک ہی دعا کر رہی تھی کہ وہ بحفاظت یہاں سے نکل سکے۔

”چلو آؤ۔“ مغرب کے بعد کا اندھیرا پھیل

رہا تھا، تمام اندرونی لائٹس آن ہو چکی تھیں، البتہ بیرونی کچھ لائٹس آن تھیں اور کچھ لڑکیوں کی سستی اور کابلی کی وجہ سے ابھی تک آف تھیں۔

مونا نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تو وہ مونا کی دی گئی کالی چادر کو اچھی طرح لپیٹتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑی، یہ کمرہ نسبتاً الگ تھا اور اس طرف لڑکیاں بھی کم آتی تھیں شاید یہ ”New commmer“ کے لئے مختص تھا، مونا اسے اسی راستے سے لے کر گئی تھی جس راستے سے ریشم نے اسے اس کی زندگی کا بھیا تک ترین منظر دکھایا تھا۔

سامنے پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں، ابھی اس طرف کی لائٹس آن نہیں کی گئی تھیں، اس لئے اندھیرا غالب آ چکا تھا، مونا نے اس کا لاک کھولا، نازو سے جس قدر ہو سکا تھا وہ سیٹوں کے درمیان چھپ گئی تھی۔

”گھبرانا مت، خطرہ نلتے ہی وہ تمہیں سیٹ پہ بٹھا دیں گے، تب تک تم نے سانس بھی احتیاط سے لینا ہے او کے میں اب جا رہی ہوں، لینا اور فضا بس آرہی ہیں۔“ مونا نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا پھر اسی طرح ڈور لاک کر کے دبے قدموں اسی راستے سے واپس ہو گئی۔

پھر واقعی چند لمحات بعد دو لڑکیاں بلند آواز سے آپس میں باتیں کرتیں اور قہقہے لگاتی اسی طرف آرہی تھیں، ان کے پورچ تک پہنچنے سے پہلے یہ پورچ کی تمام لائٹس آن ہو چکی تھیں پورا پورچ روشنی میں نہا گیا جو کیدار بھی گیٹ پہ آگے گھڑا ہو گیا تھا، وہ غالباً کسی کام سے گیا تھا جب مونا اسے گاڑی میں چھپا کے گئی تھی۔

وہ دونوں گاڑی کے قریب پہنچ گئیں، لینا نے لاک کھول کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی، جبکہ فضا باہر کھڑی جو کیدار سے مخاطب تھی۔

”کیسے ہو فضل حسین؟“ ڈور کھولتے ہوئے اس نے خوشدلی سے پوچھا۔



”ٹھک ٹھاک ہوں جی، آپ کی دعائیں ہیں۔“ فضل حسین نے سینہ پھلاتے ہوئے جواب دیا۔

”ہم شاپنگ کے لئے جا رہی ہیں تم کچھ منگو آؤ گے۔“

”سارا کچھ آپ ہی کا ہے جی۔“ اس نے بظاہر کسرتی سے کام لیا۔

فضل حسین کو لڑکیوں سے بات تک کرنے کی اجازت نہ تھی، تاہم جو پرانی اور میسر ہو چکی تھیں وہ خود ہی اس سے بات چیت کر لیتی تھیں، جن میں سے سرفہرست لینا اور فضا تھیں کیونکہ باقی تو اسے عام ملازم سمجھ کر منہ نہیں لگاتی تھیں اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بہت سخت تھا اور بے جا روک ٹوک بہت کرتا تھا، کیونکہ ایسا کرنے کے اسے اوپر سے آرڈر تھے البتہ لینا اور فضا کے معاملے میں وہ کچھ نرم تھا، کیونکہ وہ اکثر اس کے لئے کچھ نہ کچھ خریدتی رہتی تھیں، ویسے بھی چند ایک لڑکیاں تھیں جو اپنی مرضی سے بھی آ جاسکتی تھیں ورنہ جس نے بھی باہر جانا ہوتا اسے مہرین یا اس کی قائم مقام سے اجازت لینا پڑتی تھی۔

”میرا دل تو تمہاری پرانی شرٹس دیکھ دیکھ کر اوب چکا ہے، میں تمہارے لئے کچھ بہی شرٹس لے کر آتی ہوں آج۔“ لینا نے ڈرائیونگ سیٹ سے سر باہر نکالتے ہوئے بلند آواز میں کہا فضا بھی مسکراتے ہوئے بیٹھ چکی تھی۔

نازودم سادھے ان کی باتیں سن رہی تھیں، ریشم نے اسے باتوں کے دوران بتایا تھا۔

”فضل حسین کی نظروں سے چھپ کر تو مکھی بھی اس بلڈنگ سے باہر نہیں جاسکتی۔“

”شاید یہ دونوں اسے باتوں میں لگا کر رام کرنا چاہ رہی ہیں۔“ نازو نے سوچا البتہ اس نے آیت الکرسی کا ورد جاری رکھا تھا۔

”یہ تو آپ کی عنایت ہے جی۔“ فضل

حسین نے مسکراتے ہوئے گیٹ کھولا تھا۔

لینا نے برق رفتاری سے گاڑی کو گیٹ سے نکالتے ہوئے باہر روڑ پہ ڈالا تھا۔

”ٹھینکس گاڈ!“ گاڑی مین روڑ پہ ڈالتے ہوئے لینا نے بے اختیار تشکر بھری سانس خارج کی۔

”شکر ہے بلا ٹلی، مجھے سب سے زیادہ فضل حسین سے ہی خطرہ تھا، کیونکہ بظاہر جتنا سادہ نظر آتا ہے اندر سے اتنا ہی گھٹیا ہے۔“ فضا نے بھی ہلکی پھلکی ہو کر کہا۔

”سنو..... تم اب اوپر بیٹھ جاؤ، لیکن خود کو اچھی طرح کوری کیے رکھو۔“ فضا نے منہ پیچھے کی طرف کر کے اسے مخاطب کیا۔

نازو نے ہدایت پر عمل کیا تھا، اندر سے اس کا دل پوری قوت سے دھڑک رہا تھا وہ چادر جس کو اس نے بے دردی سے اتار پھینکا تھا، آج اس کا سہارا بنی ہوئی تھی، کتنا سمجھایا کرتی تھیں اسے اماں۔

”پتر! دوپٹہ عورتوں کی عزت ہوتا ہے اور عزت سر کے اوپر ہی اچھی لگتی ہے اسے بھی پاؤں میں نہ رولنا۔“

”میری بد بختی کا آغاز تو اسی دن سے شروع ہو گیا تھا جس دن میں نے میری کے کہنے پہ دوپٹہ سر سے اتار رکھا، یہ پہلا اسٹیپ تھا اور ابھی انجام پتہ نہیں کہاں ہوتا ہے۔“ اس کی آنکھوں کے سامنے میری سے پہلی ملاقات کا منظر آ گیا، اس کی آنکھوں میں مرجھیں بھرنے لگیں۔

”یہ لو ڈیر! تمہاری منزل آگئی۔“ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور لینا کی آواز اسے حواس کی دنیا میں کھینچ لائی، اس نے بے حد چونک کر شیشے کے پار دیکھا۔

The one کی نہایت وسیع و عریض اور انتہا درجے خوبصورت عمارت بڑے شان سے کھڑی تھی، لیکن اب ان بلند و بانگ عمارتوں

سے اسے رتی برابر دلچسپی نہیں رہی تھی، بلکہ انہیں دیکھ کر ایک عجیب وحشت اس کے اندر ڈیرہ ڈال رہی تھی۔

”یہاں سے تمہیں نہایت آسانی سے ٹیکسی مل جائے گی، تم مونا کا دیا گیا ایڈریس اسے دکھانا وہ تمہیں مطلوبہ مقام پہ پہنچا دے گا، اگر خطرہ اس قدر زیادہ نہ ہوتا تو ہم خود تمہیں منزل مقصود تک پہنچا دیتے۔“ فضا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”اُس او کے اینڈ تھینک یو میں اب چلی جاؤں گی۔“ اس نے ان سے زیادہ خود کو حوصلہ دیا تھا، اپنے بیگ کو مضبوطی سے تھاما اور نئے سرے سے چادر درست کرتی باہر نکل آئی۔

”او کے وٹش یو گڈ لک۔“ وہ دونوں بھی کار لاک کرتیں شاپنگ پلازے کی طرف بڑھ گئیں، وہ دنیا کی مصروف ترین شاہراہ پر تنہا کھڑی تھی، کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہاں جانا ہے؟ کس سمت کو جانا ہے؟ منزل محض کہاں ہوگی؟

کچھ مل تو وہ گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھتی رہی، وہ ایک دم سے گاؤں سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی، اگرچہ اس نے میری اور عدیل ہاشمی کی سنگت میں خود کو کافی سے زیادہ بہادر اور پراعتماد بنالیا تھا لیکن ابھی تک اس نے جتنے بھی معرکے سر کیے تھے وہ سب میری عدیل ہاشمی کے ساتھ ہی کئے تھے، مگر آج وہ تنہا تھی۔

ایک دفعہ تو اس کا دل چاہا کہ کسی گاڑی کے نیچے آ جائے اور ہمیشہ کے لئے اس قصے کو ہی ختم کر دے لیکن کسی نادیدہ قوت نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔

”خبردار! یہ زندگی خدا کی امانت ہے، کیا تم اپنے آخری سہارے کو بھی ناراض کر دو گی؟“ کوئی اس کے اندر سے بولا تھا۔

اس نے خود کو سنسنا لا دیا اور ایک سست کو چل پڑی، سامنے سے ایک کیپ آئی نظر آئی تھی، وہ جلد ہی اسے روکنے کے لئے آگے کی طرف

دوڑی اس وقت وہ قطعاً بھول چکی تھی کہ یہ پاکستان نہیں ابوظہبی ہے جہاں ٹریفک کے کچھ قوانین ہیں اس کی دوڑ کے نتیجے میں سامنے سے فل اسپید سے آئی گاڑی اس کے عین سر پہ پہنچ چکی تھی گاڑی کی لائٹس نے اس کی آنکھیں چند ہیادیں تھیں، اس نے بھاگ کر دور ہونے کی پوری کوشش کی مگر لیکن اس کے باوجود وہ گاڑی کی سائیڈ سے ٹکرائی تھی، فضا میں ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی تھی اور وہ لہرا کے نیچے گری گئی۔

☆☆☆

منزہ کی طبیعت اب بہت حد تک سنبھل چکی تھی، صائمہ پھپھو اور شہزاد انکل بھی مطمئن ہو کر آج راولپنڈی روانہ ہو گئے تھے، باقی سب بھی اپنے اپنے کام کاج میں لگ گئے تھے، صرف ایک ماہا تھی جو ابھی تک خود کو سنسنا نہیں پائی تھی، سب کا خیال تھا کہ اس نے منزہ کی بیماری کا زیادہ اثر لے لیا ہے بلکہ صائمہ پھپھو تو جاتے ہوئے اسے چھیڑ رہی تھیں۔

”اب پریشانی چھوڑ دو، تمہاری ساس بالکل بھلی چکی ہو گئی ہے۔“ باقی سب دبی دبی ہنسی ہنسنے لگے۔

”ماہا شروع سے ہی مجھ سے بہت زیادہ امیج ہے۔“ منزہ نے فوراً اس کی حمایت کی تھی۔

”ہاں ہاں بھابھی جان! آپ اپنی بہو کی طرف داری نہیں کریں گی تو اور کون کرے گا۔“ صائمہ پھپھو نے فوراً غلڑا لگایا تھا۔

”صالح بھائی بھی کر سکتے ہیں۔“ ہالہ نے لقمہ دیا، محفل زعفران بن گئی۔

”یہ شخص اور اس کا تذکرہ، کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑ دیتے۔“ اس کا اندر کر لانے لگا، لیکن اس کے جذبات سمجھنے والا کوئی نہیں تھا، اس بیچاری یہ کیا بیت رہی ہے وہ کرب کے کن مراحل سے گزر رہی ہے باقی سب تو اس سے بے خبر تھے۔

”بے خبری اتنی بڑی نعمت ہے، کاش میں

117



# وہ اک سایہ شجر

شمینہ شیخ

## ملاحظہ

ایک عورت کپڑے کی پڑی دکان میں گئی جہاں ہزاروں کی تعداد میں سٹے سلائے بوڑے بڑے رکھے تھے وہ دیر تک کپڑوں کو دیکھتی رہی پھر باسی سے بولی۔  
میں آپ کے پاس یہی کچھ ہے؟  
سیل گرل نے مودبانہ جواب دیا۔  
محترمہ میرے بدن کا بھی جوڑا ملاحظہ فرمائیے۔

ماہانے جواب دینے کی بجائے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا، پھر مبینہ انداز میں چلتی ہوئی اس کے عقب سے کھل کر سامنے آئی اور اگلے ہی لمبے صاف کو حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا تھا، وہ عین اس کے قدموں میں بیٹھ چکی تھی۔

مجھ سے مزید امتحان مت لیں پلیز..... میں اب اس بوجھ کو نہیں سہا سکتی، مجھے اس شب و روز کی اذیت سے نجات دلا دیں پلیز..... آپ کو اپنی سب سے محبوب سستی کا واسطہ آپ کو خدا کا واسطہ ہے پلیز..... خدا کے لئے۔  
وہ اس کے قدموں میں بیٹھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگ گئی تھی۔

صالح کے دل کو کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا ماہا کو اس حالت میں دیکھ کر، اس کی حالت ابھی بھرا حالیہ چہرے پہ بھل بھل بیتے آنسو، صالح کے ہر جذبے کو بہالے گئے تھے اس نے بے بسی سے اسے دیکھا اور بالآخر دل کے ہاتھوں ہار مانتے ہوئے اسے اس اذیت سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا اور کسی بارے ہوئے جواری کی طرح ماہا کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔

(باقی اگلے ماہ)

بھی سب کی طرح بے خبر ہوتی۔ اس کے دل نے بے ساختہ خواہش کی تھی، لیکن اب تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا، وقت تو لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔  
”شاید اسی میں کوئی مصلحت خداوندی ہے۔“ اس نے تھک ہار کے سوچا۔

”لیکن کیوں..... ایسا کیوں ہے؟ یہ شخص کیا چاہتا ہے، کتنے بہروپ میں اس کے؟ کیا مقاصد ہیں اس کے..... کیوں کھل کر سامنے نہیں آتا، اندر ہی اندر کون سی گیم کھیل رہا ہے۔“ وہی زہریلی سوچیں ایک مرتبہ پھر اسے ڈسنے لگی تھیں اسے لگا تھا اب کی دفعہ وہ سہا نہیں پاسے گی، اس کے دماغ کی نیس پھٹ جائیں گی اس کے قدم خود بخود صالح کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔

وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا کافی مصروف انداز میں اپنا کام مکمل کر رہا تھا چند فائلیں اس کے سامنے کھلی پڑی تھیں، کچھ ڈیٹا وہ سیو کرتا جا رہا تھا جبکہ کچھ خاص پوائنٹس سامنے دھری فائل پہ اتارتا جا رہا تھا، آفس میں کام کا لوڈ بہت زیادہ تھا اسی لئے وہ کچھ کام گھر میں نمٹا رہا تھا، کیونکہ اگر وہ سارا کام آفس میں کرتا تو لامحالہ اسے آفس سے بہت لیٹ اٹھتا پڑتا اور گھر والوں کا پریشان ہونا یقینی امر تھا۔

اسے دروازہ کھلنے کی آواز تو آئی تھی لیکن وہ اپنے کام میں اس قدر بڑی تھا کہ سر اٹھا کر دیکھنے کا جی وقت نہیں تھا، اپنے کام میں منہمک ہونے کے باوجود اسے اپنے پیچھے کسی کے کھڑے ہونے کا احساس ہوا تھا، یونہی اس نے مصروف سے انداز میں پیچھے مڑ کے دیکھا تو ماہا بالکل اس کے چیر کے پاس کھڑی تھی، اس کے چہرے کے تاثرات اتنے ناقابل فہم تھے کہ وہ ایک دم ٹھٹھک کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”ماہا..... تم..... خیریت؟“ وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس سے پوچھنے لگا۔



رات کے تقریباً دس بج چکے تھے رات پوری طرح اپنا فیسوں پھیلا چکی تھی سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی میں جس ٹیکسی میں سوار ہو کر علامہ اقبال انرپورٹ کی طرف جا رہا تھا اس کا ڈرائیور ایک پٹھان تھا اس نے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا تو رحیم شاہ کی خوبصورت آواز ماحول میں اترتی محسوس ہو رہی تھی اور گانے کے الفاظ ماں کی ممتا میں گندھے دل پر بارش کی طرح برس رہے تھے۔

او ماں جھولا جھلاؤ ری میں جو بظاہر بڑا خوش خوش اور پر جوش انرپورٹ جا رہا تھا دل کے کونے میں کہیں چھوٹی سی ایک خلش باقی تھی کہ میں اپنے دیرینہ خواب کے پورا ہونے پر بھی ممل خوشی محسوس نہیں کر پا رہا تھا میری روح اندر کہیں آنسو بہا رہی تھی آرزو کے پورا ہونے پر جو سرشاری ملتی ہے اس کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا کیونکہ وقت رخصت میری ماں کی دعا میں میری ہم سفر نہیں تھیں بلکہ ان کی خاموش نظروں کے آنسو میرے زادراہ بنے تھے اور اب اس کلام نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی کہ دفعتاً ڈرائیور کے موبائل کی بپ بجی تھی اس نے ٹیکسی سڑک کے ایک طرف روکی اور موبائل پر بات سننے لگا ساتھ ہی اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوتے گئے۔

”صاحب جی! ایک پرابلم ہو گیا ہے۔“ وہ التجائی انداز میں گویا ہوا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ میں نے بھی استفسار کیا، تو وہ بتانے لگا۔

بچے کی میری فلائٹ ہے پہلے مجھے چھوڑ دو پھر ہوسپتال چلے جانا۔“ اپنے لہجے کے کٹھن پن پر میں بھی حیران ہو رہا تھا۔

”نہیں صاحب جی! آپ کو چھوڑنے پر کافی وقت لگ جائے گا ہم پر رحم کرو ہماری ماں کو ہماری بہت ضرورت ہے، آپ ہمیں جانے دو ورنہ ہماری جنت ہم سے روٹھ جائے گی، ہمیں ہماری جنت کے پاس جانے دو صاحب جی!“ چونکہ ہم ٹیکسی سے باہر نکل آئے تھے تو روتے روتے میرے پاؤں میں بیٹھ گیا، میں جلدی سے پیچھے ہو گیا۔

”ام..... آپ سے ایک آنہ بھی نہ لے گا ہم کو جانے دو صاحب۔“ وہ مسلسل گڑگڑا رہا تھا اور میں جو گزشتہ ایک مہینے سے الجھا ہوا تھا مومن کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سوال داغ دیا۔

”اگر میں تمہیں پچاس ہزار روپے دوں اور کہوں کہ تم اس وقت مجھے انرپورٹ چھوڑ آؤ تو تم کیا کرو گے۔“ میرے سوال پر اس نے تڑپ کر سر اوپر اٹھایا ہم ساری دنیا کی دولت کولات مار دے گا لیکن اپنی ماں کے پاس ضرور جائے گا۔

”ام..... اپنی ماں اپنی جنت کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔“ وہ بڑا پر جوش ہو رہا تھا لہجہ بھی مستحکم تھا پھر وہ چلا گیا میں نے اسے نہیں روکا کیونکہ مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا، میں کتنا بد نصیب تھا کہ اپنی جنت کو چھوڑ کر سیات سمندر دور جا رہا تھا ابھی پچھلے مہینے کی بات تھی میں نے ضرورت رشتہ کا ایک اشتہار بڑھا تھا، امریکہ میں مقیم ایک پاکستانی ٹیلی کی لڑکی کے لئے پاکستانی لڑکا درکار ہے اور جو ڈیمائڈز انہوں نے اخبار میں لکھی تھیں ان پر میں پورا اترتا تھا، اس سارے اشتہار میں مجھے جو ایک بات اچھی لگی وہ یہ تھی کہ لڑکی اکلوتی ہے اور ساری جائیداد کی تنہا وارث ہے یہ اشتہار پڑھ کر میرے دل میں ایک خیال

جاگا تھا کیوں نہ میں اس لڑکی سے شادی کر کے اس غربت اور مفلسی سے نجات حاصل کر لوں سو جلدی سے ماں کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو وہ غصے میں آ گئیں۔

”رائع! کیا کہہ رہے ہو تم یہ قطعی ممکن نہیں پاگل ہو گئے ہو۔“

”لیکن ماں! یہ میرے مستقبل کا سوال ہے۔“

”میری زندگی کا سوال ہے۔“ ماں کے لہجے میں لرزش تھی۔

”میں یوں گھٹ گھٹ کر نہیں جی سکتا تڑپتی سسکتی زندگی آخر کب تک گزاروں، وہاں ایک روشن مستقبل میرا منتظر ہے کب تک آپ نوکری کریں گی اور میں.....“ میں ہوا میں مکالمہ کر رہا گیا۔

”دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی بیٹا! زندگی تو محبتیں بانٹنے کا نام ہے رشتے نبھانے کا نام ہے تم صرف چار سال کے تھے جب تمہارے بابا ابدی سفر پہ چلے گئے اور پھر میں نے تنہا ڈٹ کر حالات اور دنیا کا مقابلہ کیا اور تنہائی کے جہنم میں اک عمر بتادی، تمہارے روشن مستقبل اور تعلیم کی خاطر میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر محنت کی تو اب تم مجھے تنہا چھوڑ کر جانے کی بات کرتے ہو، میں نے جس پودے کو خون جگر سے آبیاری کی مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ میں ذرا سی دیر کو اس کی چھاؤں تلے ستالوں اپنی ٹھکن اتار لوں اپنے زخم وجود پر اس کے سائے کا نرم لمس محسوس نہ کروں کیا مجھے اس پر فخر کرنے کا کوئی حق نہیں ابھی تو میری ہتھیلیوں پر ان چھالوں کے نشان باقی ہیں راج کہ میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر محنت کی گی۔“

”یہی..... یہی کہتا ہوں میں، ساری حیات آپ نے حالات کے ریگزاروں میں تنہا مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے گزار دی اب اللہ

نے موقع دیا ہے تو کیوں نہ فائدہ اٹھائیں یہ ڈگری میرے کس کام کی اماں اگر میں آپ کو سکون فراہم نہ کر سکوں وہ گرم لوزدہ دوپہریں یاد کریں کیسے کیسے گرم ہوا کے پھیپھڑوں میں جھلسا کرتی تھیں انرکنڈیشنز کی ٹھنڈک کو ترستی تھی جب دو کمروں کے مکان میں محض اس لئے نیند نہ آتی تھی کہ کراہہ ادا نہ کرنے پر مالک مکان گھر خالی کرنے کا نوٹس نہ دے دے میں جانتا ہوں آپ نے میرے لئے صرف میری خاطر اتنے سال کی آبلہ پانی سہی اب آپ کی مسافت آسان کرنا چاہتا ہوں اماں۔“ میں ان کے قدموں میں بیٹھ گیا، انہیں ہزار دلیلیں دیں لیکن وہ مان کے نہ دے رہی تھیں وہ بہت اداس اور خاموش رہنے لگیں ادھر ہر بات کو پس پشت ڈال کر میں نے امریکہ ان لوگوں سے رابطہ کیا اپنے بارے میں سب بتا دیا اور پھر بہت جلد ہی میرا ویزہ اور پاسپورٹ تیار ہونے والے تھے ایک دن میں گھر آیا تو اماں کی بڑی اچھی سہیلی رابعہ آنٹی آئی ہوئیں تھیں میں انہیں سلام کیا اور اماں نے کہا۔

”رابعہ! تم ہی کچھ اسے سمجھاؤ اس کی آنکھوں پر دولت کی پٹی بندھ چکی ہے اسے کہو دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی تنہائی کے بعد اب میں اس کی جدائی کا عذاب نہیں سہہ سکوں گی۔“ وہ رونے لگیں، میں وہیں ان کے پاس بیٹھ گیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں یقین دلانے لگا۔

”اماں میں وہاں سیٹ ہوتے ہی آپ کو وہاں بلا لوں گا میں بھلا آپ کو تنہا چھوڑ سکتا ہوں آپ کے بغیر میں بھی ایک مٹھی وجود ہوں کچھ نہیں ہوں آپ کے بغیر۔“ میں انہیں بچوں کی طرح بہلا رہا تھا جیسے بھی وہ مجھے بہلایا کرتی تھیں۔

”لیکن میں اپنا آخری وقت اپنی سرزمین اپنے وطن اور اپنے لوگوں میں گزارنا چاہتی ہوں دیار غیر میں نہیں۔“ انہوں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے اٹل لہجے میں کہا۔



”میں وہاں ہوں گا آپ کی کل کائنات۔“  
میں نے ان کا کہا یاد کروایا تھا۔  
”لیکن راقع! بکاؤ بیٹے والدین کے فرمانبردار نہیں ہو سکتے وہاں سے رشتے سچے سہارے نہیں ملتے وہاں کی ساری باتیں سبھی ناطے جھوٹے ہوتے ہیں، وہاں جذبوں بھرے دلوں والے انسان نہیں رو بوٹ بستے ہیں جب تم وہاں جاؤ گے رو بوٹ بن جاؤ گے۔“ ان کا پر اثر لہجہ میرے دل میں اثر تو کر رہا تھا لیکن کئی دوراں نے میری سوچ کے قدموں کو زنجیر کیے ہوئے تھے اسی لئے میں وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تو آنٹی نے کہا۔

”مہر! تم اسے نہ روکو کیونکہ وہ اب نہیں رکے گا تمہیں حوصلہ کرنا ہوگا۔“

”رابع! میرا دل چاہا رہا ہے میں چیخ چیخ کر کہوں کیا مائیں ہی عمر بھر اپنے جسم کے ٹکڑے کرنی رہیں گی کہ اولاد کی تمنا کے آگے خاموشی سے آگ کے دریا سے گزرنے کو تیار ہوں گی کیا اولاد بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کی آخر مائیں بھی تو انسان ہیں کیا عمر بھر ہم دوسروں کی سوئی پر مصلوب ہوتی رہیں گی اولاد جہاں پاؤں رکھے مائیں وہاں اپنا دل رکھ دیتیں ہیں لیکن وہ دھڑکنیں سننا تو کجا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، رابع! میں نے اس کے لئے اپنے راستے میں آنے والی ہر خوشی کو ٹھوکر مار دی کیا میں نے تنہائی کے ان ویرانوں تک پہنچنے کے لئے پاؤں لہولہاں کیے تھے مجھے اب آرام چاہیے آرام۔“ میری ماں کا سارا وجود سراپا احتجاج بنا ہوا تھا اور پھر میں وہاں سے واک آؤٹ کر گیا کہ وہ ہر آنے جانے والے سے ہی کہتی تھیں۔

☆☆☆

اماں کے علاوہ میری زندگی میں ایک اور کردار بھی شامل تھا، وہ بھی ”مڑگان“ وہ مجھے سڑک پر ملی تھی ارے یہ کیا کہہ دیا۔ میرا مطلب

ہے اس دن میں اماں کو ڈاکٹر کے پاس سے دکھا کر گھر لا رہا تھا کہ وہ سنسان علاقے میں بیج سڑک پر بیٹھی تھی، شام ہونے والی تھی اور ایک جوان لڑکی تنہا یوں سڑک پر بیٹھی تھی میں نے اس کے بالکل قریب بریک لگائے تھے۔

”اے میرے خدایا کیا ہوا؟“ اماں اتر کر اس کے قریب چلی آئیں اس نے سر اوپر اٹھایا تو سر سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں جھیل سی آنکھوں میں آنسوؤں کے کنول تیر رہے تھے یکدم مجھے یہی لگا تھا اس کی آنکھیں جھیل جیسی۔

”ارے بیٹا کیا ہوا اتنی سنیاں سڑک پر بیٹھی ہو گیا ہوا؟“ اماں نے بڑی فکر مندی سے پوچھا اور وہ ہم دونوں کو دیکھنے لگی۔

”آنٹی! میں سڑک پر پیدل چل رہی تھی کہ اچانک ایک گاڑی سے ٹکرائی، میں اندھی تھی مادہ گاڑی چلانے والا اللہ جانے لیکن چوٹ مجھے لگ گئی اور وہ گاڑی بھگا لے گیا۔“ وہ دانت پیس کر غصے میں بولی تھی۔

”اچھا چلو ہمارے ساتھ ہم تمہاری مرہم پٹی کروا کر گھر چھوڑ دیں گے۔“ اماں نے بڑی محبت سے پیش کش کی تھی، میری نگاہ اس کی کلائی پر پڑی تھی جہاں چوڑی ٹوٹنے سے زخم نظر آ رہے تھے میں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا تو اس کی جھیل سی آنکھیں ویران نظر آئیں۔

”اپنے گھر کا ایڈریس تو بتاؤ۔“ میں پہلی بار بولا تھا۔  
”کہاں کا ایڈریس بتاؤں جب کوئی گھر نہیں ہے۔“ وہ زہر خند ہنسی ہنس دی تھی، اماں نے کہا پہلے اسے ہسپتال لے جلتے ہیں وہ بنا پس و پیش ہمارے ساتھ چل دی ہسپتال میں پٹی کروا کر میڈیسن لینے کے بعد اس نے بتایا کہ وہ یتیم تھی تو اس کی پرورش ایک یتیم خانے میں ہوئی تھی آج کل ایک فلاحی ادارے میں رہ رہی تھی

لیر بچویشن کرنے کے بعد جاب کی تلاش میں تھی۔  
”کیا تم ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں رہنا پسند کرو گی۔“ اماں کو اس کی معصومیت کچھ زیادہ ہی بھاگتی تھی۔

”لیکن آنٹی! میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتی، پہلے کون سا گھر میں رہنے کی عادی ہوں، آپ بہت اچھی ہیں آپ کا بہت بہت شکریہ میری مدد کرنے کا۔“ کتنی سچی سے بات کرتے کرتے آخر میں مسکرا دی تھی۔

”لیکن مجھے بہت اچھا لگے گا اگر تم میرے ساتھ گھر چلو گی میں تمہیں ”گھر“ سے روشناس کراتا چاہتی ہوں۔“ اماں نے بڑے مان سے کہا تھا۔

”لیکن میرے ادارے والے شاید نہ لے۔“ اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

”چلو ہم لوگ تمہارے ساتھ چلتے ہیں میں خود بات کروں گی۔“ اماں جانے کیوں بضد ہو گئی تھیں۔

”اماں رہنے دیں پھر کبھی سہی۔“ میں نے کٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم چپ رہو۔“ اماں نے مجھے چپ کرادیا تھا اور پھر اماں اسے ایک ہفتے کے لئے اپنے ساتھ لے گئیں پھر اماں اور وہ کام کرتے باتیں کرتی نہ جانتیں کہ میں اماں اپنی بھرپور محبتیں اس پر نچھاور کر رہی تھیں میں نے اکثر اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں اداسی دیکھی تھی ہمارے درمیان پہلے دن والی اجنبیت ہنوز برقرار تھی ایک دن اماں کے سینے سے لگی بے تحاشا رو رہی تھی اماں کی محبتوں پر شکر گزار تھی گھر کیا ہوتا ہے رشتے کیا ہوتے ہیں یہاں آ کر وہ جان پائی تھی اس نے یہی اماں سے کہا تھا اس کے جانے کا دن آپہنچا اماں نے اسے چند خوبصورت سوٹ سی کر دیئے تھے جن میں سے آج ایک پہنا تھا

بلیک اور سی گرین کے امتزاج کا سوٹ تھا شیشے کے سا منے کھڑی وہ بالوں کو تولیے سے خشک کر رہی تھی کہ یکدم میں اماں کو پکارتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

”اوہ..... سوری میں سمجھا اندر اماں ہیں۔“

میں یکدم بوکھلا گیا تھا جبکہ وہ گھبرا کر بیڈ پر پڑا دوپٹہ سر پر اوڑھ چکی تھی، پہلی بار میں نے اس کے لمبے بال دیکھے تھے کمر سے نیچے تک لہراتے بالوں میں پانی بارش کی بوندوں کی طرح ٹپک رہا تھا سادہ سے چہرے پر جھیل سی آنکھوں کو دیکھتا میں پلٹ گیا، مگر دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی تھی اور میرا دل کسی اور ہی ڈگر پر چل نکلا تھا اور وہ شاید اس انجانی سی لڑکی کی جھیل سی آنکھوں میں کھو گیا تھا وہ سارا دن میں بے چین رہا کہاں پورا ہفتہ مجھے اس کا قریب رہنا محسوس نہ ہوا اور کہاں ایک پل میں میری دنیا بدل گئی دل نے فیصلہ دے دیا تھا اور قدم خود بخود اس فیصلے کی طرف داری میں بڑھ رہے تھے اس کے جانے کا وقت قریب آ رہا تھا اور میری بے بسی عروج پر تھی وحید مراد کی طرح میں بھی گانا گانا چاہتا تھا۔

اے ابر کرم آج اتنا برس اتنا برس کہ وہ چاہا نہ سکیں وحید مراد کی مراد تو بر آئی تھی اور غضب کی بارش ہوئی تھی مگر یہاں ایسا کوئی امکان نہیں تھا بلکہ دور دور تک بادلوں کا نام و نشان نہیں تھا کہ اچانک اماں نے مڑدہ جاں سنا دیا۔

”راقع! میرا خیال ہے تم مڑگان کو چھوڑ آؤ میری طبیعت کچھ ناساز ہے۔“ اماں کی بات سن کر مجھے جیسے مفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارنے کا موقع مل رہا تھا اور میں اسے اپنی محبت کے بارے میں بتا دینا چاہتا تھا اسے اپنے پیچھے بایکٹ یہ بٹھائے میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا اور پھر میں اسے باغ جناح لے گیا میں نے سوچا کہ اتنی خوبصورت بات کہنے



کے لئے ماحول بھی خوبصورت ہونا چاہیے۔  
”یہاں کیوں آئے ہیں؟“ وہ پوچھتے ہوئے بولی۔

”آپ رکشیں میں آتا ہوں۔“ وہیں قریب ہی پھولوں کے سج سے میں ایک گلاب کا پھول توڑ لایا تھا اور اسے پیش کر دیا۔  
”کس لئے؟“ وہ حیران ہوئی۔

”کیونکہ آج میری خواہشات کے کچھ نئے عکس نئی دلفریب دنیا وجود میں آئی ہے گویا میری زندگی کے معنی بدل گئے ہیں اور وہ عکس وہ دلفریب دنیا آپ ہیں مڑگان آپ۔“ بالآخر میں نے دل کی بات کہہ دی تھی، وہ حیران تو ہوئی تھی ساتھ ہی جھیل سی آنکھوں میں کنول تیرنے لگے تو وہ رخ پھیر گئی چند لمحے ہمارے درمیان خاموش گزر گئے میرا دل چاہا وہ کنول اپنے ہاتھوں پہ اٹھا لوں اور درد کا سارا بوجھ خود جھیل لوں لیکن میں اپنی سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

”راج! میں پہلے ہی آپ لوگوں کی بے پایاں محبتوں کی قسروں ہو چکی ہوں مزید.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر آنسو صاف کرنے لگی۔

”تو قرض اتار دو۔“ میرے جواب پر اس نے رخ میری طرف موڑ لیا۔

”لیکن میں یہی داماں ہوں بالکل خالی ہاتھ۔“ اس نے خالی ہتھیلیاں میرے سامنے کر دیں۔

”دل تو خالی نہیں ہے محبت سے لبریز چاہتوں سے بھرپور، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے آپ کو ایک یتیم اور لاوارث سے کیا ملے گا۔“ وہ خود ترسی کا شکار ہو چلی تھی۔

”آئندہ سے خود کو یتیم نہ کہنا مڑگان جب یتیم بچہ یا بچی بالغ ہو جائیں تو انہیں یتیم نہیں کہنا چاہیے رہی لاوارث والی بات تو وہ خدا ہے نہ سب کا وارث، نگہبان انسان تو عارضی سہارے ہوتے ہیں وہ ہے ہمیشہ ساتھ رہنے والا اور اگر

تمہارے اندر کوئی ڈر ہے تو میں تمہارا وارث بننا چاہتا ہوں تمہارے جملہ حقوق اپنے نام لکھوا دیا چاہتا ہوں۔“ لگے ہاتھ میں نے اسے پر پوز بھی کر دیا اور اپنی اس جرأت پہ حیران بھی تھا یہ زندگی بھر کے فیصلے یوں مل بھر میں نہیں ہوتے وہ کس خدشہ کے تحت بولی تھی۔

”فیصلہ جتنا بھی سوچ سمجھ کر کیا جائے کون جانے کل کیا ہونے والا ہے ہم اس فیصلے پر عمل درآمد کر بھی یا نہیں گے یا نہیں کیونکہ اصل حقیقت سے تو وہ ہمارا حقیقی وارث آگاہ ہے اس لئے جس وقت جو کام سچ لگے کر لینا چاہیے اور ہاں نہیں میرا تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا میرا وعدہ ہے میں تمہیں ایک بہت ہی آسودہ اور بھرپور زندگی دوں گا۔“ اس شام میں نے اسے قائل کر کے ہی دم لیا تھا اور پھر وہ رونی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی مجھے وہ شام بہت دلکش لگی کیونکہ اس سرمنی شام میں ایک منظر مڑگان کی رونی ہنسی مسکراہٹ کا بھی شامل ہو گیا تھا۔

میں نے اماں کو بھی بتا دیا تھا انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا پھر مڑگان بھی ابھار اماں سے ملنے آنے لگی تو میری آنکھیں بھی سیراب ہو جاتیں میں چاہتا تھا جلد از جلد مجھے کوئی جاب مل جائے دو سال ہو چلے تھے لیکن اب کچھ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا میری بے بسی عروج پر تھی میں جلد از جلد مڑگان کو اپنے گھر لانا چاہتا تھا اور اماں جس نے ساری عمر حالات کے صحرا میں جدوجہد کرتے گزار دی تھی آسودگی اور اطمینان ان کا بھی حق تھا اب میں تھک گیا تھا مڑگان کو جاب مل گئی تھی اور ادارے والے اس کی شادی کرنا چاہتے تھے یہ بات میرے دل پہ کاری ضرب لگ گئی اماں نے بڑی تسلیاں دیں لیکن میری تشفی نہ ہوئی اتنا ہوا کہ اماں کی تسلی سے ایک بار پھر میں نے ایک ملٹی پلشل مہتی میں اپلائی کر دیا تھا انٹر ویو بھی دے دیا تھا مگر کئی دن ہوئے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو

میری رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی اس دوران میں نے اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار بڑھا تو دماغ ایک نئی ڈگر پر چلنے لگا مڑگان کو خبر ملی تو اس کا فون آ گیا۔

”راج! کیا کر رہے ہو؟“  
”مجھے جو سچ لگا وہی کر رہا ہوں۔“ میں نے کٹھور پن سے جواب دیا اور فون بند کر دیا مجھے احساس تھا اس وقت مڑگان کی حالت کیا ہوگی مگر زندگی کی تلخ حقیقتوں سے انحراف بھی تو نہیں برتا جاسکتا تھا میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا مجھ سے شادی کی صورت میں اسے کیا ملنے والا تھا، غربت، پلس، افلاس، غربت، افلاس، محرومیاں صرف محرومیاں اماں نے جی جان سے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔

”بیٹے! محنت بھی رائیگاں نہیں جاتی تم کوشش کرتے رہو اللہ مسبب الاسباب ہے وہ ضرور کوئی نہ کوئی سبب پیدا کرے گا۔“ اماں کی کسی بات پر میں کان دھرنے والا نہیں تھا اور اپنے فیصلے پر عمل درآمد کر کے ہی دم لیا اماں نے مڑگان کے حوالے سے مجھے بہت روکنے کی کوشش کی مگر میں بس سے مس نہ ہوا اور پھر کل آخری بار میں اسے ملنے گیا اور اسے لے کر قریبی پارک چلا آیا۔

”راج! تم نے عمر بھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا۔“ وہ بنا تمہید بولی تھی۔

”میں نے بھی کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔“ میں بڑی ڈھٹائی سے مکر گیا تو اس کی جھیل سی آنکھوں میں آنسوؤں کے کنول تیرنے لگے۔

”تم کون سی ترقی کے لئے در بدر ہو رہے ہو یہ خواب بڑے ظالم سوداگر ہوتے ہیں تعبیر کی بڑی قیمت وصول کرتے ہیں اس وقت ہم سمجھ نہیں پاتے لیکن وقت گزرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ہم تو لت پکے۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

”تم بھی تو خوابوں کی سوداگری کر رہی ہو خود کو رہن رکھ رہی ہو خدا را لوٹ جاؤ مڑگان ایک تم اور ایک میری ماں تم لوگ میرے پاؤں کی زنجیر کیوں بن رہی ہو۔“ میں جیسے بے بسی سے بولا۔

”تم امریکہ جانا چاہتے ہو امریکہ میں لاکھوں ڈالر کمانے والوں کی آنکھوں میں جھانک کر ضرور دیکھنا وہاں تمہیں ایک پیاس ایک تلاش نظر آئے گی یہ تلاش کھوئے ہوئے رشتوں اور ان چاہتوں کی ہوتی ہے ایک بار زمانے کی بھیڑ میں گم ہو جائیں تو دوبارہ ملنا بہت مشکل ہوتے ہیں۔“ وہ مجھے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی تاریک شام کی گہری سوچ میں گم تھی نیلا آسمان اس کی مانند کچھ خفا خفا سادکھائی دے رہا تھا۔

”کیا تم مجھے بھلا نہیں سکتی ہو۔“ میں دو ٹوک کہا تھا۔

”نہیں۔“ اس نے اسی تیزی سے جواب دیا تھا جس تیزی سے سوال ہوا تھا۔

”کیونکہ میری زندگی کے ہر پل کا محور تم ہو ارے میں تو بھول گئی تھی تمہیں بھلا مجھ سے کیا حاصل ہوگا۔“

”بس دکھ تو یہ ہے کہ میں محبت کے بازار میں بہت بے مول بنی ہوں اس وقت بھی بولی تم نے لگائی تھی آج بھی مجھے نیلام کرنے والے تم ہو۔“ اس کے لفظ اس کا لہجہ اس کی آنکھیں اس کا سارا وجود اپنے بے مول ہونے پہ رو رہا تھا وہ مجھے کمزور کرنا چاہتی تھی مگر میں نے اپنے اوپر بے حسی کا خول چڑھالیا تھا وہ روتے روتے اچانک رک گئی۔

”کیا تم رک نہیں سکتے میری خاطر، میری محبت کی خاطر، کیا تم میرے خوابوں کو ٹوٹنے سے بچا سکتے ہو۔“ اس نے کسی امید کے تحت پوچھا تھا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا پھر وہ چپ ہو گئی اس



کی جھیل سی آنکھیں بھی ساکت ہو گئیں چند پل وہ میرے چہرے سے کچھ تلاش کرتی رہی پھر خاموشی سے چلی گی اس وقت وہ مجھے بہت مضمحل اور اداس دکھائی دی بالکل پاسکل کی طرح ہاں پاسکل مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے ”پیار کا سلاشیر“ کی پاسکل جس نے سنان کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر وہ اسے چھوڑ کر اپنے ملک واپس چلا آیا تھا اور میں اسے چھوڑ کر دوسرے ملک جا رہا تھا، پاسکل اور مرثگان میں مجھے کوئی فرق نظر نہ آیا ”جدائی“ ہی خود مشترک تھی ان میں اور بے کسی میں سنان اور میں ایک جیسے نکلے تھے۔

”کیا محبت کے معاملے میں مرد ہر دور میں ظالم رہا ہے۔“ میں نے خود سے سوال کیا تھا وہ مرد چاہے بیٹا ہو یا محبوب، مگر مرثگان نے آخری وقت میں مجھے توڑ دیا تھا میں خود بخود کھل گیا تھا رات ہونے والی تھی میں نے اپنا سامان پیک کیا، بیک بند کرنے سے قبل کمرے میں ایک طائرانہ نظر ڈالی کہیں کوئی چیز نہ رہ گئی ہو۔

”راح! تم نے وعدہ کیا تھا۔“ قریب سے اس کا لہجہ گونجا تھا۔

میں چاروں طرف دیکھنے لگا تو ہر دیوار پر مجھے جھیل سی مضمحل نگاہیں دکھائی دے رہی تھیں اور پھر میں نے اپنی جیب سے رومال نکالا آنسو پونچھے اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا باہر نکلا اس کے سوالیہ آنکھیں میری روح کو چھید رہی تھیں میں اس کی بے یار محبت کو ٹھوکر مار کر اس کی دنیا اجاڑ کر بہت دور جا رہا تھا میں نے اس کی محبت کو بھی بے حمیت کر دیا اور اپنی ماں..... یہ خیال آتے ہی میں دوڑ کر اپنی ماں کے کمرے میں پہنچا تھا وہ پلنگ پر لیٹی اپنا دایاں بازو آنکھوں پر رکھے بے آواز رو رہی تھی، میں آگے بڑھا اور ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”اماں کیا اپنے بیٹے کو خوشی خوشی رخصت

نہیں کریں گی۔“ میرے کہنے پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”راح! تم بہت بڑی بھول کر رہے ہو یہ نہ ہو کہ بعد میں زندگی بھر ہمیں پچھتانا پڑے۔“ وہ اس پل بہت آرزو دکھائی دے رہی تھیں۔

”لیکن اماں آپ بھی تو میری بات نہیں سمجھ رہیں۔“ میں بے بسی سے بولا۔

”راح! کیا جیون بھر کا بن باس میں نے اس لئے کاٹا تھا کہ ایک دن تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔“

”اماں! لوگ مر بھی تو جاتے ہیں ان کے بغیر بھی تو لوگ جیتے ہیں میں تو دوسرے ملک جا رہا ہوں آپ کو اپنے پاس بلوا لوں گا اور ملنے بھی آتا رہوں گا۔“ میرا لہجہ تھوڑا تیز ہو گیا۔

”ہاں موت بالکل ایک قدرتی حادثہ ہوتی ہے جو دکھ ہمیں قدرت کی طرف سے ملیں ان یہ صبر آ ہی جاتا ہے مگر اپنے جیسے انسانوں کی طرف سے دیئے جانے والے دکھوں پہ صبر کہاں آتا ہے راح اور پھر اولاد کی جدائی کا دکھ تم نہیں جان پاؤ گے۔“ میں کانوں میں بے کسی کی انگلیاں ٹھونسے گھر سے نکل آیا تھا، لیکن راستے میں جو کچھ ہوا مجھے بدلنے میں ایک لمحہ لگا، حالات کی لمبائیوں سے بھی فرار ممکن نہیں، میرے اندر کتنی دیر ٹوٹ پھوٹ جاری رہی اور میں لاہور کی سڑکوں پر بے مقصد پھر تار ہا کیونکہ میں نے امریکہ کے حوالے سے بہت سے خواب بن لیے تھے جن کے ٹوٹنے پہ درد تو لازمی اٹھنا تھا، میں رات کے دو بجے گھر لوٹا تو اماں جاگ رہی تھیں ڈور بیل یہ فوراً سے پیشتر انہوں نے دروازہ کھولا تھا اور مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک حیران سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

”اماں! میں آپ کے پاس لوٹ آیا ہوں۔“ کہہ کر میں اماں سے لپٹ گیا مجھے لگا جیسے برسوں کی جدائی کے بعد میں اماں سے ملا

ہوں اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ان کے چہرے پر عجب سی روشنی کا پالہ بن گیا جیسے کسی ملک کو فتح کرنے کے بعد فوج کے چہرے پر جو فتح کی روشنی ہوتی ہے اور ان کی کل دنیا میں تھا انہوں نے اپنی دنیا فتح کر لی تھی۔

☆☆☆

رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے صبح دیر سے آنکھ کھلی ایک بھر پور نیند لینے کے بعد میرے دل و ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا میں نے ناٹم دیکھا مرثگان آٹس جا چکی ہوگی یہی سوچ کر میں تیار ہو کر اماں کو بتا کر اس کے آٹس چلا گیا میں وزٹنگ روم میں محو انتظار تھا کہ وہ چلی آئی اس کا سوگوار سراپا غضب ڈھا رہا تھا وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹھکی ضرور کرے گی مجھے لگا اسے میری واپسی کی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔

”مرثگان میں لوٹ آیا ہوں۔“ میں نے اس پہ اپنے جذبے عیاں کرنے چاہے لیکن شاید اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

”راح!“ وہ بڑے کرب سے بولی تھی، اتنے میں مرثگان کی کوئی مٹھائی کا ڈبہ لے کر ہاتھ میں پکڑے چلی آئی اور میرے آگے کر دی۔

”یہ کس خوشی میں۔“ میں نے پھینکی مسکراہٹ سے کہا۔

”کیا آپ نہیں جانتے۔“ حیرانگی سے اس کی آنکھیں جھیل گئیں۔

”کیا؟“ میں تذبذب کا شکار ہوا۔

”بھئی مرثگان حیدر کا آج صبح ہی تو اس کا رشتہ طے ہوا ہے۔“ وہ اپنی ہی دھن میں بتا کر چلی گئی تھی لیکن میرے سر پر سہاتوں آسمان آ کر گرے تھے بس دیوار جاں نہ ٹوٹی تھی مجھے لگا میں کبھی بول نہ پاؤں گا میں اپنی تمام خواہشوں کو پاؤں تلے روند کر اس کی آرزو کا ہاتھ تھام کر اس تک چلا آیا تھا ایک دم میرے اندر صدیوں کی ٹھکن اتر آئی، میرا جتنا تکلیف دہ تھا میری واپسی اس سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہوئی تھی

”مرثگان یہ غلط ہے“ میں نے اپنی تمام ہمتیں مجتمع کر کے کہا۔

”کیا غلط ہے مجھے چھوڑ کر آپ کا چلے جانا یا مجھے زندہ رہنے کے لئے خوشیوں بھرے راستے کا انتخاب کرنا۔“ وہ بڑے سکون سے بولی تھی۔

”کیا کسی کو اتنا جلدی بھولا جاسکتا ہے۔“ اس کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں اپنا عکس تلاش کرنا چاہا تو وہ نظریں جھکا گئی۔

”آپ کی مثال میرے سامنے ہے۔“ وہ جیسے ہٹ دھرمی سے بولی۔

اتنے میں اس کی وہی کوئی پھر آ گئی۔

”ارے راح حیدر کیا تم انگوٹھی نہیں لائے کیا انگوٹھی کے بغیر مکئی کا مزا آتا ہے۔“ اس نے حیران ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“

”جتنا آپ نے ہماری مرثگان کو ستایا ہے یہ سزا اس سے نہیں کم ہے راح حیدر۔“ اس نے حیدر پر زور دیا اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور لہجے کے ہزاروں حصے میں ان کی شرارت سمجھ گیا۔

”تمہیں کس نے بتایا مرثگان حیدر۔“ راح حیدر کی واپسی کا میں نے خوشی سے پوچھا۔

”آئی نے مجھے رات کو ہی بتا دیا تھا۔“

”تم نے تو میری جان نکال دی تھی۔“ میں بات سمجھ کر بولا۔

”میں نے تو ایک جھٹکے میں جان خلاصی کر دی مگر تم نے پورے ایک ماہ مجھے سولی پر لٹکائے رکھا۔“ اس کی جھیل سی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

”اس لئے تو ہر جانہ ادا کرنے واپس لوٹ آیا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ شرما گئی اور اس پورے منظر میں اس کی مسکراہٹ کے جلت رنگ بج اٹھے۔

☆☆☆



## صبح امید شام وصال

ہما عامر

”میں یہ ممکن نہیں کروں گی۔“ اس نے تائی جی کا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے دھکیلا، جس میں انہوں نے ڈائمنڈ کی انگلی تھام رکھی تھی، کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا، اگر سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز صاف سنائی دیتی، ہر نفس خاموش ہو گیا تھا، سائرہ نے خود کو گرنے سے بچانے کے لئے دیوار کا سہارا لیا تھا، آصف نے انہیں بے حد ہمدردی سے دیکھا، تائی جی کا رنگ فق ہو گیا تھا، اس قدر بے عزتی انہوں نے پوری زندگی میں نہیں سہی

ناولٹ

سرگوشیاں سنائی دینے لگیں، مگر وہ بے نیاز بنی اپنے کمرے میں آگئی، کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر کے وہ آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی، دھانی رنگ کے کامدار سوٹ میں اس کی خوبصورتی آئینے کو بھی حیران کر رہی تھی، مہارت سے کئے گئے میک اپ نے اس کے نقوش کو مزید اجاگر کر دیا تھا، وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی، منظر جب دھندلانے لگا تب اسے معلوم ہوا کہ اس کی آنکھیں پانیوں سے لبالب بھر گئیں ہیں، اس نے دوپٹہ نوچ کر صوفے پر پھینک دیا، کچھ دیر پہلے کا منظر پھر سے اس کی سوچوں میں آرکا، جب وہ دلہن بنی صوفے پر بیٹھی تھی، باصفہ اور تایا جی کی صفہ اس کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں، وہ دونوں باتوں میں مگن تھیں، جبکہ سوہیرا کی نظر میں اپنی حنا رنگ ہتھیلیوں پر تھی، جب اسے طاہرہ آغی کی





آواز سنائی دی۔

”بڑی سمجھداری سے کام لیا ہے سائرہ نے، تب جا کر سوہیرا منگنی کے لئے راضی ہوئی ہے، آپ تو سوہیرا کے مزاج سے واقف ہیں بھابی، کتنی ضدی ہے وہ، سائرہ کی ہر بات سے اختلاف کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے، سائرہ نے اشہد کے ساتھ مل کر ایسا ظاہر کیا کہ جیسے اشہد اس کے بجائے ماصفہ سے رشتہ کرنا چاہتا ہے اور سائرہ کی خواہش بھی یہی ہے، بس پھر اس نے از خود اشہد میں دلچسپی لینا شروع کر دی، اشہد تو آیا ہی اس کے لئے تھا، سو اسی کے ایما پر سوہیرا کی تانی نے رشتے کی بات کی جسے حسن اور سائرہ نے سوہیرا کی رضا مندی جان کر منگنی کی تاریخ طے کر دی، اس طرح آپ آج سوہیرا کی منگنی کی تقریب میں شریک ہیں۔“ طاہرہ آنٹی مزے لے کر بتا رہی تھیں اور سوہیرا کے تن بدن میں چنگاریاں سی جلنے لگیں تھیں۔

”مما! کیوں کیا آپ نے میرے ساتھ ایسا۔“ وہ ڈرینگ ٹیبل کے پاس بیٹھ کر سسکنے لگی۔ ”لیکن میرے ساتھ تو ایسا ہی ہونا تھا، سوتیلی جو ہوں، آپ نے کب مجھے ماصفہ کی برابری دی ہے رہا اشہد تو اس سے تو کوئی گلہ ہی نہیں۔“ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور پورا وجود جھٹکوں کی زد میں تھا، وہ بدگمانی کی انتہا پر تھی اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، سات سال کی عمر میں اسے پہلی دفعہ ایسا محسوس ہوا کہ ماما ماصفہ کو اس پر ترجیح دیتی تھیں، ماصفہ کو کھانے میں کیا پسند ہے اس کا پسندیدہ پکنک اسپاٹ کون سا ہے، اس کا من پسند ریستورنٹ حتیٰ کہ اس کے من پسند کارٹون کیریکٹرز تک انہیں ازبر تھے، سوہیرا سوچتی رہ جاتی کہ آخر ماما ایسا کیوں کرتی ہیں، لیکن پھر گزرتے وقت کے ساتھ اسے سمجھ آتی گئی اور وہ سائرہ کے ساتھ ساتھ ماصفہ سے بھی بدگمان

ہوتی چلی گئی، اس نے کبھی سائرہ کے دل میں جھانکنے کی کوشش ہی نہیں کی، نہ ہی ماصفہ کے جذبات جاننے کی سعی کی، اپنی الگ ہی دنیا بسالی تھی اس نے، جس میں اس کے ارد گرد بسنے والے اس سے خائف رہتے تھے۔

☆☆☆

”سوہیرا! تم نے میرا بلیک والا شولڈر بیگ دیکھا ہے جو پاپا ملائیشیا سے لائے تھے۔“ ماصفہ اس کے کمرے کے دروازے میں کھڑی بڑی آس سے پوچھ رہی تھی، پاپا کا لایا ہوا بیگ اسے بے حد پسند تھا، عموماً اس کی پسندیدہ چیزیں سوہیرا پہلے ہاتھ رکھ دیتی تھیں اور وہ دل مسوس کر دیتی تھیں، مگر کچھل دفعہ جب پاپا ملائیشیا سے لوٹے تو سوہیرا اپنی دوست کے گاؤں گئی ہوئی تھی اس کی بہن کی شادی میں شریک ہونے کے لئے اور ماصفہ پاپا کے لائے سامان میں سے اپنی پسندیدہ چیزیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی، آج اسے ایک پارٹی میں جانا تھا، لیکن اس کا سیاہ بیگ مل نہیں رہا تھا، سو وہ چارو ناچار سوہیرا سے پوچھنے چلی آئی۔

”مجھے کیا معلوم، میں تو تمہارے روم میں گئی ہی نہیں۔“ اس نے نخوت سے کہا تھا، وہ اس وقت ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ ”ٹھیک ہے، میں پھر سے اپنے روم میں جا کر دیکھتی ہوں۔“ وہ عجلت میں باہر نکل گئی، جبکہ سوہیرا کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، کیونکہ وہ ماصفہ کا بیگ اپنی ایک فرینڈ کو گفٹ کر چکی تھی اور اسے اس حرکت پر بالکل شرمندہ نہیں تھی، ماصفہ کو جب اپنا پورا کمرہ چھاننے کے باوجود بھی بیگ نہ ملا تو وہ دوسرا بیگ لے کر پارٹی میں چلی گئی، جبکہ سوہیرا چیونگم چباتی ہوئی دل ہی دل میں مسرور ہوتی رہی، اس بات سے بے نیاز کہ ماصفہ کو اپنے پسندیدہ بیگ کی گمشدگی سے کس قدر رنج پہنچا تھا،

تجھی وہ ماما کے روم کے ڈور کا ہینڈل گماتے ہوئے رک گئی، دادی کی آواز نے اسے سن کر دیا تھا۔

”سائرہ مجھے اپنے انتخاب پر فخر ہے، تم نے مجھے مایوس نہیں کیا، بن مای کی نیچی کی جس طرح تم نے پرورش کی ہے وہ لائق تحسین ہے، اس کی محبت پر تم نے اپنی کوکھ سے جنم لینے والی نیچی کو بھی نوبت نہیں دی ہے، تم نے میرا مان نہیں توڑا، روز محشر میں اپنی مرحومہ بہو کے سامنے سرخوردہ ہوں گی۔“ دادی کے لفظوں نے آج اس کے شک پر یقین کی مہر لگا دی تھی، جواب میں ماما نے کیا کہا وہ سن نہیں پائی، ڈولتے قدموں سے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی، ان دنوں وہ فرسٹ ایئر کے ایگزامز کی تیاری میں مصروف تھی، اس انکشاف نے اسے ہلا ڈالا تھا، رات کے کھانے پر بھی وہ گم جم سی تھی، حسن رضا نے اس کی خاموشی کو گہری نظر سے دیکھا۔

”سوہیرا طبیعت تو ٹھیک ہے، اس قدر خاموشی۔“ حسن رضا کے کہنے پر دادی کے ساتھ ساتھ ماصفہ کی بات کا جواب دیتی سائرہ بھی چونک پڑی تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں پاپا، ایگزامز کی ٹینشن ہے۔“ اس نے چاول کی ڈش اٹھاتے ہوئے جواب دیا، ماصفہ نے مڑ کر اسے دیکھا، چاول کی ڈش کی جانب بڑھا ہوا اس کا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا تھا، بس اس دن سے سوہیرا نے اپنا حق جان لیا تھا، ماصفہ سے اس کی ہر پسندیدہ چیز کو چھیننے کا، اس طرح کر کے اس اندرونی مسرت حاصل ہوتی تھی، جبکہ سائرہ اس کی ان کی حرکات سے ذہنی انتشار کا شکار ہوتی تھیں، انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ سوہیرا ان سے بدگمان ہوتی جا رہی ہے، وہ جتنا اس کے نزدیک جانے کی کوشش کرتی تھیں وہ اتنا ہی ان سے دور بھاگتی تھی۔

☆☆☆

”سائرہ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ سوہیرا کا مزاج دن بدن رنج کیوں ہو رہا ہے، ہر بات میں اس کی ضد بڑھتی جا رہی ہے، میں سمجھنے سے قاصر ہوں پر تم اس کی ماں ہو، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے اندر کیا چل رہا ہے۔“ حسن رضا کچھ عرصے سے اس پر گہری نظر رکھنے لگے تھے، سوہیرا ان دنوں ایف ایف ایس سی کے امتحانوں سے فراغت کے بعد دادی کے پاس گاؤں گئی ہوئی تھی، دادی گاؤں میں تانیا جی کی کیمپ کے ساتھ اپنی شاندار حویلی میں رہائش پذیر تھیں، البتہ وقتاً فوقتاً شہر آنا جانا لگا رہتا تھا۔

”حسن میں کیا کروں مجھے خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اس نے اپنے گرد خول چڑھا رکھا ہے، وہ مجھے نزدیک ہی نہیں آنے دیتی، میں کیا کروں حسن میری راتوں کی نیند اڑنے لگی ہے۔“ وہ روہاسی ہوئی حسن رضا نے نشئی کراتے ہوئے کہا۔

”وہ گاؤں سے آجائے پھر میں اس سے بات کرتا ہوں، مسئلہ کیا ہے اس کے ساتھ۔“ وہ پرسوج انداز میں بولے، حسن رضا کو طابعلی کے زمانے سے ہی اپنی خالہ زاد سائرہ پسند تھیں، ان کا ارادہ تھا کہ وہ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنی والدہ کو اپنی پسندیدگی سے آگاہ کریں گے، مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی، اچانک ہی سائرہ کی منگنی اپنے چچے زاد عدیل سے ہو گئی، وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک جا رہا تھا، والدین نے سوچا کہ اسے منگنی کی زنجیر سے باندھ دیں تاکہ اس کی واپسی کا امکان رہے، عدیل منگنی کروا کر انگلینڈ چلا گیا، حسن رضا کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اماں جان نے دیور کی بیٹی فرزانہ سے شادی طے کر دی، وہ خاموش رہے، سائرہ تو یوں بھی اب عدیل کی امانت تھیں، فرزانہ بیاہ کر حسن رضا کے



گھر آگئیں، حسن رضا نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا، حسن کا زیادہ وقت اپنے بزنس کے معاملات کو دیکھتے گزرتا تھا، البتہ وہ فرزانہ کو خوش رکھنے کی بھی پوری کوشش کرتے تھے، وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا، فرزانہ تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی تھیں، حسن رضا بہت خوش تھے لیکن قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا، فرزانہ نے ماصفہ کو جنم دیتے ہی آنکھیں بند کر لیں، حسن رضا کے لئے یہ بہت بڑا سانحہ تھا، وہ مجھ سے گئے تھے، ماصفہ کو سینے سے لگا کر وہ رو پڑتے تھے، اماں جان سے ان کا دکھ دیکھا نہیں جاتا تھا، اماں جان اور بڑی بھابھی شہر میں ان کے پاس ٹھہر رہی تھیں، باقی سب واپس جا چکے تھے، ان ہی دنوں جب ماصفہ تین ماہ کی ہوئی تو سائرہ کی منگنی ٹوٹنے کی خبر ملی، عدیل نے انگلینڈ میں ایک میم سے بیاہ رچا لیا تھا، بڑی بھابھی گاؤں میں جا چکی تھیں اور اماں جان سے بھی ماصفہ کو سنبھالا نہیں جاتا تھا، انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بہن کے آگے جا کر جھولی پھیلا دی، سائرہ کی والدہ نے سوچنے کی مہلت مانگی تھی اور پھر سائرہ کے والد کی رضا مندی جان کر سائرہ اور حسن رضا کی شادی طے کر دی ماصفہ چھ ماہ کی تھی جب سائرہ دہن بن کر ”رضا ہاؤس“ آگئیں، حسن رضا نے انہیں اولین شب ہی باور کرا دیا تھا کہ انہوں نے دوسری شادی ماصفہ کی وجہ سے کی ہے تاکہ اسے ماں کی کمی محسوس نہ ہو، البتہ وہ سائرہ کو بھی خوش رکھنے کی پوری کوشش کریں گے، وقت گزرتا رہا، رفتہ رفتہ حسن رضا بھی سنبھل گئے، ماصفہ ڈیڑھ سال کی ہوئی تو سوہیرا نے ان کے آنکھیں آنکھیں کھولیں، ماصفہ نے اپنی ماں کا رنگ روپ چرایا تھا، تو سوہیرا سائرہ اور حسن کے حسن کا بلاپ تھی، آنکھیں حسن رضا جیسی گہری سیاہ تھیں تو رنگ روپ سائرہ جیسا موہنا تھا، سائرہ کی ذمہ داری

بڑھ گئی تھی، سو حسن نے ان کی مدد کے خیال سے دو ملازم بھی رکھ دیئے تھے، لیکن دونوں بچیاں بہت شرارتی تھیں، انہیں سنبھالنے میں وہ بالکان ہو جاتی تھیں، لیکن انہیں یہ بات بھولی نہیں تھی کہ وہ اس گھر میں ماصفہ کی ماں بن کر لائی گئی ہیں، سو وہ ماصفہ پر خصوصی توجہ دیتی تھیں اور پھر یہ عادت نادانستگی میں پختہ ہوئی گئی، نتیجتاً سوہیرا کے مزاج میں غم شامل ہوتی گئی۔

حقیقت سے بے خبر وہ اپنے اندر بدگمانی کے ڈھیر لگاتے چلی گئی، پندرہ دن گاؤں کی کلی فضا میں رہ کر وہ لوٹی تو اس کا رنگ روپ مزید گھبر گیا تھا، سائرہ نے اس ڈر سے اسے نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں کہ کہیں اسے ان کی نظر نہ لگ جائے، ماصفہ بھی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی، پہلی دفعہ وہ اتنے دن کے لئے کہیں گئی تھی۔

”سوہیرا تمہارے آنے سے تو گھر میں اجالا ہو گیا ہے۔“ ماصفہ نے خوشدلی سے کہا تو وہ جواباً مسکرا دی۔

”بہت مزا آیا، ناٹی جی تو آنے ہی نہیں دے رہی تھیں، صبح کے ساتھ بھی اچھا وقت گزرا۔“ وہ دلچسپی سے بتا رہی تھی اور وہ شیوں بن رہے تھے، سائرہ نے رات کے کھانے پر کافی اہتمام کیا تھا، ایک سے زیادہ ڈشز سوہیرا کی فیورٹ تھیں، اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا تھا، سائرہ نے قدرے سکون محسوس کیا۔

”گھر سے دور رہ کر اس کا مزاج بدل گیا ہے۔“ انہوں نے سوچا، لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی، پندرہ دن سکون سے گزر گئے، سوہیرا کے گاؤں جانے کے بعد ماصفہ نے یک بلی پالی تھی، بلی اعلیٰ نسل کی اور بے حد قیمتی تھی، ماصفہ نے اس کا نام ”کچپ“ رکھا تھا، ماصفہ اس کے ناز اٹھاتے نہیں تھکتی تھی، بلی بے تکلفی سے سارے گھر میں گھومتی تھی، سوہیرا کو اس کی بے تکلفی بھائی نہیں

وہ اور نج جوس کی شوقین تھی، سوہیرا نے اس کے جوس میں نیند کی دوا ملا دی تھی، اسے یہ حرکت کرتے فریدہ (ملازمہ) نے دیکھ لیا تھا، جب کچپ کے لئے ماصفہ کی پریشانی حد سے بڑھی تو فریدہ نے جیکے سے سوہیرا کی کارستانی بتا دی، سائرہ سر پکڑ کر رہ گئیں، کچپ ایسی گہری نیند سوئی تھی اٹھنے کا نام نہیں لے رہی تھی، سائرہ نے سوچا کہ خود اسے سر زش کرنے کے بجائے، حسن سے اس کی شکایت کریں گی اور انہوں نے ایسا ہی کیا، ماصفہ اس سارے قصے سے بے خبر تھی، رات کے کھانے کے بعد حسن نے سوہیرا کو اسٹڈی روم میں طلب کیا تھا، اس کے فرشتے بھی لاعلم تھے کہ پایا نے اسے کیوں بلایا ہے۔

”جی پایا! آپ نے مجھے بلایا ہے۔“ وہ بے یارزی سے بولی۔

”ہونہ آؤ بیٹھو۔“ وہ لیپ ٹاپ پر کوئی کام کر رہے تھے، وہ ان کے برابر میں جا کر بیٹھ گئی۔

”آپ نے کچپ کے جوس میں نیند کی دوا لی تھی۔“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے، اپنا کام وہ موقوف کر چکے تھے۔

”پاپا وہ میرے روم میں کس کر میرے بیڈ پر بیٹھ جاتی ہے، مجھے کھن آتی ہے۔“ اس نے منہ مالیا۔

”سوہیرا کچھ عرصے پہلے بھی آپ نے ماصفہ کے برڈز کا پنجرہ کھول دیا تھا، بیٹا آپ کو ماصفہ سے کیا پرابلم ہے؟“ وہ آج بات کلیئر کرنا چاہ رہے تھے۔

”وہ آپ کی بہن ہے۔“

”وہ میری بہن نہیں ہے۔“ اس کی بات نے حسن کے اعصاب کو ہلا دیا تھا، وہ بیڈ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ، کس نے کہا آپ سے؟“ وہ اضطرابی انداز میں پوچھ بیٹھے۔

”میں نے کافی عرصہ پہلے دادی کو ماما سے کہتے سنا تھا، شک تو مجھے پہلے ہی تھا اس دن یقین ہو گیا کہ ماصفہ میری بہن نہیں ہے، ماما کو اس کے ناز اٹھاتے دیکھ کر میرے ضبط کی طنابیں چھوٹنے لگتیں ہیں مجھ سے دیکھا نہیں جاتا اور پھر مجھ سے ایسی سپدھی حرکتیں سرزد ہونے لگتیں ہیں، پاپا مجھے یہاں نہیں رہنا، مجھے ہاسٹل بھجوا دو۔“ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں تھیں، حسن رضا کے دل پہ گھونسا پڑا تھا، وہ دونوں بیٹیوں کو سدا خوش دیکھنا چاہتے تھے، ان کی آنکھوں کے آنسو انہیں بے کل کر دیتے تھے، جیسا کہ اس وقت ہوا تھا، وہ خود کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کرنے لگے تھے، ایسی ہی بے بسی انہیں پہلے بھی محسوس ہوئی تھی، جب ماصفہ کو جنم دے کر اس کی ماں دنیا سے رخصت ہو گئی تھی، انہیں اپنی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھاتا محسوس ہوا تھا۔

”کیا کریں وہ؟ ماصفہ بن ماں کی بچی تھی، سوہیرا اپنی ماں کی محبت اس کے ساتھ بانٹ کر خوش نہیں تھی، ایک کے پاس ماں نہیں تھی، پر ماں کی ممتا تھی اور دوسری کے پاس ماں بھی تھی اور اس کی ممتا بھی تھی پر وہ اس سے دور ہونا چاہتی تھی۔“

”پاپا پلیز مجھے ہاسٹل بھجوا دیں۔“ اس نے اپنی بات دہرائی تو وہ سوچوں کے بھنور سے نکل آئے۔

”ٹھیک ہے جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا۔“ وہ ہارے ہوئے انداز میں گویا ہوئے، دوسری صبح جب سائرہ کو پتا چلا کہ وہ ہاسٹل میں رہنا چاہتی ہے انہوں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کچھ سننے کے لئے آمادہ نہیں تھی، یوں وہ ہاسٹل چا کر رہنے لگی۔

بی بیس کی پڑھائی اس نے ہاسٹل میں رہ کر ہی مکمل کی تھی، اس پورے عرصے میں اس



نے چند ایک روز ہی رضا ہاؤس میں گزارے تھے، سائرہ کی ممتا اس کے لئے کر لاتی رہتی تھی، لیکن وہ سب سے بے نیاز بنی رہی، بی ایس سی کے فائنل ایگزامز کے بعد وہ رضا ہاؤس لوٹ آئی، اس دوران ماصفہ بی اے سے فارغ ہو چکی تھی اس کی خواہش تھی کہ وہ ایم بی اے کی تعلیم بیرون ملک سے حاصل کرے، حسن رضا چاہتے تھے کہ سوہیرا بھی آگے بڑھے اور اس خواہش کا اظہار انہوں نے ناشتے کی ٹیبل پر کیا تھا، جس کا جواب سوہیرا نے یوں دیا تھا۔

”مجھے مزید نہیں پڑھنا ہے۔“  
”حسن پھر ہم سوہیرا کی ممتا کر دیتے ہیں، مسز بخاری اپنے بیٹے کے لئے کہہ رہی تھیں۔“  
سائرہ نے خوشدلی سے کہا، ماصفہ بھی مسکرا رہی تھی، اس کے لئے بھی یہ موضوع دلچسپ تھا۔  
”سوہیرا! بہن بنی ہوئی کتنی پیاری لگے گی نہ ماما۔“ اس نے فوراً کہا تھا جبکہ حسن نے سوہیرا کو دیکھا جس کے چہرے پہ ناگوار کے تاثرات دکھائی دے رہے تھے۔

”ہماری سوہیرا جیسا چاہیے گی وہی ہوگا۔“  
حسن رضا نے اس کی دجوبی کی خاطر کہا۔  
”پاپا! میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔“ اس کی زبان سے جاب کا سن کر ماصفہ نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

”اوکے، کہاں اپلائی کرو گی، تمہاری تو تعلیم بھی مکمل نہیں ہے۔“ حسن رضا نے حیرت سے کہا۔

”میری ایک فرینڈ نے ایف ایم ریڈیو پر آر جے کے لئے آڈیشن دیا ہے، میں بھی آڈیشن دینا چاہتی ہوں۔“ اس نے فردا فردا تینوں افراد کو دیکھا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ حسن رضا ناشتہ ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور یوں وہ

ایف ایم کے پرائیویٹ چینل پر جاب کرنے لگی تھی، اس طرح وہ مصروف ہو گئی تھی، ماصفہ اور حسن کے لاڈ دیکھ کر اسے کڑھنے کے لئے ٹائم نہیں ملا تھا۔

☆☆☆

گزشتہ کچھ روز سے گھر میں اشہد حسین کی انگلینڈ سے واپسی کی خبر گردش کر رہی تھی، اشہد حسن تائی جی کا اکلوتا بیٹا تھا اور عرصہ دس سال سے حصول علم کے لئے انگلینڈ میں مقیم تھا اور اب وہ تعلیم مکمل کر کے واپس لوٹ رہا تھا، اس نے ایم بی اے کیا تھا، اس روز وہ پروگرام ختم کر کے لوٹی تو کافی تھکن محسوس کر رہی تھی، آلتھو پورچ میں روک کر وہ نیچے اتر آئی، بلا ارادہ وہ اس کی نگاہ دائیں جانب لان میں گئی جہاں شام کی چائے کا دور چل رہا تھا، ماما اور ماصفہ کے علاوہ ایک تیسرا شخص بھی موجود تھا، سرخ و سفید رنگت پر اس کے کھڑے کھڑے نقوش نمایاں لگ رہے تھے، اس کے گتے سیاہ بال ہوا سے اڑ رہے تھے، سوہیرا نے اسے پہچاننے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی، ماما نے اسے متوجہ دیکھ کر پکارا۔

”سوہیرا آ جاؤ چائے پی لو۔“ سائرہ کے پکارنے پر اس نے ایک اچھتی ہوئی نظر سوہیرا پر ڈالی اور پھر سے ماصفہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”میرے روم میں بھجوا دیں۔“ وہ جواب دے کر اندر کی جانب بڑھنے لگی، اس کا جواب سن کر اس شخص نے ایک گہری نظر سوہیرا پر ڈالی تھی، یہ اشہد حسین تھا جو ایک ہفتہ پہلے انگلینڈ سے لوٹا تھا اور آج اپنی ماں کے حکم پر اپنے چاچو کے گھر آیا تھا ان سب سے ملنے، رات کے کھانے پر حسن رضا نے اس کا تعارف اشہد حسین سے کروایا۔

”سوہیرا! تم ملیں اشہد سے۔“  
”ہیلو۔“ وہ سپاٹ لہجہ میں بولی تھی۔

”ہائے، جب میں گیا تھا، تب بھی تمہارا مزاج ایسا ہی تھا اور اب بھی تم اجنبی سی لگتی ہو، دس سال کا عرصہ بھی تمہارے مزاج میں کچھ نہیں آیا۔“ وہ براہ راست اس سے مخاطب تھا۔

”میرا مزاج ایسا ہی ہے۔“ وہ اجنبیت سے بھرپور لہجے میں بولی تھی، سائرہ نے اس کے انداز پر شرمندگی محسوس کی تھی، وہ اپنی بیٹی کی اچھی تربیت کرنے میں ناکام رہی تھیں، حسن رضا نے اس کی بات کا اثر زائل کرنے کے لئے موضوع بدل دیا۔

”اشہد اب کیا ارادہ ہے تمہارے کیا فیوچر ہائز ہیں۔“

”میں نے تو بہت کچھ سوچ رکھا ہے، پر ماما جی چاہتی ہیں کہ میں پہلے شادی کر لوں، اب اتنا عرصہ ان سے دور رہا ہوں تو ان کی بات ماننے کا حوصلہ نہیں ہے، اس کے علاوہ جلد ہی شوگر مل لگا رہا ہوں گاؤں میں۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔

”یہ تو بہت اچھا سوچا ہے بھابھی صاحبہ نے، نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے، سائرہ تمہیں بتا رہی ہے یہ بات۔“ حسن رضا نے سائرہ کو شامل گفتگو کیا۔

”جی حسن مجھے بھابھی صاحبہ نے فون پر بتایا تھا۔“ انہوں نے سوہیرا کے سامنے پوری بات بتانے سے گریز کیا۔

”سچ اشہد بھائی بڑا مزہ آئے گا آپ کی شادی میں۔“ ماصفہ شادیوں میں شرکت کرنے کی شوقین تھی، سوہیرا خاموشی سے کھانا کھاتی رہی، کھانے کے بعد اشہد واک کرنے کے لئے نکل گیا تھا، جبکہ ماصفہ اور سوہیرا اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں، ان کے جانے کے بعد سائرہ نے حسن کو بھابھی صاحبہ کا پیغام پہنچایا۔

”بھابھی صاحبہ، سوہیرا کو اپنی بہو بنانا چاہتی

ہیں اسی مقصد سے انہوں نے اشہد کو ہمارے پاس بھیجا ہے تاکہ وہ سوہیرا کو دیکھ بھال لے۔“  
”سوہیرا کو یہ بات معلوم ہے۔“ وہ چونک کر پوچھ بیٹھے۔

”تمہیں میں نے اسے نہیں بتایا، مجھے نہیں لگتا کہ وہ آسانی سے شادی کے لئے رضامند ہو گی، آپ نے دیکھا کہ اس نے اشہد کے ساتھ کتنے روکھے طریقے سے بات کی تھی۔“ وہ خائف دکھائی دے رہی تھیں۔

”خواہش تو میری بھی یہی ہے کہ اگر وہ آگے بڑھنا نہیں چاہتی تو اس کی شادی کر دی جائے شاید اسی طرح اس کے مزاج پر جی برف پھل سکے پھر اشہد سے اچھا ہم سفر اسے کہاں ملے گا، لیکن اسے راضی کرنا بھی تو ایک مسئلہ ہے۔“ حسن رضا اس کے لئے پریشان تھے۔

”آپ پریشان مت ہوں، میں سب سنبھال لوں گی، مجھے پتا ہے کہ اسے کس طرح پشیدل کرنا ہے۔“ وہ پرسوج انداز میں بول رہی تھیں، پھر انہوں نے رات کو ہی اشہد کے ساتھ ایک خفیہ سنگ کی تھی اس کے بعد وہ مطمئن ہو گئیں تھیں۔

☆☆☆

”ماما! وہ آپ کی لاڈلی دوپہر سے نظر نہیں آ رہی۔“ سوہیرا نے ماصفہ کے متعلق سائرہ سے پوچھا، سائرہ جو اس کے بالوں میں تیل کی مالش کر رہی تھیں زیر لب مسکرا دیں تھیں۔

”وہ اشہد کے ساتھ گئی ہے، اشہد کو شاپنگ کرنا تھی، میں تمہیں بتانا بھول گئی کہ تمہاری تائی نے ماصفہ اور اشہد کے رشتے کی بات کی ہے، اشہد کچھ عرصے کے بعد دوبارہ انگلینڈ جانے کا ارادہ رکھتا ہے اور تم تو جانتی ہو کہ ماصفہ بھی اسٹڈیز کے ہے آؤٹ آف کنٹری جانا چاہتی ہے، اشہد سے شادی ہو جانے کی صورت میں وہ



باہر جا کر تعلیم مکمل کر سکتی ہے، اگر اشد راضی ہو جاتا ہے تو جلد ہی دونوں کی شادی کر دیں گے۔“ سائرہ دھیرے دھیرے بتا رہی تھیں، سوہیرا کا سر جھکا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ اس کے تاثرات دیکھ نہیں پائیں، اس کے لب خاموش تھے، لیکن اندر کچھ چل رہا تھا، سائرہ نے بخوبی اندازہ لگایا، انہوں نے اس کے خوبصورت بال سمیٹ کر چٹیا بنا دی تھی۔

”مما! میں کچھ دیر سوؤں گی، پھر اٹھ کر نہا لوں گی۔“ چھٹی کے روز وہ دن میں سونے کی عادی تھی۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ میں ذرا دیکھوں کچن میں فریڈہ نے بریانی کا مصالحہ تیار کیا یا نہیں، اشد نے بریانی کی فرمائش کی ہے۔“ وہ کچن کی جانب بڑھ گئیں جبکہ سوہیرا اپنے کمرے میں آگئی، اشد اور ماصفہ شام ڈھلے لوٹے تھے، جب وہ لوٹے تو سوہیرا ٹیبل پر کھڑی پرسوج نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

”مما سیٹھ وچڑ اور کافی کا فلاسک گاڑی میں رکھوا دیجئے گا۔“ ماصفہ کا آؤنگ کا پروگرام لگ رہا تھا، وہ کچن کے باہر کھڑی تھی، سوہیرا نے لی وی سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا تھا، بلیو جینز اور وائٹ کرتے میں وہ نکھری لگ رہی تھی۔

”کہاں کا پروگرام ہے؟“ سوہیرا نے اسے متوجہ کیا۔

”میں اور اشد بھائی سی ویو جا رہے ہیں، تم بھی چلو۔“ اس کا انداز رسمی تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ سوہیرا اپنے کسی پروگرام میں شامل ہونا پسند نہیں کرتی، بلکہ وہ کافی حد تک تنہائی پسند تھی۔

”نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے حسب عادت بہانہ کھڑا تھا، وہ کچھ دیر پہلے ہی

اسٹوڈیو سے لوٹی تھی، ماصفہ سر ہلا کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی، جواب اس کی توقع کے مطابق تھا، وہ لاؤنج کے صوفے پر نیم دراز چیل سرچنگ کر رہی تھی کہ سامنے سیڑھیوں سے اشد نیچے اترتا دکھائی دیا، لائٹ بلیو جینز پر اس نے بلیک ٹی شرٹ پہن رکھی تھی، سوہیرا نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پاؤں صوفے سے نیچے لٹکا لیے ساتھ ہی دوپٹہ درست کیا تھا۔

”سوہیرا! تم کہیں جا رہی ہو؟“ وہ صوفے کے نزدیک کھڑا پوچھ رہا تھا۔

”نہیں میں گھر پر ہی ہوں۔“ اس نے حیرت سے جواب دیتے ہوئے اشد کو بغور دیکھا، جس کی سمندر جیسی آنکھیں لودے رہی تھیں، بالوں کی نمی بتا رہی تھی کہ وہ کچھ دیر پہلے نہ کر نکلا ہے۔

”تم بھی ساتھ چلو نہ میں اور ماصفہ سی ویو جا رہے ہیں۔“

”لیکن میں تو.....“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کن الفاظ میں انکار کرے، خود یہ غصہ بھی آیا کہ کیا ضرورت تھی اسے اتنا غور سے دیکھنے کی کہ عقل ہی خط ہو گئی۔

”کیا پہلے بھی اتنا شاندار بندہ نہیں دیکھا ہے۔“ اس نے دل کو کوسا۔

”تمہارے شہر میں مہمانوں سے ایسا سلوک ہی کیا جاتا ہے۔“ وہ کچھ جتاتے ہوئے کہہ رہا تھا، اس کے انداز نے سوہیرا کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

”میں..... میں چل رہی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیس منٹ بعد پورچ میں ملنا۔“ وہ رست وایچ میں ٹائم دیکھتے ہوئے اسے بولا اور وہ اثبات میں سر ہلا کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی، جبکہ کچن میں سے نظارہ کرتی سائرہ مسلسل

سکرار ہی تھیں، بیس منٹ بعد وہ پورچ میں آئی تو، کار کے پاس اشد کو تنہا کھڑا دیکھ کر وہ چونکی۔

”ماصفہ کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اس کی کوئی دوست ملنے کے لئے آگئی ہے اس وجہ سے وہ ہمارے ساتھ نہیں جا رہی۔“ وہ رساں سے کہتے ہوئے سوہیرا کے لئے فرنٹ ڈور کھولنے لگا۔

”کیا میں اور آپ جا رہے ہیں؟“ وہ کچھ سوچنے لگی تھی، جبکہ وہ بنا کچھ جواب دیے، دوسری سائیڈ سے جا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا، مجبوراً سوہیرا کو بھی پیروی کرنا پڑی، راستے میں اس سے اس کی جاب کے بارے میں بات کرتا رہا، ساحل سمندر پر پہنچ کر وہ دونوں پتھروں پر آ بیٹھے تھے، سورج کی تاریکی کرنوں سے سمندر کے پانی کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔

”میں جب بھی کراچی آتا ہوں، یہاں ضرور آتا ہوں، مجھے ریت پر ننگے پاؤں چلنا بہت اچھا لگتا ہے، ریت کی ٹھنڈک جب پیروں سے پورے وجود سے سرایت کرتی ہے تو میری ساری جھکن اتر جاتی ہے۔“ وہ اسے بتا رہا تھا اور سوہیرا مسکراتے ہوئے سن رہی تھی۔

”مجھے بس دور سے لہروں کو دیکھنا اچھا لگتا ہے۔“ سوہیرا نے کہا۔

”ماصفہ بھی آ جاتی تو مزا دو بالا ہو جاتا، اسے بھی میری طرح ریت پر چلنا اچھا لگتا ہے۔“ اشد نے کہا تو وہ چونک پڑی، وہ ماصفہ کی اس عادت سے لاعلم تھی، سورج ڈوبنے کے بعد بھی وہ دونوں بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے، پھر اشد کے اصرار پر سوہیرا اس کے ساتھ ننگے پاؤں ساحل کی ریت پر بہت دیر تک گئی تھی، ج نے ایسا کیا تھا اس کی قربت میں کہ وہ اس کی کس بات سے انکار نہیں کر پا رہی تھی، اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے ماصفہ سے بدگمان کرنے کے جتن کرے گی

تاکہ وہ ماصفہ سے شادی کا خیال دل سے نکال دے، لیکن اس سے کچھ کہا ہی نہیں گیا، اشد کے ساتھ وہ ایک بھر پور شام گزار کر لوٹی تھی اور بہت مسرور تھی، شاید اس کی ذات کے گرد بنا خول چھ رہا تھا، رفتہ رفتہ اشد اس کے نزدیک آتا گیا۔

”سوہیرا آج شام کو مجھے شاپنگ پر جانا ہے، صبح نے کچھ سامان منگوایا ہے، تم میرے ساتھ چلنا۔“ وہ استحقاق بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا، اس کے انداز سے سوہیرا کو گڑبڑانے پر مجبور کر دیا۔

”وہ..... آپ ماصفہ کو لے جائیں اسے شاپنگ کا اچھا سینس ہے۔“ پہلا موقع تھا جب اس نے ماصفہ کی کسی خوبی کو سراہا تھا۔

”سوری مجھے سونیا کی برتھ ڈے پارٹی پر جانا ہے۔“ اس نے ہری جھنڈی دکھا دی، مجبوراً سوہیرا کو حامی بھرنی پڑی، شام کو جب وہ سوہیرا کو ساتھ لے کر گیا تو اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اشد نے اسے ایک سوٹ دلایا تھا، شاپنگ کے دوران وہ ایک ڈسپلے میں لگے ایک سوٹ کو دیکھ کر گرم صم ہو گیا تھا، سوہیرا کے استفسار پر اس نے بتایا۔

”میں یہ سوٹ اپنی دلہن کے لئے لوں گا۔“ سوہیرا کے تصور میں ماصفہ کا سراپا لہرایا تھا، اس کے حلق میں کڑواہٹ کھل گئی تھی، آخر کیسے وہ اشد کو باز رکھے، ماصفہ کو اپنانے سے، چاہنے کے باوجود بھی وہ ماصفہ کے خلاف اس سے ایک لفظ نہیں کہہ پائی تھی، سائرہ اور حسن رضا اسے اشد کے ساتھ کھلتے ملتے دیکھ کر بہت سکون محسوس کرتے تھے، اگلے دن واپس گاؤں جا رہا تھا، کل صبح اسے نکلتا تھا۔

☆☆☆

”ماصفہ تم بھی چلو ناں صبح تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔“ اس نے ماصفہ سے اصرار کیا تو وہ



ہنس دی۔

”اشہد بھائی کچھ دنوں میں تو وہ لوگ خود شہر آنے والے ہیں پھر تو ملنا ہی ملنا ہے۔“ اسی وقت اس کے سیل فون پر کال آنے لگی تو وہ اٹھ کر اندر چلی گئی، لان میں اب اشہد اور سوہیرا ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

”سوہیرا! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ سامنے بیٹھی سوہیرا سے مخاطب تھا۔

”ہونہ، کہیے۔“ وہ اپنے سیل فون پر آنے والا ایس ایم ایس پڑھ رہی تھی، اس نے سوہیرا کی جانب جھک کر اپنے دائیں ہاتھ میں اس کا سیل لے لیا۔

”میری جانب دیکھو میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔“ اسے سوہیرا کی توجہ سیل فون کے لئے کچھ پسند نہیں آئی تھی۔

”جی کہیے میں دیکھ رہی ہوں۔“ سوہیرا کو اس کی گہری سبز آنکھیں کچھ بولتی ہوئی لگ رہی تھیں، سوہیرا کو سب کچھ اختیار سے باہر ہوتا لگا تھا۔

”اماں جی چاہتی ہیں کہ میں شادی کر لوں، اسی مقصد سے میں یہاں آیا تھا۔“ اس نے تہید باندھی۔

”میں نے جب تمہیں دیکھا تو دل میں یہ خیال آیا کہ تمہیں سب سے چھپا کر کہیں دور لے جاؤں جہاں میرے سوا کوئی تمہیں دیکھ نہ سکے، میرے سوا کوئی تمہیں سن نہ سکے، میرے سوا کوئی تمہیں چھو نہ سکے۔“ بوجھل لہجے میں کہتا ہوا وہ اسے حیران کر گیا۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا مگر تو کہہ رہی تھیں کہ تالی جی نے ماصفہ کے لئے بات کی ہے۔“

”ماصفہ کو یا پھر کسی اور لڑکی کو دیکھ کر میرے دل کی حالت وہ نہیں ہوتی جو تمہیں دیکھ کر ہوئی

ہے، تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ جیسے تمہارا وجود میری تکمیل کے لئے ضروری ہے۔“ اس کے جذبولں سے گندھے لفظوں پر سوہیرا کی ہتھیلیاں پیچنے لگیں تھیں، ایسی باتیں اس سے بھی کسی نے نہیں کی تھیں، کیونکہ اس نے کسی کو اپنے نزدیک آنے ہی نہیں دیا تھا، وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹھ جاؤں، میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔“ اشہد حسین نے اسے جانے سے باز رکھا تو وہ بلا سبب ہونٹ کچلنے لگی۔

”چند روز بعد دادی اور اماں جی منگنی کی رسم کرنے آئیں گی تب ہی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی جائے گی، شرافت سے انگوٹھی پہن لینا، میری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر کوئی نامناسب حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا اور ہاں میں تمہیں فون کروں گا اور آخری بات خود یہ یہ ظلم کر کے میرے ضبط کا امتحان مت لو۔“ اس کا اشارہ اس کے ہونٹ کچلنے والی حرکت پر تھا، سوہیرا اس کا آخری فقرہ سنتے ہی اندر کی جانب بھاگی تھی، جبکہ وہ دیر تک مسکراتا رہا تھا، اشہد کے جانے کے ایک ہفتہ بعد گاؤں سے دادی سمیت تمام لوگ آگئے تھے، تایا جی اشہد کے بچپن میں ہی انتقال کر گئے تھے، تالی جی اسے دیکھتے ہی واری صدقے ہونے لگیں، دادی بھی بہت خوش تھیں، خوش تو وہ بھی تھی، لیکن دل کی بل ملال جاگتا تھا، کہ وہ سچلا سا شخص تو ماصفہ کا مقدر بننے والا تھا اور وہ ان دونوں کے درمیان آگئی تھی جبکہ ماصفہ ہستی مسکراتی صبح کے ساتھ منگنی کی تیاریوں میں مگن تھی، جیسے یہ سب اس کے حسب نشاء ہو اور سوہیرا اسی بات پر بے حد حیران بھی تھی کہ اس کی اس حرکت پر کسی نے ٹھوکی باز پرس نہیں کی، تالی اس کے اٹنے کی وجہ ازراہات اور دیگر آرائشی سامان لے کر آئی تھیں، منگنی کا جوڑا دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی یہ وہی سوٹ تھا، جو اشہد نے شاپنگ

کے دوران پسند کیا تھا، دھانی رنگ کا کرنا یا جامہ جس کے کرتے اور دوپٹے کے پلو پر پرل اور سفید نگینوں کا نفیس کام بنا ہوا تھا، اس نے صبحہ کو کہتے سنا۔

”بھائی نے سوہیرا کے لئے منگنی کا سوٹ اپنی پسند سے لیا ہے۔“ رات کو اس کا فون آگیا، وہ سیل فون کان سے لگا کر ٹیرس بریکل آئی۔

”کیا کر رہی تھیں؟“ پوچھا گیا۔

”عالیہ بھیمو کی روحہ آئی ہے اس سے مہندی لگوانے لگی تھی کہ آپ کا فون آگیا، آپ کیا کر رہے تھے۔“ اس نے پوچھا، جواب شعر میں آیا تھا۔

”جی ہے خیالوں میں سدا کوئی رفاقت تنہا ہوں مگر خود کو میں تنہا نہیں کہتا سوہیرا نے اس کا شعر نظر انداز کر کے دوسرا سوال کیا۔

”آپ کب آئیں گے۔“ اس کے پوچھنے پر وہ ہنس دیا، اس کی کسی بھی اتنی ہی دلکش تھی جتنا کہ وہ خود، سوہیرا کی دھڑکنیں شور مچانے لگیں۔

”فی الحال نہیں آ سکتا، یہاں گاؤں میں میرے بچپن کے یار کی شادی ہو رہی ہے جسے میں مس نہیں کر سکتا اور ہاں اب تم بلا جھجک میرا نام لے سکتی ہو۔“ اس کی آواز میں شرارت نمایاں تھی۔

”میں کچھ سمجھی نہیں۔“ وہ نا سمجھی سے بولی تھی۔

”جب سے لوہا ہوں تم نے ایک دفعہ بھی میرا نام نہیں لیا، نہ ہی بچپن کی طرح مجھے اشہد بھائی کہا، میرا خیال ہے کہ اشہد بھائی کہنا تمہیں اچھا نہیں لگتا اور نام لینا تمہیں مناسب نہیں لگا ہو گا۔“ اس نے تجزیہ کیا، جبکہ سوہیرا بری طرح جھل ہو گئی تھی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے

صفائی پیش کی۔

”چلو تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔“ وہ بدستور شرارت پر آمادہ تھا۔

”میں فون بند کر دوں۔“ اس نے دھمکی دی۔

”نہ یارا ایسا ظلم مت کرنا دل تمہارے لئے بہت بے قرار ہے، آواز سن کر کچھ افاقہ ہوا ہے۔“ یہ بتاؤ تمہیں منگنی کا جوڑا پسند آیا۔“ اسے پوچھنے کا خیال آیا۔

”یہ وہی ہے نہ جو اس روز شاپنگ کے دوران آپ کو پسند آیا تھا۔“ اس نے پوچھا۔

”بالکل اور میں نے اسی روز جا کر خرید لیا تھا، اب تک کتنی ہی دفعہ تمہیں تصور میں یہی جوڑا پہنے دیکھ چکا ہوں۔“ اس نے اپنے پاگل پن کا بتایا، جواباً وہ خاموش رہی، تب ہی روحہ نے آواز لگائی، وہ اسے مہندی لگانے کے لئے بلا رہی تھی، سوہیرا نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا، روحہ نے شہر کے مشہور پارلر سے بیوٹیشن کا کورس بھی کر رکھا تھا، سوہیرا نے اگلے دن سوہیرا کا میک اپ بھی کیا تھا، جوں ہی وہ اپنے کام سے فارغ ہوئی، عالیہ بھیمو کا حماد کیمرہ لے کر آگیا اور کھٹا کھٹ اس کی تصویریں کھینچنے لگا۔

”اشہد بھائی نے کہا ہے کہ سوہیرا اچھے اچھے پوز لینا ایک بھی تصویر خراب ہوئی ہے تو تمہاری خیر نہیں ہے۔“ بائیس سالہ حماد نے اشہد کی تاکید کا ذکر کیا تو وہ ہلش کر گئی۔

”اشہد بھائی سچ دیوانے ہوئے ہیں۔“ جاتے جاتے وہ فقرہ اچھا لگتا تھا، جس پر ماصفہ بہت دیر تکی رہی تھی۔

”ممائی کہہ رہی ہیں کہ سوہیرا کو رسم کے لئے ہال میں لے آؤ۔“ روحہ نے ماصفہ کو آ کر سارہ کا پیغام دیا تو ماصفہ اسے ہال میں لے آئی، جہاں خاندان بھر کی خواتین موجود تھیں، مرد



حضرات کے لئے لان میں انتظام کیا گیا تھا، تمام خواتین ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھیں بعض اس کی موٹی صورت کو سراہ رہی تھیں تو کچھ حیران تھیں، اس کی مٹکی اور پندرہ دن بعد شادی کی تاریخ طے ہونے پر، وہ اپنی حنائی ہتھیلیوں کو دیکھتے ہوئے اشد کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک اسے اپنا وجود شعلوں میں گھرتا محسوس ہوا تھا، پیش اس قدر تھی کہ اس کا حلق تک خشک ہو رہا تب ہی اسے دادی کی آواز سنائی دی۔

”بہو بسم اللہ کرو۔“ دادی نے تائی جی کو مخاطب کیا تو تائی جی اس کے بائیں جانب صوفے پر آ بیٹھیں تھیں، بائیں ہاتھ میں تھامی خوبصورت ڈبیہ سے انہوں نے نازک ڈائمنڈ کی انگلی نکالی اور دایاں ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔

”میں یہ مٹکی نہیں کروں گی۔“ اس نے تڑپ کر تائی جی کا ہاتھ پیچھے دھکیل دیا، اور خود اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

☆ ☆ ☆

”کیوں کیا میرے ساتھ ایسا۔“ نجانے کتنی دیر سے وہ ماضی کے سفر سے لوٹی تھی اور اب رو رہی تھی، اب تو آنسو بھی خشک ہو چکے تھے، گھر میں کسی چہل پہل کا احساس نہیں ہو رہا تھا، شاید تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے، کمرے میں شدید گھٹن کا احساس ہو رہا تھا، اس نے پردے سمیٹ کر کھڑکی کھولی تو ہوا کا جھونکا اندر گھس آیا، اس نے باہر جھانکا تو نگاہ سرخ روش پر رک گئی، جہاں حماد ڈاکٹر فرقان کے ساتھ کھڑا تھا اس کا دل ایک دم سہم گیا، اس نے ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کی، ڈاکٹر فرقان کہہ رہے تھے۔

”بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے، میں نے انجکشن دے دیا ہے، صبح تک مسز حسن بہتر محسوس کریں گی۔“

”اودہ تو آپ کو اپنے بچھائے ہوئے چال میں میرے نہ پھنسنے کا اس قدر دکھ پہنچا ہے۔“ اس نے غصے سے سوچا۔

”اب میں آپ کو زیادہ دیر ڈراما نہیں کرنے دوں گی، میں پایا کو بتاؤں گی کہ آپ نے میرے لئے کیا ڈراما رچا تھا۔“ پھر سے اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں تھیں۔

☆ ☆ ☆

دوسرا دن تھا اسے کمرے میں بند ہوئے سوائے ملازمہ کے کسی نے اس کے کمرے میں جھانکا بھی نہیں تھا، کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی، صبح دادی سمیت تائی جی وغیرہ گاؤں کے لئے نکل چکے تھے، شام کے وقت کمرے سے نکلا تھی، لاؤنج میں سناٹا چھایا ہوا تھا، اس نے اب تک کل والا جوڑا پہن رکھا تھا جسے اشد نے بڑے ارمانوں سے خریدا تھا، اب وہ بری طرح مسلا جا چکا تھا، گلے میں کالا اسکارف ڈالے وہ حسن کے کمرے کے آگے کھڑی تھی، وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اندر جائے یا نہ جائے اندر جانے کی صورت میں سائرہ سے سامنا بھی متوقع تھا، دل کو مضبوط کر کے وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی، سائرہ بیڈ پر نیم دراز تھیں جبکہ حسن رضا سنگل صوفے کی بیک سے سر نکائے کسی گہری سوچ میں گم تھے، دروازہ کھلنے کی آواز پر انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں، سوہیرا پر نظر پڑتے ہی ان کے چہرے پر اشتعال ابھر آیا تھا۔

”سائرہ اسے کہیں کہ یہ یہاں سے چلی جائے، میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔“ حسن رضا کے تیور دیکھ کر سائرہ بھی سہم گئیں جبکہ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں تھیں۔

”پاپا! پلیز میری بات سن لیجئے۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، اس کی سوچی ہوئی آنکھیں اور متورم چہرہ دیکھ کر سائرہ کا دل کٹ گیا

تھا، لیکن حسن رضا نے اس پر دوسری نظر ڈالنا گوارا نہیں کیا۔

”سائرہ میں اس کی کوئی بات سننا نہیں چاہتا اسے کہو کہ یہاں سے جائے۔“ حسن رضا کی بلند آواز سن کر وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی اور پھر گھر سے بھی باہر نکل آئی، شام کا دھند لکا ابھی پوری طرح پھیلا نہیں تھا، وہ تیز قدموں سے آگے بڑھتی جا رہی تھی، اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے کہاں جانا ہے، نہ ہی اس بات کی پروا تھی کہ ارد گرد سے گزرنے والے لوگ اس کا حلیہ دیکھ کر کیا سوچیں گے، اچانک اس کے نزدیک کسی گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے، میرون لینڈ کروزر کا اگلا دروازہ کھول کر اترنے والے شخص کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی، چہرے پر گہری سنجیدگی کی چھاپ لئے یہ وہ شخص تھا جس کے نام سوہیرا کے دل نے دھڑکنے لگے تھے، مگر آج یہ شخص بھی ناراض تھا، خشکی کا تاثر اس کی گلابی ہونٹوں پر آکھوں سے عیاں تھا۔

”گاڑی میں بیٹھو۔“ اس نے اجنبی لہجے میں حکم صادر کیا تھا، اس کے لہجے نے سوہیرا کو کسی پس و پیش کے قابل نہیں چھوڑا تھا، وہ بنا کچھ کہے اس کے کھولے گئے دروازے سے اندر آ بیٹھی، اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گاڑی آگے بڑھا دی، سوہیرا نے سڑک پر نگاہ ڈالی، گاڑی ”رضا ہاؤس“ کی مخاطف سمت میں رواں دواں تھی، سوہیرا نے اشد کی جانب دیکھا، اس کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی، عنابی لیوں کو اس نے آپس میں بچھنچ رکھا تھا، چہرے کے نقوش تنے ہوئے تھے، سوہیرا نے کچھ کہنے کے لئے لیوں کو کھولا لیکن پھر اشد کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اسے خوف کا احساس ہوا تو اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی، گاڑی اجنبی سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی جوں جوں وقت بیت رہا تھا

اس کے دل میں خوف کا احساس جاگزیں ہو رہا تھا، تمام ہمت جمع کر کے اس نے زبان کھولی۔

”آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔“ سوہیرا کی بات سن کر بھی اس نے کوئی جواب نہ دیا، البتہ اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوئی تھیں۔

”میں آپ سے مخاطب ہوں، آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔“ سوہیرا نے بے اختیار جھنجھلا کر اس کی شرٹ کی آستین پکڑ کر کھینچ ڈالی، نتیجتاً اس نے ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر سوہیرا کو دیکھا، لیکن اب بھی اس نے کچھ کہنا گوارا نہیں کیا اور پھر سے ونڈ اسکرین کی جانب متوجہ ہو گیا، سوہیرا جھلا کر اپنی جانب کا لاک کھولنا چاہا اشد کی پوری توجہ ڈرائیونگ پر تھی، چند لمحوں کے بعد سوہیرا کو احساس ہو گیا کہ دروازے کا لاک آٹو لک تھا، مایوس ہو کر وہ پھر سے آنسو بہانے لگی، لگتا تھا اس کے اختیار میں بس آنسو بہانا ہی رہ گیا ہے۔

گاڑی کی فضا کو اشد کے مخصوص کلون کی مہک نے معطر کر رکھا تھا اور وہ پتھر بنا ڈرائیونگ میں مصروف تھا، جیسے وہ گاڑی میں تنہا سفر کر رہا ہو، ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اشد کی لینڈ کروزر کی فارم ہاؤس کے احاطے میں جا کر کھلی، فارم ہاؤس کے گیٹ پر تعینات گارڈ نے اشد کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا، اپنی جانب کا دروازہ کھولے اشد گاڑی سے باہر آ چکا تھا اور اب اس سے مخاطب تھا۔

”گاڑی سے باہر نکلو۔“ انداز میں سرد مہری نمایاں تھی، سوہیرا نے چاہا کہ انکار کر دے پھر کچھ سوچ کر باہر نکل آئی۔

”اندر چلو۔“ وہ قدم اندرونی عمارت کی جانب بڑھانے لگا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”مجھے واپس جانا ہے۔“ اس کی بات سن کر



وہ غیض و غضب میں بھرا ہوا واپس مڑا اور اس کی نازک کلائی اپنے مضبوط ہاتھ میں دبوج لی اور اندر کی جانب بڑھنے لگا، ایک کمرے کے اندر لا کر اس نے سوہیرا کی کلائی ایک جھٹکے سے چھوڑی تو وہ گرتے گرتے پٹی تھی، اس کی کلائی درد کرنے لگی تھی، سوہیرا کی کلائی چھوڑ کر وہ نظریں اطراف میں گھما کر کمرے کا جائزہ لینے لگا، پھر مطمئن ہوتے ہوئے ایک نظر الوداعی سوہیرا پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا، باہر نکلتے ہوئے وہ کمرے کا دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

”آخر وہ اسے یہاں کیوں لے کر آیا ہے۔“ اسے اپنے پیروں میں سے سخت ختم ہوئی محسوس ہو رہی تھی، پیٹ بالکل خالی تھا، کل شام میں چائے کے ساتھ کیک کھایا تھا، اس کے بعد اناج کا ایک دانہ بھی منہ میں نہیں ڈالا تھا، کچھ دیر بعد لینڈ کروزر کے اشارت ہونے کی آواز سنائی دی تو اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی، اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

”تو کیا وہ مجھے اس ویرانے میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا ہے۔“ اسے صوفے پر بیٹھے بیٹھے جانے کتنا وقت بیت گیا تھا، کھٹکے کی آواز پر وہ چونکی تھی، دروازہ کھول کر ایک بچی عمر کی عورت اندر داخل ہو رہی تھی، اس کے چہرے پر چپک کے نشان تھے، اس نے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی، ٹرے سینئر ٹیبل پر رکھ کر وہ واپس چلی گئی، قیمہ مٹر کی خوشبو اس کی توجہ کھینچنے لگی ساتھ چایاں اور رائتہ بھی تھا، اس نے اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کر دیا، جانتی تھی خالی پیٹ دماغ بھی کام نہیں کرے گا اور اسے یہاں سے نکلنے کے بارے میں بھی سوچنا تھا، کھانے کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی تو وہ اٹھ کر بیڈ پر آ گئی، کچھ دیر بعد ہی وہ غافل ہو گئی تھی، دوبارہ جب آنکھ کھلی تو

صبح کا اجالا پھیل چکا تھا، وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی، کچھ دیر تک تو اسے مجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے، جب حواس جاگے تو وہ بوکھلا کر بیڈ سے نیچے اتر آئی اور گھوم کر کمرے کا جائزہ لینے لگی، کافی بڑا کمرہ تھا، ضرورت کی ہر شے سے مزین تھا، دائیں دیوار پر بڑی سی کھڑکی تھی جس پر لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی، وہ کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی، باہر ایک موٹا سا آدمی پودوں کو پانی دے رہا تھا، اس کے نزدیک ہی وہی عورت کھڑی باتیں کر رہی تھی، جو رات کو اس کے لئے کھانا لے کر آئی تھی، باتیں کرتے ہوئے اس نے کھڑکی کی جانب دیکھا، سوہیرا کو کھڑکی میں ایستادہ دیکھ کر وہ چونکی اور پھر مومنہ مرد سے کچھ کہہ کر وہ اندرونی حصے کی جانب بڑھ آئی، کچھ دیر بعد وہ سوہیرا کا ناشتہ لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”ناشتہ واپس لے جاؤ اور اشہد حسن کو بلاؤ، جب تک وہ نہیں آئے گا میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔“ اس نے کڑک لہجے میں ملازمہ ٹائپ عورت کو مخاطب کیا، ملازمہ روبوٹ کی طرح ٹرے اٹھا کر واپس نکل گئی، وہ بے چینی سے کمرے کا طول و عرض ناہنے لگی، چند گھنٹوں میں ہی اس اجنبی ماحول میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

”کیا سوچ کر اشہد مجھے یہاں لائے ہیں، بابا کو میری موجودگی کا علم ہو گا یا نہیں۔“ وہ ناخن کترتے ہوئے سوچنے لگی، دوپہر ہونے کو تھی لیکن نہ تو ملازمہ پلٹ کر آئی تھی نہ ہی اشہد آیا تھا، وہ بری طرح جھنجھلاہٹ میں مبتلا تھی، دل کے کسی گوشے میں خوف کا احساس بھی موجود تھا، وال کلاک نے دوپہر کے تین بجائے تھے، جب اشہد کی لینڈ کروزر فارم ہاؤس کے احاطے میں رکھی، وہ بے خیالی میں دانتوں سے ہونٹ کھینچنے لگی تھی کہ اسے اشہد کی گزری ہوئی ساعتوں میں کبھی گئی بات یاد آئی اور اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

دروازہ دھڑ سے کھول کر اشہد کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”کیا تماشا لگا رکھا ہے۔“ وہ کڑے تیور لئے سامنے کھڑا تھا۔

”ناشتہ کیوں نہیں کیا اور کل رات کا کھانا کیا سوچ کر کھالیا تھا۔“ وہ استہزائیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”رات کا کھانا اس لئے کھالیا تھا کہ دو دن سے کچھ کھایا نہیں تھا، ہاتھ پیرن ہونے لگے تھے، ناشتہ اس لئے نہیں کیا کہ آپ کو بلوا کر پوچھ سکوں کہ آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”میرے منع کرنے کے باوجود تم اپنی بیوقوفی کا مظاہرہ کر کے رہیں، کیوں کیا تم نے ایسا، کیوں تم نے پورے خاندان کے سامنے میری ماں کو رسوا کیا، چاچو کو کسی کے سامنے نظریں اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا، دادی کو اس عمر میں تم نے تماشا بنا دیا اور میں، میری محبت کو کھیل سمجھ لیا، تم نے، کیوں کیا تم نے ایسا۔“ وہ اس کے ڈٹ کر کھڑا حساب مانگ رہا تھا۔

”تم نے اور ممانے مجھے مجبور کیا ہے یہ قدم اٹھانے کے لئے، مجھے تم دونوں نے مل کر بیوقوف بنایا، ممما کہتی تھیں کہ تائی جی ماصفہ کو بہو بنانا چاہتی ہیں اور یہ جھوٹ تھا۔“ وہ چیخ پڑی۔

”یہ جھوٹ بولنے کے لئے چاچی کو تمہاری بلا وجہ کی ضد نے مجبور کیا تھا، اپنی من مانی کر کے تم کون سا اپنے پیرنس کو سکھ دے رہی تھیں، وہ تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں کیا یہ ان کا گناہ ہے جب اولاد تمہارے جیسی ضدی ہو تو والدین کو ایسے اقدامات کرنے ہی پڑتے ہیں، اس میں برا کیا ہے، یوں بھی تمہیں تو ماصفہ سے چھیننے کی عادت ہے ہی۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا، وہ اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔

”مجھے گھر جانا ہے۔“ اشہد کا ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی تھا اور سچ تو کڑوا ہی ہوتا ہے، اسے بھی کڑوا لگا تھا، اس نے گھر جانے کی رٹ لگائی۔

”گھر کوئی الحال بھول جاؤ، تم ادھر ہی رہو گی جب تک میں چاہوں گا۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”نہیں پلیز ایسا مت کرو، میں یہاں اس تنہائی سے پاگل ہو جاؤں گی، مجھے گھر جانے دو، میں سب سے سوری کر لوں گی، تائی جی سے، دادی سے، ممما، بابا سے بھی۔“ وہ روہا سی ہوئی، دل میں سوچانی الحال تو یہاں سے نکلوں بعد اس کے انداز پر اشہد نے اسے بغور دیکھا، یہ ظالم لڑکی اس کے دل پر قبضہ کئے بیٹھی تھی۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں رضا ہاؤس چھوڑ آؤں گا، لیکن تمہیں میری ایک بات ماننی ہوگی، تمہیں مجھ سے نکاح کرنا ہو گا، یہیں اس فارم ہاؤس پر، دادی کی مقررہ تاریخ پر میں تمہیں رخصت کر دالوں گا، بولو منظور ہے۔“ وہ پوچھ رہا تھا، جبکہ سوہیرا کے اعصاب کو جھٹکا لگا تھا، اس کی بات سن کر۔

”یہ نہیں ہو سکتا، میں نے آپ سے ملنے سے انکار کر دیا تھا، آپ نکاح کی بات کر رہے ہیں، میں یہ نہیں کر سکتی۔“ وہ ضدی لہجے میں بولی تو اشہد کا خون بواٹنگ، پوائنٹ پر پہنچ گیا۔

”ٹھیک ہے جب تک تمہاری عقل ٹھکانے نہیں آ جاتی یہیں سڑتی رہو۔“ وہ تن تن کرتا کمرے سے نکلا اور فارم ہاؤس سے ہی چلا گیا، جبکہ وہ گھنٹوں میں منہ دے کر رونے لگی۔

دوپہر میں اور پھر رات میں بھی اس نے کھانے کی ٹرے واپس بھجوا دی، نجانے اشہد کو پتا تھا یا نہیں لیکن اس نے پلٹ کر خبر نہیں لی تھی، دوسرے دن اس پر حد درجہ نقاہت طاری تھی، ملازمہ ناشتے کے ساتھ فریش جوس بھی لائی تھی



اور اس نے بنا کسی سے ناز اٹھوائے رزق سے ناراضگی ختم کر دی، کمرہ اب بھی باہر سے مقفل رہتا تھا، اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی، اشہد واپس نہیں آیا تھا، البتہ ملازم کے ہاتھ اس نے سوہیرا کے لئے کپڑے اور دیگر ضروری سامان بھجوایا تھا، سوہیرا کو اس فارم ہاؤس پر ایک ہفتہ ہو چکا تھا، وہ پاگل ہونے کو تھی، اسے لگنے لگا تھا کہ دنیا اس کمرے سے آگے ختم ہوگی ہے۔

☆☆☆

اس نے نہا کر اشہد کے بھجوائے گئے کپڑوں میں سے ایک جوڑا پہنا تھا، اسے سکون نہیں مل رہا تھا، بے قراری حد سے سواتھی، اسے سب یاد آئے جارہے تھے، پاپا، ماما اور حد تو یہ ہے کہ اسے ماضی بھی یاد آ رہی تھی، بے بسی حد سے سوا ہوئی تو اس نے گلاس اٹھا کر دیوار پر پھینچ مارا، ایسی تھوڑ پھوڑ وہ پچھلے ایک ہفتے میں پہلے بھی کر چکی تھی، یہ آج اسے الگ رہا تھا کہ وہ مزید مزاحمت نہیں کر پائے گی، گلاس ٹوٹنے کی آواز پر ملازمہ بھاگی آئی اسے اشہد کی طرف سے تاکید تھی کہ وہ سوہیرا کا خیال رکھے تاکہ وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے، سوہیرا اسے دیکھ کر چیخ پڑی۔

”خدارا اشہد کو بلا دو، میں مر جاؤں گی، مجھے بچا لو، میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“ اس کی کمر لاہٹ سن کر ملازمہ کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں، وہ بنا کچھ کہے واپس لوٹ گئی، شام کے سائے پھیل رہے تھے، جب اس کی لینڈ کروزر فارم ہاؤس کی روش پر آ کر رکی، وہ جب سوہیرا کے کمرے میں داخل ہوا وہاں ملکی اندھیرا پھیلا ہوا تھا، اشہد نے سوچ بورڈ تلاش کر کے لائٹ جلائی، حث کی آواز کے ساتھ کمرہ روشن ہو گیا، اس نے اطراف میں نگاہ گھمائی، وہ حریم مکین دل و جاں کمرے کے وسط میں گھنٹوں میں سر دیئے بیٹھی تھی، سیاہ بال پشت پہ پھیلے ہوئے تھے۔

”سوہیرا!“ اس نے نرمی سے پکارا تو اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی، اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تو اشہد کو لگا کہ اس کے دل کو کسی نے مٹھی میں لیے کر مسل ڈالا ہو، سوہیرا کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں اور خساروں کی کمی بتا رہی تھی کہ وہ روتی رہی ہے، اشہد کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے نزدیک آ کر رک گئی۔

”مجھے منظور ہے میں آپ کی ہر بات ماننے کے لئے تیار ہوں۔“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”میں اس تنہائی سے پاگل ہو جاؤں گی، مجھے گھر جانا ہے۔“ سوہیرا کی پوری بات سننے کے بعد اس نے طویل سانس لیا، اس کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہو چکا تھا، لیکن وہ اپنے موقف سے ہٹ کر سوہیرا سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا، اس نے سوہیرا کو اس فارم ہاؤس پر رکھا تھا، اس حقیقت سے چاچو ہی نہیں تھی واقف تھے، سوہیرا کی ضد نے ان کے غضب کو بھی آواز دے ڈالی تھی، وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ مقررہ تاریخ پر، سوہیرا کو اشہد کے ساتھ رخصت کر دیا جائے، تاکہ برادری والوں کو مزید باتیں بنانے کا موقع نہ ملے۔

”اوکے میں انتظام کرتا ہوں۔“ اس نے نمبر ملا کر سیل فون کان سے لگایا اور کمرے سے باہر نکل گیا، وہ چاچو سے بات کر رہا تھا، دو گھنٹوں کے بعد آگے پیچھے تین گاڑیاں فارم ہاؤس کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھیں، دس منٹ بعد اشہد اور اس کے پیچھے کچھ ایسے چہرے تھے جو اس کے لئے قطعاً اجنبی تھے، ان میں ایک باریش بزرگ بھی تھے، کچھ ہی دیر میں ایجاب و قبول کا مرحلہ طے ہو گیا، اس کا دل بہت بھاری ہو رہا تھا، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھٹ پھوٹ کر رونے لگے، ایسی بے سروسامانی میں اس کا نکاح ہوگا اس

نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، اشہد تمام افراد کو رخصت کر کے آ گیا تھا۔

”چلیں سوہیرا!“ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو چھ رہا تھا، اسی کی آنکھیں آج پھر لو دے رہی تھیں، سوہیرا سب اثبات میں ہلائی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، حلق میں نمکین گولہ پھنسا ہوا تھا، اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا، اشہد نے اس کے لئے لینڈ کروزر کا اگلا دروازہ کھولتے ہوئے اس بغور دیکھا، سرخ ناک اور گلابی آنکھیں اس کی اندرونی کیفیت کو آشکار کر رہی تھیں، پورا راستہ وہ گاہے بگاہے اس پر نظر ڈالتا رہا، جو خود پر ضبط کے پھرے بٹھائے ہوئے تھی، البتہ دل پر آنسوؤں کی کن من ہو رہی تھی، اس کی لینڈ کروزر جب رخصا ہاؤس کے پورچ میں رکی تو سوہیرا اپنے سوالیہ نظروں سے اشہد کو دیکھا، اشہد اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ گیا اور بولا۔

”میں نے چاچو کو بتا دیا تھا کہ تم میرے فارم ہاؤس پر ہو اور یہ بھی کہ میں تم سے نکاح کر رہا ہوں۔“ سوہیرا اپنی جانب کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی اور اندر کی جانب قدم پڑھا دیئے، ماضی کی نظر سب سے پہلے اس پر پڑی تھی، اس کی چیخ نکل گئی۔

”مما باہر آئیں دیکھیں سوہیرا آگئی ہے۔“ اس کی پکار پر بچن میں موجود سائرہ دوڑی آئیں، انہوں نے آتے ہی اسے لپٹا لیا تھا اور اس کا چہرہ چومنے لگیں، ان کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے، بے قراری ان کے انداز سے عیاں تھی، انہوں نے اسے چھوڑا تو ماضی لپٹ گئی۔

”تمہارے بٹا گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔“ اس نے سوہیرا کے گال سے اپنا گال رگڑا تو سوہیرا محبت کے اس مظاہرے پر دنگ رہ گئی، جبکہ کچھ دور کھڑا اشہد ان کا من دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا، وہ بھی خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا

”اشہد بیٹھو کھڑے کیوں ہو۔“ سائرہ نے پکارا۔

”نہیں چاچی! میں گاؤں جا رہا ہوں، اب ذرا اماں کو تسلی کرادوں۔“ اس نے ایک نظر سوہیرا پر ڈال کر کہا تو سائرہ نے اثبات میں سر ہلا دیا، جبکہ ماضی نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

”صبغہ سے کہیے مجھ سے کانٹیکٹ کرے اس کا نمبر بند ملتا ہے۔“ وہ اب تک سوہیرا سے چپکلی ہوئی تھی، ماضی کی بات کا جواب دے کر وہ سوہیرا سے مخاطب ہوا۔

”بائے سوہیرا!“ سوہیرا نے جواب میں سر جھکا لیا۔

”پاپا کہاں ہیں؟“ اشہد کے جانے کے بعد اس نے سائرہ سے پوچھا۔

”تمہارے پاپا کفایت صاحب سے ملنے گئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔“ سائرہ نے جواب دیا۔

”آپ کو پتا تھا کہ اشہد نے مجھے فارم ہاؤس پر رکھا ہوا ہے، پھر بھی آپ لوگوں نے نہ اسے کچھ کہا نہ ہی مجھے اس کی قید سے نکالنے کی کوشش کی۔“ اس نے شکوہ کیا تو سائرہ نے بے بسی سے اسے دیکھا، ماضی فوراً ان کی مدد کو آئی۔

”تمہیں پتا ہے نہ کہ منگنی کے ساتھ ہی شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہو گئی تھی، بلکہ پاپا نے تو کارڈ تک چھپوا لئے تھے، عین وقت پر تمہارے منگنی سے انکار نہ پاپا کو بہت ہرٹ کیا تھا، ساری زندگی انہوں نے نیک نامی کے ساتھ گزاری ہے اب اس عمر میں اولاد کی وجہ سے انہیں جس ذلت کا سامنا کرنا پڑا، اس نے انہیں اندر سے توڑ دیا ہے وہ کسی سے نظر ملانے کی جرأت خود میں نہیں پا رہے تھے، سوہیرا بلیوی آج اتنے دنوں کے بعد پاپا گھر سے نکلے ہیں، اس اطمینان کے ساتھ کہ کفایت نکل کے استفسار پر وہ انہیں بتا سکیں گے



کہ سوہیرا کی شادی مقررہ تاریخ پر ہو رہی ہے، رشتہ طے کرتے وقت تم پر کسی نے دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ پہلا موقع تھا کہ ماصفہ کی بات خاموشی اور توجہ سے سن رہی تھی، سائرہ ایک طویل سانس لے کر شکرانے کے نوافل ادا کرنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

”ممانے اشہد کے ساتھ مل کر مجھے بیوقوف بنایا، عین منگنی کی رسم سے کچھ پہلے میں نے سائرہ آنٹی کی باتیں سن لی تھیں، میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا ان کی باتیں سن کر، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں تھیں، بس مجھے یہ ہی سمجھ میں آیا کہ میں انگوٹھی پہننے سے انکار کر دوں۔“ زندگی میں پہلی بار اس نے ماصفہ سے دل کی بات شیر کی۔

”سوہیرا وہ تمہاری ماں ہیں، انہوں نے تمہیں جنم دیا ہے، تمہارے مزاج سے واقفیت ہے انہیں، وہ تمہیں پہلے بھی کہہ چکی تھیں کہ وہ تمہاری شادی کرنا چاہتی ہیں، پایا بھی یہی چاہتے تھے، لیکن اس وقت تم نے صاف منہ کر دیا۔“ ماصفہ نے آئینہ دکھایا لیکن اس نے پوری بات سنی ہی کہاں۔

”کیا کہہ رہی ہو تم، میری ماں، لیکن دادی تو کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے بن ماں کی بچی کی پرورش کی ہے، اسے ماں کا پیار دیا ہے۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

”ہاں تو میں ہوں نہ، بن ماں کی بچی، مجھے کبھی ممانے اس بات کا احساس نہیں دلایا لیکن اتفاق سے مجھے پتا لگ گیا کہ میری ممانا کی ڈیڑھ ہو گئی ہے، لیکن ممانے بھی کوئی کی نہیں ہونے دی، مجھے اکثر لگتا تھا کہ تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو، جب ہی تم ہر بات میں ممانے اور مجھ سے اختلاف کرتی ہو، تم نے مجھے کبھی موقع ہی نہیں دیا اپنے نزدیک آنے کا، پلیز سوہیرا سب بھول جاؤ تمہارے رویے سے ممانہ بہت دھمی ہوئی ہیں، میں

نے اکثر تنہائی میں انہیں روتے دیکھا ہے، انہوں نے مجھے جنم نہیں دیا، لیکن ایک بچی کی طرح پالا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں ان کا دکھ اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں، وہ بہت عظیم ہیں، سوتن کی اولاد سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرنا آسان نہیں ہوتا، تم سب کچھ بھول نہیں سکتیں۔“ ماصفہ ان کے دونوں ہاتھ تھامے مٹی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”آئی لو یو ماصفہ!“ ایک دم ہی سوہیرا نے اسے بچ لیا۔

”تم نے مجھے اتنی بڑی خوشی دی ہے، یقین کرو مجھے لگتا تھا کہ میں پوری دنیا میں تھلہوں، ایسے میں جب ممانا کو تمہارے ناز اٹھاتے دیکھتی تو اندر آگ سی جلنے لگتی تھی، دل چاہتا تھا سب کچھ تمہیں نہیں کر دوں۔“ وہ ایک ایک بات کھولنے لگی۔

”آئی لو یو مامی ڈیر سسٹر۔“ جواباً ماصفہ نے اس کا رخسار چوم لیا۔

”اب بس مجھے اشہد سے دو دو ہاتھ کرنے ہیں، انہیں ذرا ترس نہیں آیا مجھے اس ویران جگہ پر ایک کمرے میں قید کرتے ہوئے، کوئی ایسے بھی گرتا ہے۔“ اس نے موڈ بدل کر دانت کچکچائے، اس کے انداز پر ماصفہ ہنس پڑی۔

”وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں، تمہارے منگنی سے انکار نے انہیں پاگل کر دیا تھا، صبح سے بات ہوئی تھی، وہ بتا رہی تھی کہ بھائی رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں، ایسی حالت میں وہ شہر آئے تھے، راستے میں تم انہیں مل گئیں تو بنا سوچے سمجھے تمہیں فارم ہاؤس چھوڑ آئے اور ان کے اسی اقدام کی وجہ سے آج تم سزا اشہد بن گئی ہو، بے جا ضد کی وجہ سے تم اپنی زندگی خراب کرنے چلی تھیں۔“ ماصفہ نے اسے سمجھایا تو اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تھا، اسی وقت حسن

رضا کی گاڑی کا بارن سنائی دیا تھا۔

اس نے اشہد کے بارے میں کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا، کچھ لمحوں بعد حسن رضا کے ناموں کی مخصوص آہٹ سنائی دی تو اس نے لٹریں جھکا دیں، اسے معلوم تھا کہ اب وہ ان سے کچھ نہیں کہہ پائے گی، وہ شرمندہ تھی کہ اس نے منگنی سے انکار کر کے انہیں پوری برادری کے سامنے شرمسار کر دیا تھا، وہ ان سے ناراض بھی تھی کہ ان کی شہ پر اشہد نے اسے ویران فارم ہاؤس پر قید کر کے رکھا تھا، اسے پتا تھا کہ آج وہ ان سے کچھ نہیں کہہ پائے گی، وہ اس کے پاس آ کر رک گئے تھے، کچھ لمحوں کے بعد حسن رضا کا ہاتھ اس کے سر پر آ کر ٹھہر گیا، تب لمحوں میں اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں، چند لمحوں کے بعد انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹایا اور ”خوش رہو“ دعا دیتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆  
دو دن کے بعد گھر پر مہمان جمع ہونا شروع ہو گئے، کل اسے مایوں بٹھایا جانا تھا، ممانہ تمام تیاری کر چکی تھیں، مایوں والے دن دادی اور تانی جی بھی آ گئے، صبح کی ضد کے باوجود ماصفہ نے اسے سوہیرا کے کمرے میں داخل نہیں ہونے دیا، سب اس طرح کا رویہ اپنائے ہوئے تھے، جیسے گزشتہ کچھ روز پہلے رضا ہاؤس میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا، کچھ دیر پہلے ہی وہ رسم کے بعد کمرے میں آئی تھی، زرد کپڑوں اور تازہ پھولوں کے گہنے پہنے اس کا روپ کسی کو بھی پاگل کرنے کو کافی تھا، وہ گھٹنوں پر چہرہ نکائے سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی، بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کا موبائل بج رہا تھا اس نے موبائل اٹھا کر اسکرین پر نظر ڈالی، اشہد کا لنگ کے الفاظ روشن تھے، اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر

ابھرا، اس نے موبائل دوبارہ سائیڈ پر ڈال دیا، وہ اشہد سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی، اس کے دل میں اشہد کے لئے بہت غبار بھرا ہوا تھا، موبائل بج کر خاموش ہو چکا تھا، دھڑکنے سے دروازہ کھول کر ماصفہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”اشہد بھائی کا فون ہے، لینڈ لائن پر وہ تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں، کہہ رہے ہیں کالی دیر سے تمہارے سیل پر نمبر ٹرائی کر رہے ہیں، تم کال ریسیو نہیں کر رہیں۔“ ماصفہ نے اشہد کا پیغام دیا لیکن وہ پہلے والی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔

”سوہیرا میں تم سے مخاطب ہوں، اشہد بھائی تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔“ ماصفہ نے اپنی بات دہرائی۔

”ماصفہ ان سے کہہ دو کہ میں سوچ چکی ہوں۔“ اس نے قدرے رکھائی سے کہا، ماصفہ اسے تاسف سے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی، کھڑکی سے جھانکتا چاند بھی اس کی طرح ادا اس تھا، اشہد کے حوالے سے اس نے کتنے ہی سنے سچائے تھے پر اب وہ اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی، کاش اسے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ اسے ممانے جنم دیا تھا، تو شاید یہ سب نہ ہوتا، وہ کتنی ہی دیر الٹی سیدھی سوچوں کے درمیان ڈوبتی رہی، سائرہ اس کے لئے کھانا لائیں تو وہ چوگی۔

☆☆☆

اشہد نے صبح تک اس کے سیل پر لا تعداد کالز کیں لیکن اس نے ایک کال بھی پک نہیں کی، آج اشہد کی مہندی تھی، اشہد کے ماموں کے گھر پر انتظام کیا گیا تھا، وہ اسی شہر میں ہی رہائش پذیر تھی، تانی جی اور صبحہ ناشتے کے بعد جا چکی تھیں، ماصفہ اور سوہیرا کی فرینڈز کے علاوہ خاندان کی دیگر لڑکیاں مہندی کے تھال اور دیگر سامان کی سجاوٹ میں مصروف تھیں، سائرہ نے کہا بھی تھا



کہ مارکیٹ سے سب سجا سجا یا منگا لیتے ہیں لیکن لڑکیوں نے مان کر نہ دیا، روحہ اس کے ہاتھوں پر مہندی لگا رہی تھی، مہندی لگا کر فارغ ہوئی تو کسی کام سے باہر چلی گئی، عجیب کیفیت طاری تھی اس پر کل وہ اس گھر سے رخصت ہونے والی تھی، اسے اشہد کا گھر بسانا تھا، جس کا تصور کرنا بھی اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا، بار بار اس کی آنکھیں بھر آ رہی تھیں، کمرے کے باہر سے ماصفہ کے تیز تیز بولنے کی آواز آرہی تھی، ساتھ ہی اشہد کی گھبر مگر دلکش آواز سنائی دی تو وہ جو کمر لگا کر بیٹھی ہوئی تھی بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”یہ یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔“ اس نے دونوں لبوں کو آپس میں بچھ کر سوچا، دونوں میں کسی بات پر تکرار ہو رہی تھی، پھر شاید کچھ طے پا گیا تھا، سو خاموشی چھا گئی، وہ بھی مطمئن ہو کر لیٹنے ہی لگی تھی کہ دروازہ کھول کر اشہد کمرے میں داخل ہوا، سوہیرا اسے دیکھ کر سرخت سے بستر سے نیچے اتر آئی، جبکہ وہ مبہوت کھڑا اسے دیکھ رہا تھا، زرد پٹروں میں سرسوں کا پھول لگ رہی تھی، اشہد اس روپ میں اسے بارہا سوچ چکا تھا، سوہیرا نے چاہا کہ سائیڈ سے ہو کر نکل جائے مگر اشہد نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام لی تھی اور اسے اپنے سامنے کیا، ساتھ ہی کلائی فوراً چھوڑ بھی دی، اس کا لمس پاتے ہی جذبے بے لگام ہونے لگے تھے۔

”کیوں کر رہی ہو تم اس طرح، مجھ سے بات نہیں کر رہیں، پاگل کر کے رکھ دیا ہے تم نے مجھے۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا، جبکہ سوہیرا نے نظروں کو زمین سے ہٹنے نہ دیا، وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

”سوہیرا میری طرف دیکھو، میری بات کا جواب دو۔“

”آپ نے بہت ظلم کیا ہے اشہد مجھ پر،“

ایک بل کو آپ کا دل نہیں کانپا، آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں وہ شب و روز کس طرح بتا رہی ہوں۔“ اس کا لہجہ ہیگ رہا تھا، لیکن اب بھی اس نے نظر نہیں ملائی تھی۔

”سکون سے تو میں بھی نہیں تھا، میں نے بھی اپنی حویلی کی خواب گاہ میں اتنی ہی اذیت اٹھائی ہے جتنی کہ تم نے اس ویران فارم ہاؤس کے کمرے میں، لیکن اس حد تک جانے پر مجھے تم نے ہی مجبور کیا تھا، میں نے کہا تھا تم سے کہ کوئی مناسب حرکت نہ ہو، لیکن تم نے پورے خاندان کے سامنے چاچو کا سر جھکا دیا، میری عزت و کوڑی کی کر کے رکھ دی، میں جس نے خاندان کی تمام لڑکیوں کو رد کر کے تمہیں شریک سفر بنا سوہیرا حسن کو اور تم نے عین رسم کے وقت منگنی سے انکار کر کے مجھے سب کے سامنے تماشاً بنا دیا، اگر تم سے محبت نہ ہوتی تو تمہارا بہت برا حشر کرنا، کسی کی لگائی بچائی کی وجہ سے اپنی زندگی کو داؤہ لگانے والے تم جیسے بیوقوف لوگ ہی ہوتے ہیں۔“ ماصفہ نے اسے پوری تفصیل بتا دی تھی۔

”مجھے راہ راست پر لانے کے اور بھی طریقے تھے، آپ آرام سے بھی سمجھا سکتے تھے۔“ اس کے الزامات پر اس نے تڑپ کر اشہد کی گہری آنکھوں میں جھانکا تو وہ موڈ بدل کر دلکشی سے مسکرایا۔

”تمہارے انکار نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا، میں جو روز تمہاری خلوت کے خواب دیکھتا تھا، تمہارا خود کو مجھ سے دور کرنا مجھ سے سہا نہیں گیا، حالانکہ جب میں نے چاچو کو اطلاع دی کہ میں تمہیں فارم ہاؤس پر لے آیا ہوں تو انہیں میرا یہ قدم ناگوار گزرا تھا، لیکن میں نے انہیں سمجھا لیا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بول رہا تھا، سوہیرا اس کی زبان سے خلوت کا ذکر سن کر شیشائی گئی۔

”بتاؤ تمہاری ناراضگی ختم ہوئی یا تم اب بھی غمناک ہو۔“ وہ پوچھنے لگا۔

”میری کھلی کی اگر آپ کو پروا ہوتی تو آپ بابا کی غیر موجودگی میں مجھے نکاح کے لئے مجبور نہ کرتے۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے، چاچو نکاح کے وقت فارم ہاؤس پر ہی موجود تھے، البتہ انہوں نے تمہارے سامنے آنے کی بجائے لاؤنج میں بیٹھنے کو ترجیح دی تھی، انہوں نے مجھے گلے لگا کر مبارکباد بھی دی تھی، اب پلینز اپنا موڈ ٹھیک کر لو، کہ کہیں میری ویڈیو ناٹ تمہاری ناراضگی کی نظر نہ ہو جائے، اس لئے بھاگا آیا ہوں۔“ اس کا لہجہ جذباتوں سے گندھا ہوا تھا اور سوہیرا جو اس کی آنکھوں میں جھانک کر سب کچھ بھولنے لگی تھی، اس کی زبان سے ویڈیو ناٹ کا سن کر قدرے بدحواس ہوئی، پھر سنبھل کر بولی۔

”آئندہ میں کوئی غلطی کروں گی یا کوئی بات نہیں مانوں گی تو کیا آپ مجھے پھر فارم ہاؤس پر چھوڑ آئیں گے۔“

”یار تم ایک دفعہ میرے گھر تو آ جاؤ مجھے پتا ہے کہ تم سے کب کیا منوانا ہے۔“ اس کا لہجہ معنی نیزی سے بھر پور تھا، وہ بری طرح شیشائی اور بے ساختہ بول رہی تھی۔

”اب آپ جانے کا کیا لیں گے۔“

”جو میں مانگوں گا وہ تو تم دو گی نہیں۔“ وہ بدستور شرارت پر آمادہ تھا، جبکہ اس کی شوخیاں سوہیرا کے ہاتھ پیر ٹھنڈے کر رہی تھیں۔

”ماصفہ! ذرا ماما کو بھیجو۔“ اس نے دروازے کی جانب منہ کر کے اسے سارہ کا ڈراوا دیا اور وہ سچ گچ اس کے جھانسنے میں آ گیا۔

”جا رہا ہوں مہنی، بس میرے گھر میں داخل ہونا تو اپنے دل سے بدگمانی کا ہر احساس مٹا دینا، میں نے جو کچھ کیا اپنی محبت کو پانے کے لئے

کیا۔“ وہ اتنا کہہ کر دروازے سے باہر نکل گیا، سوہیرا جو آدھے گھٹنے پہلے تک اس کا تصور بھی نہیں کرنا چاہ رہی تھی، اس کی ذرا سی ملاقات اور اس کی بیٹابیاں سن کر سب کچھ بھول گئی تھی، اس کی آنکھوں میں جھانک کر تو اسے اپنا آپ بھی بھول جاتا تھا، آخر یہ ساری لڑکیاں ایک جیسی ہی کیوں ہوتی ہیں؟

☆☆☆

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

- ☆ اردو کی آخری کتاب
- ☆ خمار گندم
- ☆ دنیا گول ہے
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری
- ☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں
- ☆ چلتے ہو تو چین کو چلے
- ☆ نگر نگر پھر مسافر
- ☆ خط انشائی کے
- ☆ بستی کے اک کوپے میں
- ☆ چاند نگر
- ☆ دل وحشی
- ☆ آپ سے کیا پردہ
- ☆ ڈاکٹر مولوی عبدالحق
- ☆ قواعد اردو
- ☆ انتخاب کلام میر
- ☆ لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور
- ☆ فون نمبرز 7310797-7321690



## شام فراق

صبا جاوید

”کبھی تو اپنے بزنس سے باہر نکل آیا کرو، قائد اعظم کا فرمان کام، کام اور بس کام صرف تم پر ہی لاگو نہیں ہوتا جو تم ہمہ وقت کام کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔“ سحر نے فائل اس کے ہاتھ سے لے کر بند کی اور گلاس میز پر بیچ دی، سحر اس وقت کافی تپتی ہوئی تھی، جواباً وہ نرمی سے مسکرائی تھی۔

”کم آن یار اس نے تمہیں کتنے پیار اور مان سے انوائٹ کیا ہے یہ مصروفیت کا عام سا بہانہ بنا کر تم اتنے پیارے انسان کا دل مت توڑو۔“ اس کی بات پر مسلسل مسکرائی ایمان

ارباط کے ہونٹ بے ساختہ سمٹ گئے، مگر چہرے پر سنجیدگی اور تمکنت ہنوز طاری تھا، جو اس کی شخصیت کا خاصا تھا۔

”کسی کی ضرورت کی چاشنی کو پیار سے

منسوب مت کرو اور آج کے تیز رفتار دور میں پیار و یار کچھ نہیں ہوتا ایوری تھنک از پروفیشنل۔“

ظہرے ہوئے لب و لہجے میں اس نے قدرت کی سب سے بڑی سچائی سے انحراف کیا۔

”مجھے سمجھ نہیں آتی ایمان، آخر تمہاری پرالیم کیا ہے تم کیوں کسی کے سچے جذباتوں کی توہین کر رہی ہو، کائنات کی ہر شے سے پیار کا رنگ چھلکا ہے لیکن تم پھر بھی انکاری ہو۔“ ہر بار کی طرح اس بار بھی ایمان ارباط کے گنے چنے اور ٹھنڈے ٹھار جواب سن کر وہ تلملا اٹھی۔

”سحر کیا ضروری ہے کہ ہم ایک ہی ٹائیک ہر بار ڈسکس کریں، پیار کے علاوہ کچھ کرنے کے لئے بہت سے کام ہیں زندگی میں اور تم کیوں چاہتی ہو کہ میں پیار کو مانوں، میں اقرار کروں،

مکمل ناول

Scan & PDF  
FIAZ AHMED  
Friends Korney.com



ساری دنیا اس چیز کو مانتی ہیں، ڈوبی ہوئی ہے عشق و معاشقے میں، پھر میرے تنہا تلوں وجود کے غافل ہونے یا تردید کرنے سے کوئی طوفان نہیں آجائے گا۔“ اسے یقیناً یہ بات ناگوار گزری تھی تب ہی خفگی بھرے انداز میں بولی، سحر کی متاسفانہ نگاہیں اس کی سیاہ چہرے پر جمی تھیں۔

”بہت بڑی بھول کر رہی ہو، تم کسی کا نہیں صرف اپنا نقصان کر رہی ہو، محض پریشانی پریشانی لائف کا شور کرنے سے زندگی نہیں گزرتی، اس کی بقاء کے لئے کچھ اور عنصر بھی لازم و ملزوم ہوتے ہیں جن میں سب سے مقدم پیار ہے۔“ اس کا لہجہ ٹھوس تھا، جانے وہ اسے سمجھا رہی تھی یا بتا رہی تھی۔

”سحر مجھے وقتی جذباتیت کی ضرورت نہیں ہے ہر انسان کا زندگی جینے کا اپنا طریقہ ہوتا ہے، میری زندگی میں ان چیزوں کے لئے نہ وقت ہے نہ کوئی جگہ۔“ اس کا انداز سچی تھا، چہرے پر پھر وہی جمود در آیا تھا جس نے بھی اس کے باطن کو عیاں نہیں ہونے نہیں دیا تھا۔

”اتنی ضد کس لئے ایمان، تم پیار سے منحرف کیوں ہو، تم کو احساس تک نہیں کہ تم اپنے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کر رہی ہو۔“ وہ جھنجھلائی، وہ جیسے ہر قیمت پر اسے پیار کروادینا چاہتی تھی۔

”سحر تم سچ تان کر بات کو پھر وہیں لے آتی ہو، پیار، پیار، پیار جیسے دیکھو اسی کے پیچھے پڑا ہے، بی پریشانی یار، آج کل کے دور میں کوئی ایسی مجنوں ٹائپ محبت کا وجود نہیں، مجھے یہ خرافات کے سوا کچھ نہیں لگتا۔“ اس سے وہ سحر کو بہت ہٹ دھرم لگی تھی، وہ اپنے مخصوص لئے دیئے اور نرم انداز سے ہٹ کر ضدی اور خود سر لگی تھی اسے، کسی کی نظروں میں خاص ہونا، کوئی ایسا جو صرف آپ کی فکر کرے، جسے ساری دنیا میں آپ سے بڑھ کر کوئی نہ ہو، جو صرف آپ کا احساس کرے، وہ آپ کے لئے سب کچھ کرے اور

بدلے میں ویسا کچھ بھی مانگے، بے ریا اور بے لوث چاہت دے، یہ سب کچھ بہت اذکار رکھ کر اور اچھوتا لگتا ہے، ایک دن تم اس احساس کو محسوس کرو گی، تم پیار کا اقرار کرو گی، تم اس احساس کی تمنا کرو گی اور اس چاہت کی قدر کرو گی، دیکھ لینا۔“ اس نے گویا چیخ کیا تھا، اس کی بے حسی پر سحر کے دل میں سوئیاں سی جھینے لگی تھیں، اس کا بس نہیں چل رہا تھا اسے جھوڑ کر رکھ دے، ایمان ارباط کے لئے یہ الفاظ نئے تھے اس کا پوری زندگی میں ایسے واقعات و احساسات کے واسطے نہیں بڑا تھا۔

”میرنی گزشتہ زندگی ایسے واقعات سے بھرا ہے موجودہ زندگی میں ایسے احساسات کے لئے مجھنا کس نہیں۔“ وہ استہزا آہنی ہنسی، نجانے خود پر یا اپنی حیات کے گورے بے رحم لحاظ پر، بہر حال اس کی ہنسی بہت عجیب تھی۔

”مجھے پتہ ہے کہ میں ایک لا حاصل بحث کر رہی ہوں، تم بہت ضدی ہو، لیکن پھر بھی آخری بار پوچھ رہی ہوں تم چلو گی۔“ اس نے اپنی سی کوشش کی، جواباً وہ زمین سے لیٹے میروں کا پرٹ کو گھورتی رہی اور سحر اتنی نا سمجھ نہیں تھی جو اس خاموشی کا مطلب نہیں سمجھتی، وہ کچھ بھی کہے بغیر آفس سے نکل گئی اس کے ہر اک انداز سے خفگی نمایاں تھی، مگر ایمان ارباط نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی، اس نے چند لمحے خالی خالی نظروں سے ساکت دہلیز کو دیکھا اور اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر آفس سے نکل آئی۔

☆☆☆

اگلی صبح ہی اس کا ٹکڑاؤ حماد گردیزی سے جا لنگ ٹریک پر ہو گیا، ٹھہرتی بج بستہ ہوا میں سردی کا احساس دلارہی تھیں، چند ایک من چلے اس وقت پارک میں تھے جن کے نزدیک سردی کا مطلب جسٹ انجوائے منٹ تھا، لیکن ایمان ارباط کو بانٹنا یہاں جا لنگ کے لئے آتی تھی

بغیر موسم کے تیوروں کی پرواہ کیے، آج بھی ماحول سے لپکتی دھند سردی میں اضافے کا موجب بن رہی تھی، حماد گردیزی یہ بات بہت اچھی طرح جانتا تھا تب ہی اس نے ملنے جلا آیا، حماد گردیزی کو دیکھ کر وہ قدموں کی رفتار سست کر کر چکی تھی، بلیک ٹراؤزر پر بلیو شرٹ پہنے اور بلیک جیکٹ پہنے وہ خوب نو جوان اس کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا، وہ اپنی عادت کے برخلاف خاموش تھا، وہ اس کی خاموشی کا سبب جانتی تھی کل رات دونیہ کی برتھ ڈے پارٹی تھی، حماد گردیزی نے اسے پرسنی انوائٹ کیا تھا، مگر گزشتہ ڈیڑھ برس کی طرح اب بھی اس نے اس کے انتظار کو انتظار ہی رکھا تھا، شاید اسے دکھ ہوا تھا بھی خود کو خاموشی میں چھپا رہا تھا، کیونکہ وہ چاہ کر بھی اس سے ناراض نہیں ہو سکتا تھا اور یہ بات ایمان ارباط بہت اچھی طرح جانتی تھی، وہ چاہتا تھا کہ ایمان ارباط اپنے غلط رویے کو محسوس کرے مگر اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی، وہ ناراض تھا تو بھی وہ اسے منانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی، نیوی بلیو ٹراؤزر کے ساتھ اسکاٹائی بلیو شرٹ زیب تن کیے وہ شاید گرمی منارہی تھی اسے تعجب ہوا تھا اس کا ایک نظر میں جائزہ لے کر وہ رک گیا تھا ناچار ایمان ارباط کو بھی قدم روکنے پڑے۔

”آپ اگر رات کو آئیں پارٹی میں تو مجھے اچھا لگتا، بجائے یہ کہنے کے کہ آپ نہیں آئیں تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔“ وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔

”مجھے کچھ کام تھا۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا، معمول کے مطابق۔

”ایسا کیا کام تھا کہ آپ اپنے دوست کو بھی فراموش کر گئیں۔“ شاید وہ کچھ زیادہ ہی اس کے رویے کو محسوس کر گیا تھا تب ہی باز پرس کر رہا تھا ورنہ وہ ایسا بھی نہ کرتا۔

”میرے اپنے پرسنل میٹرز ہیں، میں آپ کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔“ وہ لحاظ مروت

جیسے الفاظ سے نا بلند دکھائی دیتی تھی۔

”اینڈ بائی دا وے، ہم دوست ہیں؟“ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استفسار کیا گیا۔

”نہیں ہیں؟“ حماد گردیزی محفوظ ہوا۔

”نہیں۔“ اس نے فوراً نفی میں گردن ہلائی۔

”اچھا پھر ڈیڑھ سال کے تعلق کو آپ کیا نام دیں گی؟“ وہ مسکراہٹ دبائے سنجیدگی سے بولا، کچھ دیر پہلے کی کلفت زائل ہونے لگی تھی، وہ اسے اکسار ہاتھا۔

”سالہا سال ایمپلائز ایک فرم میں کام کرتے ہیں اس کا یہ قطعاً مطلب نہیں کہ ایمپلائز اور باس آپس میں دوست ہیں۔“ اس نے بڑے آرام سے جنادیا تھا کہ وہ اس کی فرم میں کام کرتا ہے اور بس۔

”ماتا کہ آپ چیف ایگزیکٹو ہیں اور میں ڈائریکٹر، لیکن پھر بھی ہمارا تعلق اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ اسے ایمپلائز اور ہیڈ سے کمپیئر کیا جائے۔“ اس نے مسکرا کر بات کو طول دی، حماد گردیزی کو اس کی بات گراں نہیں گزری تھی۔

”آپ کو نہیں لگتا کہ ہم ایک بے مقصد موضوع پر بحث کر رہے ہیں۔“ وہ شاید اکتائی تھی۔

”ہر وقت اتنی مختاط مست رہ کر کریں، ہر بات کو انا کا مسئلہ مت بنایا کریں، بھی بھی لا پرواہ ہونا بھی اچھا لگتا ہے، چیزوں کی لائٹ لی لینا سیکھیں۔“ وہ اسے کیا سمجھا رہا تھا کہ وہ چیزوں پر گہری نگاہ رکھنے سے یا فرینک ہونے سے ڈرتی ہے، وہ ابھی بھی، مگر اسے تاثر چھپانے میں مہارت حاصل تھی، وہ حالت سکون میں رہنا پسند کرتی تھی، وہ ہر چیز کو پرسکون انداز میں ٹریٹ کرتی تھی، اسے تنقید کی پرواہ تھی نہ غصے کی، چاہت کا احساس نہ پیار کا، اب بھی وہ بے تاثر چہرہ لے لے ایک بار پھر چل پڑی۔



”ہر کسی کی اپنی لائف ہے جسے وہ اپنی مرضی سے گزارتا ہے میرے خیال میں کسی دوسرے کو اس میں انٹرفیر نہیں کرنا چاہیے اور میں نے آپ سے کوئی مشورہ بھی میں مانگا۔“ جس کا واضح مطلب تھا کہ وہ اس سے دور رہے، وہ شاید کوئی لحاظ برتنا نہیں چاہتی تھی۔

”آپ اتنی پروفیشنل کیوں ہیں، ہم اس وقت اپنے آفس میں نہیں ہیں۔“ اس نے ایمان ارباط کو باور کروایا کہ وہ اسے کے ساتھ بہت روڈی لی ہو کر رہی ہے، وہ ایک بار پھر رک چکا تھا، وہ بے دھیانی میں دو قدم آگے نکل چکی تھی وہ اس کی پشت پر نگاہیں مرکوز کیے تھا، اس کے آواز پر اس کے قدم تھمے تھے وہ مڑی۔

”ہمارے درمیان ایسا کیا ہے، جو میں پرسنل ہو جاؤں۔“ سنجیدگی سے کہتے ہوئے شاید اس نے حماد گردیزی کو شرمندہ کرنا چاہا۔

”آپ چاہیں تو بہت کچھ پرسنل ہو سکتا ہے۔“ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں اور لب مسکرا رہے تھے وہ اسے زچ کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا، اس نے جواب دینے سے احتراز کیا اور لب بھینچ کر اسے دیکھنے لگی، وہ گھر سے سو میٹر وغیرہ پہنچے بغیر ہی نکل آئی تھی، اب کھر جمانی ٹھنڈا اس کی ہڈیوں میں گھس رہی تھی ناک اور کان بری طرح سرخ ہو رہے تھے اس نے بے ساختہ دونوں ہاتھ آپس میں رگڑ کر سردی کی شدت کو کم کرنا چاہا، حماد گردیزی نے اپنی جیکٹ اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔

”یہ پہن لیں، اس وقت آپ کو اس کی ضرورت ہے۔“ اسے ہمیشہ ایمان ارباط کا خیال رہتا تھا، اس کے لائق رہنے کے باوجود خود کو اس کے معاملے میں بے بس محسوس کرتا تھا۔

”تو اس اوکے۔“ اس نے حسب عادت انکار سے کام چلانا چاہا۔

”آپ کو اپنی فکر ہو یا نہ ہو، لیکن کچھ لوگوں کو

آپ کا ہمیشہ خیال رہتا ہے، بیمار پڑ جائیں گی آپ، پھر آفس کا کیا ہوگا۔“ اس نے یہ کہنے کی بجائے کہ پھر میرا کیا ہوگا کہا تھا آفس کا کیا ہوگا۔ آگے بڑھ کر جیکٹ اس کے شانوں پر پھیلائی، وہ خود کو پوز کرنا چاہتی تھی مگر کر نہیں پائی، وہ حیران ہوئی تھی حالت سکون میں ضرب لگی۔

”بائے آفس میں ملتے ہیں۔“ اس نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل آیا، جبکہ ایمان ارباط خالی الذہنی کے ساتھ قریب رکھے بیٹھ گئی، کچھ دیر قبل محسوس ہونے والی ٹھنڈ سے بے نیاز۔

ایمان ارباط بری طرح کام میں محو تھی جب دروازہ ناک کر کے وہ ایک بار پھر آدھکا، وہ جی بھر کر بد مزہ ہوئی، اس کے چہرے کے زاویے بگڑنے لگے تھے مگر اسے خود پر مکمل کنٹرول تھا، وہ کسی کو اتنی اہمیت دینا نہیں چاہتی تھی کہ اس کی آمد پر اس کے تاثرات میں اپنل مچے، چاہے وہ مثبت ہو یا منفی۔

”آپ کام کر رہی ہیں۔“ کی بورڈ پر تیزی سے چلتی اس کی انگلیاں لمحہ بھر کے لئے ساکت ہوئیں لیکن اگلے ہی لمحے وہ دوبارہ اپنے کام میں محو ہو چکی تھی، اس نے ایک بار نگاہ اٹھا کر حماد گردیزی کو یوں دیکھا جیسے اس کی سچ الدماغی پر شک ہو، وہ جانتا تھا کہ اس نے بے تکا سوال کیا ہے مگر اسے ستانے میں مزا بھی تو آتا تھا۔

”دونہ آپ کو یاد کر رہی تھی۔“ اس نے اپنی چھوٹی سسٹر کا نام لیا جو تین بار ایمان ارباط سے ملاقات کا مشرف حاصل کر چکی تھی۔

”ہم ورکنگ آؤرز میں ہیں، آفس میں بیٹھے ہیں یہ ایسی جگہ ہے جہاں پروفیشنل باتیں ہوتی ہیں نا کہ فیمیلی میٹرو ڈسکس ہوتے ہیں، بزنس کے بارے میں کچھ ڈس کراؤب کرنا ہے تو کریں، میرے خیال میں اتنے مسیروز تو آپ کو

ہونے ہی چاہئیں۔“ اسے فیمیلی میٹرز پر بات کرنا خاصا ناگوار آتا تھا، سنجیدگی سے اس کی تہذیب پر چوٹ کی گئی تھی، اس کا چہرہ لمحہ بھر کے لئے متغیر ہوا مگر اگلے ہی لمبے وہ سنبھل گیا۔

”آفس ٹائمنگ ختم ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا اور رہی میٹرز کی بات تو آپ کی کمپنی میں رہا تو بہت جلد سیکھ جاؤں گا۔“ وہ شریر نگاہوں سے اس کی بات کی نفی کر کے بہت مزے میں تھا، اب چپ ہونے کی باری ایمان ارباط کی تھی، اس نے بے ساختہ ریمٹ (ایچ) پر نگاہ دوڑائی جو ساڑھے نو کے ہندسے کو چھو رہی تھی، بہر حال اب وہ اس سے اختلاف نہیں کر سکتی تھی۔

”تو پھر آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں آپ کو تو گھر ہونا چاہیے۔“ یہ سکون انداز میں ٹھنڈا ٹھنڈا جواب موصول ہوا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا، بس خاموشی سے اسے دیکھے گیا، جیسے کچھ کھوج رہا ہو، وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

”ایمان یقین کریں، مجھی بولنا بھی اچھا لگتا ہے میں جانتا ہوں آپ کے الفاظ بہت قیمتی ہیں جسے آپ کو مجھ جیسے انسان پر ضائع کرنا چاہیے مگر ہر سوال کا جواب ہاں، نہیں کچھ نہیں یا خاموشی نہیں ہوتا۔“ وہ طنز کر رہا تھا یا کچھ جتا رہا تھا وہ سمجھ نہیں پائی، مگر وہ ہمیشہ اس پر مہربان رہا تھا اس کی بے رخی کے باوجود وہ ہونے سے مسکرایا۔

”ابھی تک کوئی ایسی قابل ذکر بات ہوئی ہی نہیں جس کا میں تفصیل سے جواب دوں۔“ اس نے سرسری انداز اپنایا۔

”آپ چاہیں تو بہت سی قابل ذکر باتیں ہو سکتی ہیں۔“ انداز ذرا معنی تھا وہ اسے زچ کرنے پر تلا تھا۔

”ویسے کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ آپ وقت کو نہیں بلکہ وقت آپ کو گزار رہا ہے۔“ نجانے وہ پریسبیل تذکرہ کہہ رہا تھا یا اس کی تنہائی پر چوٹ کی تھی وہ تملائی۔

”معاف کیجئے گا مسٹر حماد گردیزی، آپ کو ہر وقت کسی کے اعصاب پر سوار رہنا بہت اچھا لگتا ہے چاہے کسی کو آپ کی ضرورت ہو یا نہ ہو وقت مجھے گزار رہا ہے یا میں وقت کو، اس مانی میٹر، آپ کون ہوتے مداخلت کرنے والے۔“ وہ مروت کی قائل نہ تھی۔

”آپ کا خیر خواہ آپ کا دوست، آپ کا.....؟“ اب وہ مسکرا رہا تھا، اس کی نفی نے اس پر چنداں اثر نہیں کیا تھا، وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ گیا اور اس کے تاثرات انجوائے کر رہا تھا، ضبط سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”عجیب زبردستی کے رشتے گانٹھ رہے ہیں آپ۔“ وہ سچ ہوئی اس کے سکون میں تباہی مچ رہی تھی۔

”آپ مجبور کرتی ہیں ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔“ بڑے آرام سے سارا الزام اس کے سر رکھ دیا گیا۔

”آپ اپنی حد میں رہیے، میں نے آپ کو ایسا کوئی حق نہیں دیا، آپ سے کوئی رشتہ نہیں جوڑا، آئندہ اپنی حد سے باہر مت آئیے گا ضروری نہیں میں ہر بار ضبط سے کام لوں۔“ بیگانگی خود بخود اس کے لفظوں میں سمٹ آئی تھی۔

اس کی مسکراہٹ بڑی تپا دینے والی تھی، وہ جتنا سچ ہو رہی تھی وہ اتنا ہی دوستانہ رویہ اپنا رہا تھا۔

”اوں ہوں، حالت سکون میں خلل برپا ہو رہا ہے، ہینچل مچ رہی ہے، آپ کا موسم بدل رہا ہے، آپ رویے محسوس کرنے لگی ہیں، برف دھیرے دھیرے پکھل رہی ہے، جذبات نمودار رہے ہیں، چاہے غصہ ہی۔ سہی مگر کسی بھی صورت میں احساس آپ کے اندر انگڑایاں لینے لگا ہے، آپ کو ماننا پڑیگا میں نے آپ میں تہذیبیاں پیدا کر دی ہیں، آپ کی شخصیت کے خول پھٹنے لگے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں چمک تھی، انداز ایسا تھا



گویا چیلنج کر رہا ہو۔

”خوش نہیں ہے آپ کی، آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ آپ کہیں کے پرس چارمنگ ہیں، آپ ہر چیز کو زیر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یا مجھے اپنے مزاج کے مطابق ڈھال رہے ہیں، بھول ہے آپ کی، ایسا کچھ نہیں، خوش نہیں کی بنیاد پر عمارت استوار کر رہے ہیں آپ، میری لائقیت کو اپنی اخلاقیات سے منسوب کر کے خود کو بہلا رہے ہیں۔“ اس کے خیالات کی زبردست تردید کی گئی، وہ بد مزہ نہیں ہوا تھا بلکہ بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

”دیکھ لیں ایمان ارتباط، اختصار کے لبادہ میں رہنے والی آپ کی ہستی لفظوں کو جامعیت کا پہناوا پہنانے لگی ہے آپ کی باتوں سے اختصار ختم ہو رہا ہے، آپ کسی شخص کی بلا واسطہ یا بالواسطہ فالو کر رہی ہیں۔“

”کسی شخص۔“ سے حماد گردیزی کی کیا مراد تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی اس نے ایک اور پہلو سے روشناس کر دیا، وہ لب بلیغ گئی، اس نے بحث سے احتراز کیا، فائل سیو کی اور کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر دیا، اس کے ہر انداز سے لائقیت چھلک رہی تھی، حماد گردیزی کو فوراً اندازہ ہوا تھا کہ آج کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔

”گھر نہیں جانا۔“ فوراً ہی بڑے پیار سے پوچھا گیا، گنہگار آواز اس کے اطراف میں گونجی، وہ جانتی تھی محض اس کی وجہ سے حماد گردیزی ابھی تک وہاں تھا ورنہ آفس ناٹمنگ ختم ہو چکی تھی، مگر اسے اس کی فکر پر چڑھنے لگی تھی وہ بیزار ہو رہی تھی۔

”نہیں کچھ کوشش کر چیک کرنی ہے، ایک مارکیٹنگ کمپنی سے رابطہ کرنا ہے کل کی میٹنگ ارنج کرنی ہے۔“ اس نے سہولت سے انکار کیا اور بے مقصد فائل کھول کر بیٹھ گئی۔

”دس بجتے والے ہیں آفس خالی ہو چکی۔“

ہے، بلکہ میرے خیال میں تو پوری بلڈنگ خالی ہو چکی ہوگی اور یہ کام کل بھی ہو سکتے ہیں۔“ وہ رسائیت سے اسے سمجھا رہا تھا، وہ اس کے فکر و احساس میں ہلکان ہو رہا تھا یا گزشتہ گفتگو کا ازالہ کر رہا تھا۔

”آپ کیوں خواجواہ میری فکر میں دبے ہو رہے ہیں، چلی جاؤں گی میں خود ہی۔“ وہ اچھا خاصا چڑھ گئی۔

”ان باتوں کے جواب آپ نہیں سمجھیں گی، میں باہر آپ کا ویٹ کر رہا ہوں، جلدی سے آجائیں، اگر آپ نہ آئیں تو پھر مت کہیے گا کہ میں نے جد کیوں عبور کی۔“ چہرہ سنجیدہ تھا مگر آنکھیں اس کے بس میں نہ تھیں جو مسلسل شرارت پر آمادہ تھیں، اس کے رخسار پر اسٹے تھے، اس نے فائل گلاس میز پر پٹنی اور بیٹڈ بیک اٹھا کر اس کے پیچھے چلی آئی، لفٹ کے ذریعے وہ نیچے آئی ساتھ میں وہ بھی تھا، اپنی فتح پر وہ بہت خوش تھا، ان کا آفس سکیئنڈ فلور پر تھا، وہ آج پھر بغیر جیکٹ جرسی وغیرہ کے آئی تھی، آفس میں پتہ نہیں چلا لیکن پارکنگ تک آتے آتے اس کی ٹانگیں سن ہو چکی تھیں، قطرہ قطرہ رات پکھل رہی تھی، سرد تارکی کی ہر سو حکمرانی تھی۔

”آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں ہر بار آپ کو اپنی جیکٹ دے دوں گا، لیکن اس بار میں ایسا کچھ نہیں کروں گا، ویسے بھی ابھی تو آپ نے پہلے والی بھی واپس نہیں کی، میں اتنے آپسپنس برداشت نہیں کر سکتا، آفٹر آل آپ ہیڈ آف فرم اور میں آپ کی فرم میں کام کرنے والا اور کر۔“ وہ اسے ہنسانے کے جن کر رہا تھا، وہ بہت سی باتیں اس کی طبیعت کے برخلاف کر گیا تھا، ساتھ ہی گزشتہ گفتگو کا حوالہ بھی دیا تھا، وہ باوجود کوشش کے خود کو روک نہیں پائی تھی، ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔

”میں بھی کہوں آپ اتنا کم کیوں مسکراتی

ہیں؟“ اس نے پرسوج انداز اپنایا، ایمان ارتباط حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی، اب وہ کیا کہنے والا تھا، ہر بات میں ایک نیا انکشاف کر دیتا تھا، ہر گزرتے لمحے وہ اس کے قریب آ رہا تھا، وہ جتنا اس سے بے رخی برتی ہوا تھا ہی فاصلہ کم کر دیتا۔

”کیوں کہ آپ کی مسکراہٹ بہت خوبصورت ہے آپ نہیں جانتیں کہ ہر کوئی آپ کی یہ خوبصورتی دیکھے۔“ اس کی طرف جھک کر محض سرگوشی کی جیسے اس نے بہت توجہ سے سنا اور جھنب کر مسکرا دی، اسے ہنستا دیکھ کر وہ جیسے مطمئن ہوا تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ اسے اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولتے دیکھ کر ایمان ارتباط نے استفہامیہ انداز میں دریافت کیا، اس کے سوال کا مطلب جان کر وہ مڑا تھا۔

”آپ جانتی ہیں اس وقت میں تنہا آپ کو گھر نہیں جانے دوں گا، آپ کی خد کا بھی اثر نہیں ہوگا اس لئے احتجاج قبول ہے، خود ہی تشریف رکھ لیں، باقی کی لڑائی گاڑی میں پیٹھ کر لیں گے ورنہ۔“ اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا، وہ اپنے فیصلے پر مصر دکھائی دیتا تھا۔

”ورنہ کیا کر لیں گے آپ؟ کس نے دی ہے آپ کو میری ذمہ داری؟ جو آپ سائے بن کر میرے پیچھے بڑے ہیں، کہاں کے فدا فی فوجدار ہیں جو یوں مجھ کو زیر عتاب لارہے ہیں۔“ اس کی توجہ اسے تو ڈمگانے لگی تھی، اسے ابجھن ہو رہی تھی، اس نے آج تک خود پر انحصار کیا تھا، اس کی فکر اسے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی الٹا وہ کترانے لگی تھی، شاید وہ جانتا تھا اس کی ہر کل سے واقف تھا تبھی پیشگی اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔

”اچھا چلیں آرڈر نہ مانیں ریکویسٹ سمجھ لیں۔“ اسے بدستور وہیں کھڑے دیکھ کر اس نے صلح جو انداز اپنایا، یہ بات تو طے تھی کہ وہ اس سے جیت نہیں سکتی تھی، اس نے تھپتھپا کر ڈال دیئے

اور جھٹکے سے دروازہ کھول کر بیٹھ گئی، اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

”آتم ساری۔“ گاڑی ریورس کرتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”کس بات کے لئے۔“ اکھڑے اکھڑے رویے میں کہا گیا۔

”آج کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔“ وہ پریشان تھا اس کی وجہ سے، وہ حیران ہوئی تھی۔

کیا تھا وہ شخص ایمان ارتباط آج تک نہیں سمجھ پائی تھی، اس کی ہزار بے کاٹی کے باوجود اس کے قریب آتا، بھی اسے زچ کرتا، بھی اس کی مسکراہٹ کے لئے جتن کرتا، بھی چھیڑتا، بھی اس کی فکر میں ہلکان ہوتا، وہ لاشعوری اس کے ہر انداز کو محسوس کر رہی تھی جس کا اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔

”اٹس اوکے۔“ اس نے دھیرے سے کہا اور ونڈ اسکرین سے باہر نگاہیں جمادیں، جواباً وہ زیر لب مسکرایا تھا۔

☆ ☆ ☆ ایمان ارتباط، سلمیٰ اور ارتباط حسن کی اکلوتی اولاد تھی، سلمیٰ ایمان کی پیدائش کے وقت پیچیدگیوں کے باعث جانبر نہ ہو پائیں اور خالق حقیقی سے جا ملیں، ارتباط حسن نے ایمان کو تین سال تک سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی، فل ٹائم گورنس کا مکمل انتظام تھا لیکن انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے ایمان ہر گزرتے لمحے ان سے دور ہو رہی ہے، وہ اس سے ماں اور باپ کا پیار چھین کر زیادتی کر رہے ہیں۔

وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے ان کی سحر کا سورج اس کے رخ روشن کے دیدار سے ہوتا اور چاند اس کو اپنی ہانپوں کے حصار میں لئے ڈھلتا، وہ اپنے پیار کی آخری نشانی کو کھونا نہیں چاہتے تھے، پھر وقت نے کروٹ لی اور فضلہ نے انہیں احساس دلایا کہ



ایمان کو ایک ماں کی ضرورت ہے یوں فاضل ایمان اور ارتباط حسن کی زیست میں چلی آئی، پہلے پہل انہیں ایمان سے کچھ پر خاش نہ تھی، مگر زمین کی پیدائش کے بعد انہیں ارتباط حسن کے پیار کا جھکاؤ زیادہ ایمان کی طرف محسوس ہونے لگا، وہ لاشعوری طور پر اس سے چڑنے لگی تھیں، پھر قدرت نے کایا پلٹی، چھ سالہ ایمان سکول جاتے ہوئے ضد کر کے تین سالہ زمین کو اپنے ساتھ لے گئی، ارتباط حسن اسے سکول چھوڑنے جا رہے تھے واپسی پر ان کی گاڑی کا زبردست ایکسیڈنٹ ٹرالر سے ہوا تھا اور وہ بھی جان کے ساتھ دائمی سفر پر روانہ ہو گئے، فاضل کی زندگی تاریک ہو گئی، ان کی سب سے قیمتی متاع کھو گئی، وہ اس سب کا ذمہ دار ایمان ارتباط کو ماننے لگی تھیں، وہ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے ان کے بہتے آنسو پونچھتی تو وہ جانتیں۔

”مت ڈالو مجھ پر اپنا محسوس ساری، پہلے ماں کی زندگی کو نگلا پھر باپ اور بھائی کو بھی نگلا گئی، اب مجھے تو خود سے دور ہی رکھو۔“ وہ چلا کر اسے دور ہٹا تھیں اور ناتجھ آنے والے انداز میں ان کے پاس بیٹھ کر رونے لگتی، دھیرے دھیرے وقت سرکھتا گیا، سات سالہ ایمان ارتباط نے فاضل کو ایک سخت گیر ماں کے روپ میں دیکھا تھا، وہ ان سے فالتو بات نہیں کرتی تھی ایک ہی گھر کی چھت تلے رہتے ہوئے اجنبیت اور سرد مہری کی دہیز چادر تنی رہتی، ایمان ارتباط چاہ کر بھی یہ چٹچ پات نہیں سکتی تھی، اسے یاد تھا ارتباط حسن اس سے بہت پیار کرتے تھے مگر اب اس سرد ماحول اور تنہائی میں رہتے رہتے وہ پیار کا مطلب بھی بھولنے لگی تھی اس نے کسی کو اپنی فکر میں ہلکان ہونے نہ دیکھا تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ کیسے کیونکہ اور کسے کرتے ہیں، چھوٹی سی عمر میں ہی اس کی خوراکھاری کی زندگی شروع ہو چکی تھی، اس کی

پرورش پتھر لیے جذبات و احساسات کے ساتھ ہوئی تھی جذبات کی نمو سے پہلے ہی وہ خزاں کا شکار ہو کر جل چکے تھے، اس کی طبیعت میں کمال کا ضبط تھا، عجیب ٹھہراؤ اور سنجیدگی تھی، وہ کسی عمل کے لئے کسی کے سامنے جوابدہ نہ تھی، اسے جنوں کی حد تک ڈاکٹر بننے کا شوق تھا مگر فاضل کی ضد پر اسے ایم بی اے کرنا پڑا، اس نے بنا کسی اختلاف کے ان کی بات کو مقدم جانا، وہ ایم بی اے کے پہلے سمسٹر سے فارغ ہوئی تھی جب فاضل نے اسے اطلاع دی تھی کہ وہ اس کی نسبت اپنے بھائی کے اشد سے ملے کر چکی ہیں، اس کی مرضی جاننے کی کوشش نہ کی گئی تھی، اخلاقی طور پر اسے اشد میں کوئی برائی نظر نہیں آئی تھی چنانچہ اس نے حامی بھر لیا، وہ اسے بچپن سے جانتی تھی وہ کافی قابل لڑکا تھا، نئے رشتے کے لحاظ سے اسے اشد سے کافی انسیت محسوس ہونے لگی تھی، مگر ایم بی اے کے فائنل سمسٹر کے بعد ایک دن اشد کی کال آئی اور اس نے بہت سہولت سے اس رشتے سے انکار کر دیا، وہ کم مہم ریسور کو دیکھتی اس رشتے کو یاد کرنا چاہتی تھی مگر اس کا دامن یادوں سے خالی تھا، وہ رونا چاہتی تھی مگر اس کی آنکھوں میں نمی نہ تھی، وہ دکھی ہونا چاہتی تھی مگر اس کے اندر کوئی احساس باقی نہ تھا۔

”کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو احساسات و جذبات کے سایے میں پردان چڑھتے ہیں جو خوشی اور غم میں تفریق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“ اس نے تھک کر سوچا، اس کے خالی ذہن میں نیا نکتہ ابھرا، وہ پھول بننے سے پہلے کی کلی کو نوچ نوچ کر پھینک کر رہی تھی، اسے تار تار کر رہی تھی، وہ کم گو تھی، اس سے مل کر لوگ یہی اندازہ لگاتے تھے کہ وہ مغرور ہے یا آدم بیزار مگر وہ صفائی دینے کی عادی نہ تھی، وہ کسی کی سوچ بدلنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی تھی، وہ تنقید یا

تردید نہیں کرتی تھی، مگر اس کے حالات سکون میں پہلچل حماد گردیزی نے ڈیڑھ سال قبل چٹائی۔

☆☆☆

پہلی بار حماد گردیزی نے اسے جاگنگ ٹریک پر دیکھا تھا، ٹریک سوٹ میں ملیوس، بالوں کے ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھے پاؤں میں جو گرز پہنے وہ اسپورٹس گرل لگ رہی تھی، وہ وہاں موجود تمام لوگوں میں منفرد لگ رہی تھی، حماد گردیزی کو وہ یہی نظر میں ہی متوجہ کر گئی تھی، وہ حسب عادت جاگنگ میں مصروف تھی وہ وہیں بیٹھ کر اسے راؤنڈ لگاتے ہوئے دیکھنے لگا، شاید اس کی نگاہوں کے ارتکاز سے ڈسٹرب ہو کر اس نے قدموں کی رفتار کو بدستور تیز رکھتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، بے دھیانی میں قدم اٹکے بڑھانے کے سبب اس کا پاؤں بہت بری طرح مڑا تھا، بردقت سنبھل کر اس نے خود کو گرنے سے تو بچالیا تھا مگر شدید درد کے باعث وہ ٹھہر نہیں سکتی تھی وہ وہیں بیٹھتی چلی گئی، حماد گردیزی انسانی ہمدردی کے باعث اس کی طرف آ گیا، وہ وہیں بچوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا، اس کا ایک ہاتھ پاؤں کی پٹنڈلی پر تھا اور سر گھٹنوں میں دیئے شاید وہ رو رہی تھی۔

”ہیلومس، آریو اوکے۔“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا، ایمان ارتباط نے آواز کے تعاقب میں سر گھٹنوں سے برآمد کیا، مگر صد حیرت کہ وہ رو نہیں رہی تھی، البتہ لب ضرور بیچ رکھے تھے شاید شدت ضبط کے لئے، اس نے کوئی جواب نہیں دیا، بس انھنے کی کوشش کرنے لگی، مگر درد کی شدت سے یہ ممکن نہ ہو پایا۔

”لگتا ہے کالی سیریس چوٹ آئی ہے، تب ہی آپ چل نہیں پارہی۔“ اس کے پیر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے نفقیش کا اظہار کیا۔

”اگر آپ کو پرانہ گلے تو میں آپ کی مدد کر

سکتا ہوں۔“ اس کے چہرے پر پھیلے نولفت کے تاثرات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس نے جھجک کر کہا۔

”نہیں میں بیچ کر لوں گی۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اس بار پوری ہمت مجتمع کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی، مگر ایک بار اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کی ہڈی جوڑ سے الگ ہو گئی ہو، درد کی شدت سے آنکھیں ٹیسپیں پوری ٹانگ اور پیر کو لاغر بنا رہی تھیں، بھرپور کوشش کے باوجود وہ تیسرا قدم نہیں اٹھا پائی تھی وہ ہانپنے لگی تھی، حماد گردیزی نے اس بار بغیر کچھ کہے اس کا ہاتھ پکڑ کر کچھ اس طرح سہارا دیا کہ ایمان ارتباط کے پیر پہ وزن کم محسوس ہو رہا تھا اور ہاتھ کے ذریعے بہت سارا وزن حماد گردیزی کی طرف منتقل ہو چکا تھا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں، ہاتھ چھڑانا چاہا کہنے کے لئے لب واکے مگر وہ قدم بڑھا چکا تھا۔

”مجھے پتہ ہے لڑکیاں بہت ضدی ہوتی ہیں مگر اتنی ضدی لڑکی پہلی بار دیکھ رہا ہوں، جو سارا دن پارک کے کسی گوشے میں گزار سکتی ہے مگر مدد نہیں لے گی۔“ گویا پہلی ہی ملاقات میں حماد گردیزی نے اسے ”ضدی“ کے لقب سے نوازا دیا۔

”میں نے آپ سے کوئی مدد نہیں مانگی تھی۔“ وہ بیٹھ پر بیٹھ چکی تھی۔

”بعض دفعہ حالات ایسے ہوتے ہیں جب مدد مانگی نہیں جاتی لیکن دوسرے انسان پر واجب ہو جاتی ہے۔“ وہ بھی پاس ہی بیٹھ کر فاصلہ رکھتے ہوئے ٹک گیا جیسے کسی گفتگو کا ارادہ ہو، اسے نجانے کیوں کوفت محسوس ہونے لگی۔

”اب آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں آپ نے زبردستی میری مدد کی اس کا بہت بہت شکریہ اب میرا پیچھا چھوڑ دیں۔“ وہ مدھم مدھم چلتے



لجے میں بولی، اسے غصہ آیا۔

”عجیب انسان ہیں آپ، آپ کی ہیلپ کرنے میں مجھے کیوں انٹرسٹ نہیں اور اخلاقیات سے عاری انسان سے میں کسی خوش اخلاقی کی توقع نہیں رکھتا۔“ حسن کی ناز برداریاں اس نے بھی نہیں اٹھائیں تھیں۔

”آپ اجنبیوں سے خوش اخلاقی کی امید رکھتے ہیں حیرت ہے۔“ گویا مذاق اڑایا گیا، اٹھنے کا ارادہ کرتے ہوئے حماد گردیزی ایک بار پھر بیٹھنے کا ارادہ باندھ گیا بہت غور سے قریب بیٹھی چاندنی کا نظارہ کیا گیا، اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا، اچانک ہی اسے اس لڑکی میں دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی، وہ چاہتا تھا یہ بحث طویل ہو جائے۔

”اچھا اور آپ اجنبی سے بحث کر رہی ہیں۔“ اس نے بڑے سہجے کی بات کی تھی، اسے چپ ہوتا دیکھ کر وہ بہت بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

”اب کیا ہوا جواب نہیں دیں گی۔“ وہ اسے اکسارہا تھا۔

”میں اجنبیوں سے بحث نہیں کرتی۔“

”اوہ گاڈ! آپ نے تو میری بات کا زیادہ ہی اثر لے لیا میں حماد گردیزی ہوں، شناسائی کے لئے اتنا سب تعارف کافی ہے، بس اب ہم دوست ہو گئے، اب آپ مجھ سے بحث کر سکتی ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں چمک تھی، وہ اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

”آپ مجھ سے زیادہ فری ہونے کی کوشش مت کریں، میں آپ کے ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں اور زیادہ خوش فہمیاں مت پائیں، آپ اتنے قابل نہیں ہیں کہ آپ سے دوستی پہلی ملاقات میں ہی کر لوں۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

”چلیں دو چار ملاقاتوں میں تو ممکن ہے۔“

اس نے قیاس آرائی کی، انداز صاف چڑانے والا تھا، جواباً اس نے اسے زبردست گھوری سے نوازا اور پاکٹ سے سیل نکال کر کوئی نمبر پر لیس کیا۔

”ہیلو..... ماما یہاں پارک میں ڈرائیور کو بھیج دیں، میرے پاؤں میں موج آگئی ہے۔“ اس نے کہا اور لائن کاٹ دی، اتنے میں حماد گردیزی کا موبائل بپ کرنے لگا اسے اطمینان ہوا تھا کہ اسے لینے کوئی آجائے گا چنانچہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اللہ حافظ کہا اور مسکراتے ہوئے مڑ گیا، جسے وہ مکمل طور پر نظر انداز کر گئی۔

☆☆☆

دوسری ملاقات حماد گردیزی کی ”اربابا“ پاس میں اس سے ہوئی تھی، رومی اور نصیب کے پہلی ٹرمز تھے اس دن رومی ڈنر پر انوائٹڈ تھیں، دونوں ان کی چھوٹی بیٹی اپنے پاپا کے پاس آسٹریلیا تھی دو ماہ قبل حماد گردیزی آسٹریلیا سے لوٹا تھا، انہوں نے اپنے ساتھ حماد گردیزی کو بھی گھسیٹ لیا، بلیو جینز کے ساتھ ڈائٹ اور اورنج لاٹک شرٹ زیب تن کیے، بڑا سا دوپٹہ کندھے پر لٹکائے وہ سادہ سے حلیے میں کافی لاپرواہ لگ رہی تھی، ایک لمحہ میں وہ اسے پہچان گیا تھا، مگر ایمان ارباط کے چہرے پر شناسائی کا کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا، وہ بہت قارل انداز میں مل رہی تھی، لیکن حماد گردیزی کے دل و دماغ پر اس کا نقش نقش ثبت ہو چکا تھا، کھانے کے بعد فضا اور رومی گپ شب میں مصروف ہو چکی تھیں ایمان ارباط محض فضا کی وجہ سے اس ماحول کا حصہ بنی ہوئی تھی مگر بے نیازی اپنے عروج پر تھی، وہ بہت توجہ سے اپنے ناخنوں کا جائزہ لے رہی تھی، اس سے قبل رومی، ایمان کا تفصیلی انٹرویو کر چکی تھیں اور اس کے دھیمے اور مختصر جوابات نے انہیں خاصا متاثر کیا تھا، واحد حماد گردیزی تھا جس پر شدید بوریٹ کا دورہ پڑا تھا، اتنی ساری خواتین میں

خود کو خاصا مضحکہ خیز محسوس کر رہا تھا وہ چپکے سے اٹھ کر لان میں چلا آیا، رات کافی تاریک اور گہری ہو چکی تھی۔

”حماد کافی بور ہو گیا ہے۔“ بالآخر فضا کو اس کا خیال آئی گیا۔

”ایمان جاؤ کمپنی دو اسے کیا منہ میں گھنگھنایاں ڈال کر بیٹھی ہو۔“ انہوں نے اسے ڈپٹا اور ساتھ ہی حکم صادر کیا، وہ فوراً اٹھ کر بلا پر چلی آئی وہ سامنے ہی لان میں چھل قدمی میں ملن تھا ہوا کے آزاد اور ٹھنڈے جھونکوں نے رات کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا تھا، ادھورا چاند آسمان سے جھانک کر تپائی کے ہیولے بنا رہا تھا، حماد گردیزی کو اپنی پشت پر کسی کا احساس ہوا، اس نے مڑ کر دیکھا اور مسکرا دیا، چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا، پھر خود ہی شروعات کی۔

”اب آپ کا پیر کیا ہے؟“ حماد گردیزی نے اسے احساس دلایا کہ وہ مل چکے ہیں۔

”اب تو ٹھیک ہے۔“ اس نے جواب دیا، گویا وہ اسے پہچان چکی تھی، حماد گردیزی کو حیرت ہوئی جس کا اظہار وہ لفظوں میں کر گیا۔

”آپ نے مجھے پہچان لیا تھا؟“

”جی۔“

”لیکن آپ نے ظاہر نہیں کیا۔“

”مطلب، کہ میں چلا کر آپ سے ملتی یا گزشتہ قہقہے کو خیر لیتی۔“ ایمان ارباط کے الفاظ چبھتے تھے، مگر وہ مسکرا دیا۔

”ویسے یہ دشمنی کی شروعات صرف میرے ساتھ ہے یا ہر ایک کے نصیب میں یہی رویہ لکھا ہے۔“ اس کا اشارہ ایمان کی سخت رویے کی طرف تھا، وہ بہت خوبصورتی سے اس کے لئے رویے پر چوٹ کر گیا، وہ اسے اس کے مزاج کا حصہ قرار دے رہا تھا، مسکراہٹ دیا ہے وہ سنجیدگی سے بولا، یہ ان کی دوسری ملاقات تھی مجال ہے جو

وہ لڑکی ایک بار بھی مسکرا کر اس سے ملی ہو یا بات کی ہو۔

”کسی کے گریز کو آپ دشمنی کا نام دے رہے ہیں۔“ اب کی بار وہ سبھل کر بولی، بلاشبہ وہ بلا کا حاضر جواب تھا۔

”آپ کو مجھ سے کیا خوف ہے جو آپ گریز برتنے لگیں۔“ وہ سنجیدگی پر مائل دکھائی دیتا تھا، جیسے کچھ جاننے کا خواہ ہو۔

”مجھے آپ سے کیا خوف ہوگا، محض آپ کے ذہن کی سوچ ہے جسے بدلنے پر میں قادر نہیں اور آپ کیوں میرے رویے کے پیچھے پڑ گئے ہیں، اگر میں یہاں ہوں تو محض اپنی ماما کے آرڈر کی وجہ سے ورنہ مجھے آپ سے کوئی سروکار نہیں ویسے کیوں مجھے جاننا چاہتے ہیں آپ؟“ ایمان ارباط لگی پٹی رکھے بنا بولی۔

”آپ کو ایسا لگتا ہے۔“ حماد گردیزی کی سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں اسے ابھمن ہوئی تھی مگر اسے کے چہرے پر اطمینان تھا۔

”اب تک تو آپ نے یہی تاثر چھوڑا ہے۔“ اب کی بار اس نے حماد گردیزی کو دیکھ کر جواب دیا جیسے کچھ جتا رہی ہو۔

”اوکے اور کیا کیا تاثر چھوڑا ہے میں نے۔“ اسے جاننے میں دلچسپی ہوئی۔

”میں کسی کا اثر قبول نہیں کرتی اتنا فالتو وقت نہیں میرے پاس کہ تاثرات پر ریسرچ کرتی پھروں۔“ ٹکڑا توڑ جواب آیا، اس نے سنا تھا لڑکیاں نازک ہوتی ہیں شرمیلی ہوتی ہیں، مگر یہ لڑکی تو الگ ہی تھی نہ اس میں نزاکت والی ادا میں تھیں نہ ہی شرمیلی مسکراہٹ، وہ اندر کی طرف بڑھ چکی تھی جس کا مطلب تھا وہ مزید گفتگو کا ارادہ نہیں رکھتی، حماد گردیزی نے ایک لمبا سانس فضا کے سپرد کیا اور اس کے پیچھے ہولیا۔



”تمہیں ایمان کیسی لگی؟“ واپسی پر روٹی،  
حماد گردیزی سے پوچھ رہی تھیں۔  
”کس سلسلے میں؟“ وہ چونکا ہوا۔

”بھئی ویسے ہی پوچھ رہی ہوں۔“ انہیں  
غصہ آیا اس کے لئے سوال پر۔

”اس میں اور آئی میں زمین آسمان کا فرق  
ہے، بہت لڑاکا ہے غصہ تو ہر وقت ناک پر دھرا  
رہتا ہے۔“ وہ یہ سب کہنا چاہتا تھا مگر مناسب نہ  
تھا کیونکہ روجی سے اس نے ایسے کسی انداز کا  
مظاہرہ نہیں کیا تھا، لڑائی کا انداز تو اس نے حماد  
گردیزی سے بھی روا نہیں رکھا تھا وہ بہت  
ٹھہرے لہجے میں بات کرنے کی عادی تھی محض  
اس کے الفاظ کے تنکھے پن سے اندازہ لگایا جاسکتا  
تھا کہ وہ تپتی ہے یا کوئی بات اسے ناگوار گزری  
ہے اور حماد گردیزی یہ بات جان چکا تھا۔

”بہت کم گو ہے۔“ بہت سوچ کر اس نے  
جواب دیا، بہر حال کچھ نہ کچھ رائے تو اسے دینی  
ہی تھی۔

”ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہو، اپنی عمر کے لحاظ  
سے کچھ شوخی و باپکین نہیں ہے اس میں۔“ پتہ نہیں  
افسوس ہوا تھا یا خوشی وہ اندازہ نہیں کر پایا۔

”آپ رنجیدہ ہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”ہاں، فضلہ نے بچی کے ساتھ اچھا نہیں  
کیا، اتنی بڑھی لکھی اور باشعور ہونے کے باوجود  
وہی جاہل اور روایتی عورتوں والی فطرت دکھائی  
ہے۔“ حماد گردیزی کے سر سے بات گزر گئی۔

”مما آپ کے کہنے کا مطلب کیا ہے؟“ وہ  
الجھا۔

”بھئی اسٹیپ بیٹی ہے ایمان، فضلہ کی،  
جب اس کے والد اور بھائی کی وفات ہوئی تو ان  
دونوں میں آسٹریلیا تھی، فضلہ نے ہمیشہ اسے خود  
سے دور رکھا تو وہ ایمان کے سائے سے بھی  
ڈرنے لگی تھی، پہلے بورڈنگ اور پھر پڑھنے

انگلینڈ بھیج دیا، بن ماں کی بچی کیسے رل گئی۔“ وہ  
تمام حالات سے آگاہ تھیں انہیں ایمان سے  
ہمدردی تھی، وہ حقیقت پسند خاتون تھیں انہیں  
فضلہ کا رویہ کسی طور مناسب نہ لگا تھا اور حماد  
گردیزی کے ذہن میں بہت کچھ صاف ہو چکا  
تھا، اسے سمجھ میں آنے لگا تھا کہ ایمان ارتباط اتنی  
مختلف کیسے ہے، روجی خاصی آبدیدہ تھیں تب ہی  
حماد سے اتنی بڑی بات کہہ گئیں ورنہ ایسے  
معاملات وہ خود اپنی ذات تک رکھنے کی قائل  
تھیں۔

☆☆☆

دوبارہ انہیں قدرت نے ملایا تھا مگر تیسری  
بار کے لئے اسے قدرت کا انتظار نہیں کرنا تھا  
اسے خود تیسرے سوچنی تھی اسے ہر حال میں ایمان  
ارباط کو بخیر کرنا تھا۔

بہت اچانک ارادہ بنا تھا لیکن بہت پکا،  
سیسہ پلائی دیوار کی طرح مضبوط، ٹھوس، اس نے  
ایمان ارتباط کی پٹنی میں خشیت ڈال دیکٹر

شمولیت اختیار کر لی اور ڈیڑھ برس سے وہ اس  
کے ساتھ تھا، حماد گردیزی کو ایمان ارتباط کی  
عادت ہو چلی تھی، ہر لمحہ وہ اسے حیران کرتی تھی  
پہلے سے مختلف اور جدا لگتی تھی، وہ جتنا اس کے  
قریب جا رہا تھا چونک رہا تھا، مگر یہ ضدی سی پیار  
سے انکار کرتی اسے اپنا دوست ماننے سے انکار  
کرتی لڑکی بہت بھانے لگی تھی، پہلے اسے دلچسپی  
پیدا ہوئی تھی، وہ اسے نظر انداز کرنے لگی تو وہ  
محبت بن گئی اور اب جب وہ لائق کی حد کر جاتی  
تو حماد گردیزی اس سے عشق کرنے لگا تھا، اس کی  
مرضی جانتا، اس کے تنکھے جوابات پر مسکراتا، اپنی  
فکر سے اسے تسخیر کرنے کی کوشش کرتا، وہ اس  
کے دل کی اولین خواہش بن چکی تھی، وہ پتھر تھی  
تب ہی اس کا عشق اسے نظر نہیں آتا تھا کوئی اور  
لڑکی ہوتی تو اس چاہت کے پر پھل جاتی، مگر وہ

ایمان ارتباط تھی جذبات کو چھپا لینے والی، کسی کہ نہ  
ماننے والی، حماد گردیزی نے گزشتہ برس سے  
اسے اپنے گھر انوائٹ کرنا شروع کیا تھا مگر وہ  
اس کی حوصلہ افزائی نہیں کر پائی تھی۔  
سحر جو اس کی خالہ زاد کزن تھی وہ ہر بار  
اسے سمجھانے کا عہد کرتی مگر ہر بار ایک لا حاصل  
بحث کے بعد ہتھیار ڈال دیتی کہ نتیجہ وہی ڈھاک  
کے تین بات، کبھی بھی اس کا روکھا رویہ حماد  
گردیزی کو دلبرداشتہ کر دیتا مگر وہ اس سے ناراض  
نہیں ہو پایا تھا وہ بھی ہو ہی نہیں سکتا تھا، حماد  
گردیزی کے لئے وہ سب سے مقدم تھی اس کی  
تمام بے رخی اور بے اعتنائیوں کے باوجود۔

☆☆☆

”کیا بات ہے آج میرا کیا ہے؟“ لہجہ نامم  
ہوا تو سحر وارد ہوئی، ورنہ حماد گردیزی کی موجودگی  
اسے ایمان کے پاس پہنچنے نہیں دیتی تھی وہ خود  
بطریق احسن یہ ذمہ داری سنبھالتا، وہ خشیت  
چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ان کی فرم میں کام کرتی تھی،  
ایمان اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر بھی انجان بن  
گئی۔

آج حماد گردیزی نے آفس سے آف لیا تھا  
اور اس کی پچھلے اٹھارہ ماہ میں یہ پہلی پرسنل چھٹی  
تھی اضطرابی طور پر تشویش تو ایمان ارتباط کو بھی  
ہوئی تھی مگر وہ اظہار کی قائل نہ تھی۔

”تم کیا پوچھنا چاہتی ہوں سیدھی طرح  
پوچھو؟“ اس نے لا پرواہی سے کہا۔

”تم جانتی ہو۔“ سحر نے تین لفظوں پر زور  
دیا۔

”میں نہیں جانتی۔“ وہ صاف مگر گئی۔

”میں حماد گردیزی کی بات کر رہی ہوں۔“

اب کے سحر مسکراتی جیسے اس کا فرار سمجھ گئی ہو۔

”اوہ، مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیوں نہیں آیا۔“

اس نے نظر جھکا کر مدھم لہجے میں کہا ساتھ ہی انٹر

کام پر کافی کا آرڈر دیا۔  
”کم آن ایمان، جو شخص گزشتہ اٹھارہ ماہ  
سے تمہارے پیچھے خوار ہو رہا ہے جس نے ایک  
لمحے کے لئے تمہیں نظر انداز نہیں کیا وہ آج یہاں  
نہیں ہے اور تمہیں وجہ بھی نہیں معلوم تمہیں رنی  
برابر اس کی پرواہ نہیں۔“ سحر کوچ کوچ افسوس ہوا۔  
”سحر وہ میرے پیچھے یہاں نہیں آتا، وہ  
یہاں بہت بھاری اور ذمہ دارانہ جاب کرتا  
ہے۔“ نجانے آج کیوں اس کا لہجہ تلخ نہیں تھا  
اس نے سحر سے زیادہ خود کو باور کروایا تھا، بیون  
کافی سرو کرنے لگا تو وہ دونوں گفتگو موقوف کر  
گئیں۔

”تم کس مٹی سے بنی ہو ایمان، تمہیں کیا لگتا  
ہے اس کو اس جاب کی بہت ضرورت ہے، وہ  
تمہیں کہیں سے ضرورت مند لگتا ہے، وہ حقیقت  
میں اتنا دولت مند ہے کہ ایسی بیسوں فرمز کھول  
سکتا ہے اور وہ وقار تمکنت میں بھی اتنا ہی بلند  
ہے، اسے کیا درد دہر ہے جو اپنا فارن بزنس چھوڑ کر  
یہاں تمہاری فرم میں کام کر رہا ہے، کیا یہ اس کی  
پچھو کی فرم ہے جو وہ اس کی فکر میں ہلکان رہتا  
ہے، کوئی اندھی بہری بھی ہوتی نا تو اس قدر  
چاہت کی شدت کو محسوس کر جاتی، مگر تم تو پتھر سے  
بھی زیادہ سخت ہو وہ کس کے لئے کر رہا ہے یہ  
سب کچھ، کیا چاہ ہے اس کی، تم سب جانتی ہو،  
بخوبی سمجھتی ہو، آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت  
بدل نہیں جائے گی۔“

اس نے دوبارہ سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا  
جہاں سے توڑا تھا، اس کا انداز سمجھانے سے  
زیادہ بتانے والا تھا، ایمان نے بہت غور سے اس  
کی بات سنی، یہ سب کچھ وہ بہت پہلے سے جانتی  
تھی مگر اثر قبول کرنے اس کی سرشت میں نہ تھا،  
محض ایک دن کی حیا گردیزی کی غیر موجودگی  
اسے بہت کھل رہی تھی وہ بات بے بات اسے



سوچ رہی تھی اور جھنجھلا رہی تھی۔

”تم اس کی دکالت کر رہی ہو؟“ وہ اکتائی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے اسے دکالت کی ضرورت ہے، اس کا ہر انداز رویہ رکھ رکھاؤ اور تہذیب اس کی جاذبیت اور وجاہت و وقار کا چیخ کر اعلان کرتی ہے۔“

”اب اس بحث کا مقصد؟“ وہ سنجیدگی کی انتہا پر تھی۔

”شاید وہ ہمارا ماننا نہیں چاہتی تھی وہ اس کی اہمیت قبول کرنا نہیں چاہتی تھی۔“

”مقصد یہ اس کی طبیعت یا ساز ہے کل رات سے بخار میں پھنک رہا ہے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے اس کی مزاج برسی کرنے کے لئے، آفس کے تعلق سے نہیں تو فیملی ٹرمز کی خاطر، یوہو ٹو کم و دمی (تمہیں میرے ساتھ آنا پڑے گا)۔“ اس کا انداز تحکمانہ تھا، ایمان کا دل لہجہ بھر کے لئے ڈنگا گیا تھا، ایک دم ہر چیز سے دل اچاٹ ہونے لگا، مگر لہجہ بھر کے لئے وہ سنبھل چکی تھی۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”ہر کوئی تمہاری طرح لا تعلق نہیں ہوتا، کال کی تھی میں نے اسے، دونیہ سے بات ہوئی تو اس نے بتایا۔“ لہجے میں طنز کی آمیزش تھی، یہ بات تو طے تھی کہ وہ سحر کے ساتھ کہیں بھی جانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے شام کو چلتے ہیں، لیکن اب چہرہ تو درست کرو، غصے سے دیکھو جھریاں پڑ جائیں گے۔“ نجانے کیسے اقرار اس کی زبان سے پھسل گیا، وہ خود پر حیران ہوئی۔

”دیش گریٹ۔“ وہ اٹھلائی۔

”اب سچ کے لئے چلیں؟“ کافی کا خالی مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ہاں چلو۔“ ایمان ارباط نے حامی بھری۔

☆☆☆

”چپ چاپ یہ سوپ ختم کرو حماد۔“ اسے منہ بسورتا دیکھ کر روجی نے ڈپٹا۔

”مما پلیز میرا بالکل موڈ نہیں ہے۔“ اس نے لاڈ سے منہ بسورا، کل رات سے اس کی طبیعت خراب تھی صبح وہ پھر بھی آفس جانے کے لئے تیار تھا، مگر روجی نے اچھا خاصا ڈپٹ کر اسے بستر میں گھسایا اور اب وہ اس کی ناز برداریاں اٹھا رہی تھیں۔

”مما آپ رہنے دیں، میں اسے منالیتی ہوں۔“ دونیہ نے ماں کے ہاتھ سے پیالہ لیا۔

”حماد کوئی ضد نہیں چلے گی۔“ جاتے جاتے وہ پھر تنبیہ کر گئیں، دونیہ نے ماں کے نکلتے ہی سوپ سائڈ ٹیبل پر رکھا، وہ جانتی تھی، حماد گردیزی نہیں مانے گا۔

”بھیا پاپا آپ کو واپس بلا رہے ہیں، ان کے خیال سے بہت آرام ہو گیا جب سے آپ ایمان کے ساتھ کام کر رہے ہیں نہ پاپا آسٹریلیا سے آئے اور نہ آپ واپس گئے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں جانتا ہوں، میں نے سوچا نہیں تھا کہ یہ کام اتنا لمبا ہو جائے گا، دل تو میرا بھی بہت اداس ہے پاپا کو بہت مس کر رہا ہوں اور آج کل تو ان کی ضرورت سخت محسوس کر رہا ہوں۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”ایمان ارباط کتنی مشکل پسند شخصیت ہے شاید وہ خود بھی نہیں جانتی، اسے تسخیر کرنا گویا چاند کو پانے کی تمنا کرنا ہے۔“ اس نے دھتتی رگ چھیڑی، نجانے کیوں حماد گردیزی کو موہوم سی امید تھی کہ وہ متفکر ہوگی اسے کال کر لے گی، اس کے بارے میں پوچھے گی مگر دن ڈھل چکا تھا اور اس کی امیدیں دم توڑنے لگیں تھیں، اس دھان پان سی لڑکی نے اس لہجے چوڑے چھٹ بندے

کو لے بس کر چھوڑا تھا، اس کی جی حضوری میں اسے سکون محسوس ہوتا تھا، حماد گردیزی کا دل ہماری سا ہونے لگا، اسے اپنی محنت اکارت محسوس ہو رہی تھی، پہلی بار مایوسی اسے اپنے گھیرے میں لے رہی تھی، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لڑکی آج بھی اپنے اصولوں پر قائم ہے، اس کے سب اندازے غلط ہیں کہ وہ اسے محسوس کرنے لگی ہے، عجیب اضمحلال چھایا تھا۔

”مجھے لگتا ہے آپ ایمان جیسے ہونے لگے ہیں خاموش طبع۔“ اس کی مکمل خاموشی میں لپٹا دیکھ کر وہ شرارت سے بولی۔

”ویسے ایمان بہت ٹیرھی کھیر ہے آپ سے نہیں بٹنے والی۔“ وہ پھر ایسی، حماد گردیزی جانتا تھا کہ دونیہ گردیزی اس کے موڈ کو بحال کرنے کے جتن کر رہی ہے۔

”کیا تمہیں اپنے بھائی پر یقین نہیں؟“ اس نے مصنوعی حقیقت سے دونیہ کو گھورا۔

”پورا یقین ہے اور آپ جیسی شاندار پر سنائی کو ایمان جیسی مشکل پسند لڑکی ہی سوٹ کرتی ہے کوئی سیدھی سادی نہیں چلے گی، آپ بہت اچھے ہیں اور ایمان آپ کے بہترین ذوق کا ثبوت ہے۔“ اس نے بھائی کی پسند کی داد دی، روجی اور دونیہ اس کے دل کی بات سے واقف تھیں، تب ہی اس کی سرگرمیوں کا نوٹس نہیں لیتی تھیں اور اسے واپس پاپا کے پاس بھیجنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔

☆☆☆

”آفس تو الگ بات ہے اس کے علاوہ بھی ہمارے کچھ تعلقات ہیں، جن کی بناء پر تمہیں ملنے آنا چاہیے، مگر تم نے تو قسم کھالی ہے کہ بھی ”گردیزی کا بیچ“ کا رخ نہیں کرو گی۔“ سحر اور ایمان ارباط گردیزی کا بیچ پہنچ چکی تھیں، روجی نے ان کا پر تپاک استقبال کیا، رسی علیک سلیک

کے بعد انہوں نے ایمان سے بھرپور شکوہ کیا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”بس آنٹی مصروفیت میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہتا۔“ اس نے بودا سا بہانہ گھڑا۔

”حماد کیسا ہے آنٹی؟ اچانک اسے کیا ہو گیا، کل تک تو ٹھیک ٹھاک تھا۔“ سحر اصل مدعا کی طرف آئی۔

”وہ کہاں اپنی صحت کی پرواہ کرتا ہے، اچھے خاصے تیز بخار کو معمولی نمپر پچر گردان رہا تھا مگر میں نے بھی ایک نہیں سنی، بہت مشکل سے بستر تک محدود کیا ہے، ملوگی تم اس سے؟ چلو میں تمہیں اس کے کمرے میں لے چلتی ہوں۔“ روجی اٹھ کھڑی ہوئیں، سحر بھی چل دی مگر ایمان تذبذب تھی۔

”مانتی ہوں میڈم آپ حماد گردیزی کے سائے سے بھی ڈرتی ہو، آپ جھجک رہی ہیں لیکن یہ دنیا کا اصول ہے کہ جس کی عیادت کے لئے آیا جائے خود اس کے پاس جانا پڑتا ہے، عیادت کے لئے ناکہ وہ خود آپ کے پاس آتا ہے اپنی عیادت کروانے۔“ سحر نے اس کے ان میں طنز جھاڑا اور ساتھ ٹھوکا بھی دیا۔

”اف کیا میں واقعی حماد گردیزی کو خود اپنے اعصاب پر سوار کر رہی ہوں، روز تو ملتی ہوں اس سے کھا تھوڑی جائے گا مجھے، اب کیا پر اہلم ہے بھلا۔“ اس نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا اور پر اعتماد قدم اٹھاتی چل دی۔

سامنے ہی بیڈ پر سینے تک کھبل تانے وہ دراز تھا، دونیہ اس کے سرہانے بیٹھی جانے کیا راز و نیاز کر رہی تھی، اسے دیکھتی ہی وہ سیدھا ہوا، دونیہ نے بھی جگہ چھوڑ دی۔

”آپ کو اپنے گھر دیکھ کر بہت خوش ہو رہی ہے ایمان بیوی۔“ اس نے گلے ملتے ہوئے



دو نیہ نے پورے خلوص سے کہا اور اس چاہت پر وہ خواہ مخواہ نادم ہونے لگی۔

”می ٹو۔“ وہ بدقت تمام مسکرائی۔

”اب کیا محسوس کر رہے ہو حماد صاحب۔“ سحر نے پھولوں کا خوبصورت بو کے حماد کو تنہا کیا۔

”اب ٹھیک ہوں۔“ اس نے ذومنعیت سے بھرپور انداز میں کہا تو سحر بات سمجھ کر مسکرا دی، نظروں کے نوکس وہ پری چہرہ تھی، جو آج اپنے انداز سے بہت ہٹ کر تھی، ایمان نجانے کیوں شیشانے لگی تھی، حماد گردیزی کا دل چاہ رہا تھا پوری دنیا کو سر پر اٹھالے، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ دشمن جاں اس کے لئے یہاں تک آئی تھی، اس کی آنکھیں رنگ بدلنے لگی تھیں۔

”ویسے خیریت دریافت کرنے کا فرض تو آپ کا بھی بنتا ہے۔“ وہ شوخی سے بولا تو ایمان نے نگاہیں چرائیں، وہ آج نگاہیں نہیں ملارہی تھی نجانے کیوں وہ سرشار ہو رہا تھا، کچھ کچھ مطلب سمجھنے لگا تھا۔

”ابھی تو آپ نے بتایا کہ آپ ٹھیک ہیں۔“ اس نے کہا تو وہ مسکرا دیا بڑے بھرپور انداز میں اور پہلی بار ایمان ارباط کو اس مسکراہٹ سے ابھن نہیں ہوئی تھی۔

”یہ جھوٹ بول رہا ہے ایمان، تم خود چیک کر لو ابھی تک حرارت ہے اسے، مگر میڈیسن کو تو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اس نے۔“ بیٹے کے بدلتے انداز کچھ دیر پہلے کی مغمومیت اور اب چہرے سے چھلکنے والی خوشی انہیں بہت کچھ سمجھا رہی تھی گو اس نے خود کو مکمل کنٹرول میں رکھا تھا۔

”میں؟“ وہ جھلائی۔

”ہاں تم۔“ انہوں نے زور دیا۔

ایمان نے تھرما میٹر کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں تو بے مراد واپس لوٹ آئیں، ناچار وہ

اٹھ کر اس کے بیڈ کے کنارے تک آئی، ذرا اس کی طرف جھکی اور اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا، حماد گردیزی نے آنکھیں بند کر لیں، اسے اچھا نہیں لگا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی مقام طبیعت کے برخلاف کچھ کرے، مگر پھر بھی اسے ایمان ارباط کا نرم لمس اپنے اندر تک اترتا محسوس کیا تھا، اس کی پیشانی کو چھوتے ہی ایمان کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے دکھتا انگارہ چھو لیا ہو، اس نے بے ساختہ اپنی پہلی تین انگلیاں اس کے گال پر جمادیں حماد گردیزی نے فٹ سے نگاہیں دوائیں وہ کسی نیچے کی طرح اس کی پیشانی اور چہرے کو چھو کر سلی کر رہی تھی، اس کے چہرے پر مطمئن تھا جیسے اس نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا جبکہ حماد گردیزی کا اندر تک بدل گیا ان لمحوں کے زیر اثر۔

”بہت جھوٹ بولتے ہیں آپ، بری طرح تپ رہے ہیں آپ، دوسروں کو سمجھانے والے، خود اپنی ذات سے بچوں کی طرح لا پرواہی برتنے کے مجھے نہیں معلوم تھا اور انہی بتا رہی تھیں کہ آپ نے میڈیسن بھی یوز نہیں کیں، میرے سامنے ابھی کچھ کھائیں اور دوائی لیں، جلدی سے تو انا ہو کر آفس جوائن کریں میں اور کام کا حرج برداشت نہیں کروں گی۔“ وہ بہت دوستانہ انداز میں اسے ڈپٹ رہی تھی۔

شاید پہلی بار وہ اس انداز میں بولی تھی، حماد گردیزی کا حیران ہونا بجا تھا، پھر اس نے بہت فرمانبرداری سے سوپ کا پیالہ بھی ختم کیا اور شرافت سے میڈیسن بھی لی، آئی تو اس کی فرمانبرداری پر نہال ہی ہو گئیں، اسے پیشانی پر بوسہ دے کر وہ باہر نکل گئیں، جبکہ سحر کی شریک نگاہیں ایمان کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

”چلیں سحر میں آپ کو اپنے ٹرپ کی اسپینس دکھانی ہوں۔“ اس نے محض سحر سے کہا تھا

تو ایمان ارباط تہذیب کے خلاف کیسے جاسکتی تھی، دونیہ سحر کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے گئی، تو ایمان بیڈ کے بائیں جانب دوسرے صوفے پر ٹپک گئی۔

”کیسا دن گزرا آپ کا؟“ وہ کچھ جاننے کا متمنی ہوا۔

”آپ کیوں جانتا چاہتے ہیں؟“ وہ سابقہ موڈ میں لوٹ آئی۔

”کیا ضروری ہے آپ ہر دفعہ سوال کا جواب سوال سے دیں، بعض دفعہ جواب دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا، خود کو اتنا بھی پیچیدہ نہیں بناتے۔“ وہ پھر صلاح دے رہا تھا جو اب وہ خاموشی اوڑھ گئی، حماد گردیزی نے نگاہیں پھیر لیں اور سائڈ ٹیبل کی طرف جھکا، جہاں جگ اور گلاس موجود تھا، اس کی حرکت کا مشاہدہ کر کے وہ بولی۔

”آپ رہنے دیں میں دے دیتی ہوں۔“ وہ اس کی بات مان گیا تھا اس کا اندازہ اسے واپس سیدھے ہوتے دیکھ کر ایمان نے لگایا تھا، جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر اس نے حماد گردیزی کو تنہا جو اس نے دیکھے بنا تھام لیا، ایمان ارباط کو وہ کیا سمجھانا چاہتا تھا ایسا رویہ برت کر، وہ انجھی۔

”آپ کے بغیر دن بہت ادا اس گزرا، کیونکہ آج مجھے کوئی چڑانے والا نہیں تھا۔“ اس نے بہت سوچ کر لفظوں کا انتخاب کیا کہ اب جواب دینا ناگزیر تھا، وہ بہت فتح سے مسکرایا تھا، وہ اس کے انداز سمجھنے لگی تھی، نظریں جھکائے وہ سوچ رہا تھا۔

”آپ کچھ سوچ رہے ہیں؟“ اس کو بدستور نیچے دیکھتے ہوئے دیکھ کر ایمان بولی۔

”آپ مجھ پر غور کرنے لگی ہیں۔“ اس نے نقطہ اٹھایا، وہ بتا رہا تھا یا پوچھ رہا تھا۔

”تو۔“ اس نے استفسار کیا۔

”تو۔۔۔۔۔ مجھے اچھا لگا۔“ وہ کچھ سوچ کر بولا، اب کی بار اس کی نگاہیں گہری تھیں وہ بھٹکنے لگا تھا بہت کوشش کے باوجود۔

”بہت لیٹ ہو گئے ہیں پتہ نہیں یہ سحر کہاں رہ گئی میں چلتی ہوں۔“ گھبراہٹ میں وہ اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید بھی نہیں کر سکی تھی، وہ ایسے ہی اس کی منہ زور جذبات سے بھاگ جایا کرتی تھی اور یہ بات حماد گردیزی جانتا تھا، مگر آج وہ خوش تھا، اس نے بو کے کے اندر ٹاپ پر آدھا اندر اور آدھا باہر جھانکتا کارڈ نکال لیا، جس پر ”گیٹ ویل سون“ کے حروف درج تھے، اس نے مسکراتے ہوئے کارڈ دراز میں ڈال دیا۔

☆☆☆

”مما آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے، لائیں میں دبا دیتی ہوں۔“ ایمان نے کہا اور نرمی سے ان کا سر دبانے لگی، کچھ دنوں سے ایمان کا رویہ رخ بدلنے لگا تھا، بچپن سے ہی فضلہ نے اپنے اور ایمان کے درمیان فاصلے پیدا کر دیے تھے مگر گزرتے ماہ و سال نے پروا رخ کر دیا ان کا فیصلہ غلط تھا جو ان کی ایمان کی خوشیاں نگل گیا، مگر اس حقیقت کم متکشف ہونے تک بہت دیر ہو چکی تھی، ایمان ارباط اپنے وضع کردہ اصولوں میں رہنے کی عادی ہو چکی تھی، اس کے عادات و اطوار چھٹکی اختیار کر چکے تھے، وہ تنہائی کے خول میں سمٹ گئی تھی، انہوں نے نا صرف اپنے لئے بلکہ ایمان کے لئے بھی تا عمر کشی یا سیت، محرومی اور قید کا سودا کیا تھا، وہ چاہ کر بھی اسے واپس اپنے پاس نہیں بلا پائیں، مگر گزشتہ چند دنوں سے ایمان ارباط انہیں حیران کر رہی تھی، وہ ان کے لئے ناشتہ خود تیار کرتی، بہت توجہ سے انہیں کرواتی، جب تک فضیہ کی طرف سے مطمئن نہ ہو جاتی آفس نہیں جاتی تھی، بیچ ٹائم گھر ہوتی رات کو پہروں ان سے باتیں کرتی، ان کی دوائی کے اوقات کا خاطر



خیال رکھتی، چھٹی کا سارا دن ان کی ہیرانی میں گزرتا، وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا بناتی، گویا وہ محبت کرنے اور جتانے کے ہنر سے واقف ہو گئی تھی ایمان ارتباط ان کی تنہائی بانٹنے لگی تھی وگرنہ آج سے پہلے اس نے ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، الفاظ دیگر اسے احساس ہی نہ تھا، فضا زندگی کے امتحانوں سے تھک گئیں تھیں، چاہت کا یہ انداز انہیں چٹانے لگا تھا یا شاید وہ خود سے لڑتے لڑتے تھک گئیں تھیں۔

”مما میں آپ کے لئے چائے بناؤں۔“ وہ متفکر تھیں، وہ ان کے قریب مگر نیچے کارپٹ پر دوڑاؤ ہو کر بیٹھ گئی، اس کی سوالیہ نگاہیں فضا کے چہرے پر جمی تھیں۔

”ایمان محبت کی یہ دلکش ادائیں تم نے کہاں سے سیکھیں، میں نے تمہیں کبھی پیار نہیں دیا۔“ بہت اچانک انہوں نے سوال کیا۔

”حماد گردیزی سے۔“ اس نے کہنا چاہا مگر نام لبوں تک آتے آتے اندر ہی دم توڑ گیا۔

”مما یہ سب بھلا سیکھنے والی چیزیں ہیں بس ہم دونوں نے مصروفیت کو زندگی بنا کر ایک دوسرے کو فراموش کر دیا، گو کہ یہ فراموشی بہت تکلیف دہ تھی مگر تب کوئی احساس دلانے والا نہ تھا۔“ اس کے تصور میں حماد گردیزی کا عکس جھلکایا۔

”مجھے معاف کر دو ایمان، میں نے تمہیں اتنے برس تک ایک ناکردہ گناہ کی سزا دی، بہت دیر سے تمہاری طرف پلٹنے کی کوشش کر رہی تھی مگر بے نیازی کی خلیج بہت گہری تھی رابطے کی تمام راہیں تو میں خود ہی بند کر چکی تھی، تمہیں اپنی خاموشی میں مگن دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ تم اس رویے اور ماحول کی عادی ہو چکی ہو، مگر میں کیا کرتی ایمان، میں نے تین سالہ ننھا وجود کھویا تھا، میں نے مامتا کا رتبہ کھوایا تھا، میں نے اس

شخص کا پیار کھو دیا جسے پانے کے لئے میں نے اس کی پہلے سے شادی اور بٹی کو بھی قبول کیا، لیکن مجھے وہ داغ مفارقت دے گیا، اس کی جدائی نے مجھے وحشت زدہ کر دیا، مجھ سے جینے کی امنگ چھین لی، مجھ سے غلطی صرف اتنی ہوئی کہ بجائے یہ کہ میں تم میں اپنی مامتا تلاش کرتی اور تمہارے وجود سے ارتباط حسن کی خوشبو چراتی، میں نے تمہیں دھتکار دیا، خدا کے کیے گئے کام کی ذمہ دار تمہیں ٹھہرایا، میں نے تمہیں اپنی زندگی بنانے کی بجائے ارتباط حسن کی آخری نشانی کو بھی اپنے دھک میں اذیت کے حوالے کر دیا، مگر خوش میں بھی نہیں ہوں میرا دل من بھی مسرتوں سے خالی ہے، کیونکہ ایمان ارتباط بھی خوش نہ تھی۔“

ان کی پرسکون لہجے میں برسوں کی تھکن تھی، پیٹ نہیں کتنے ریزہ ریزہ خوابوں کی کرجیاں تھیں، وہ گھر لوٹا کر تہی داماں تھیں، ایمان ارتباط کو اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہوا تھا، بے ساختہ اس کے ہاتھ اپنے چہرے تک گئے، وہ رو رہی تھی، وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرائی۔

ارتباط حسن کی موت کے بعد پہلی بار اس کی آنکھوں میں نمی آئی تھی اور وہ خوش ہو رہی تھی، وہ کوشش کے باوجود کبھی رو نہیں پائی تھی، اسے احساس ہوا تھا ان آنسوؤں نے اس کے دل کی بنجر زمین کو ہرا کر دیا تھا۔

”میں محسوس کر رہی ہوں، اندر سے کوئی احساس کی کوئیل پھوٹ رہی ہے۔“ اس نے سوچا، اپنی کفار سس ستانے کے بعد فضا بلک بلک کر رو رہی تھیں ایمان ارتباط بھی روئی تھی پوری شدت اور ایمانداری سے کہنے کو کچھ نہ تھا، زبان چپ، ذہن خالی۔

”ایمان میں نے تمہیں کبھی پیار کی لغت سے آشنا نہیں کروایا میں نے تمہارا بچپن چھین لیا، تمہارے احساسات کو مردہ کر دیا، تو تم کیسے اپنے

ساتھ ہونے والی نا انصافی پر احتجاج کرتی، مجھے معاف کر دو ایمان۔“ اسے بازوؤں میں بٹھینچے وہ سسک رہی تھیں ایمان ارتباط کے اشکوں میں روانی آئی۔

”مما پلیز، مجھے گزرے لمحات سے کچھ لینا دینا نہیں، بس جو میرے پاس ہے اور کھونے کی مجھ میں ہمت نہیں، میرے لئے آپ سے بڑھ کر کچھ نہیں، اگر مجھے پتہ ہوتا کہ میری چاہت میری ماں کو نام کر دے گی تو میں تمام حیات لائق میں گزار دیتی۔“

”جنتی رہو ایمان، میرے دل سے ہمیشہ تمہارے لئے دعا میں نکلیں گی مجھے لگ رہا ہے جیسے آج میں حج معنوں میں ماں بنی ہوں، ہم نے ثابت کیا ہے کہ تم ارتباط حسن کی اولاد ہو، وہ بھی ایسا ہی تھا فراخ دل، باوقار، باصلاحیت، مجھے خبر ہے کہ وہ ایمان ارتباط جیسی قیمتی متاع حیات میرے سپرد کر گیا۔“ فضا نے بہت محبت سے اس کی پیشانی چوم لی، اس نے ان کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں موندیں، وہ بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی خود کو، اس نے اپنی ماں کو پایا تھا، محض چند دن کے لائحہ عمل سے وہ ان کی محبت کو جگا چکی تھی، حماد گردیزی نے نہ صرف پیار کروایا تھا بلکہ سیکھایا بھی تھا، وہ اس کے انداز کے اثرات کو قبول کر رہی تھی اور لاشعوری طور پر اسے اپنے لئے کر بھی رہی تھی اسے خود یہ سب معلوم نہ تھا مگر وہ حیران تھی، یہ سب اتنی جلدی کیسے؟ مگر قدرت نے یہی طے کیا تھا، نجانے قدرت کو اور کیا منظور تھا۔

☆☆☆

ایمان ارتباط کی طبیعت گزشتہ چند ماہ سے بہت خراب رہنے لگی تھی آئے روز کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا، وہ شدید بیمار تو نہیں تھی لیکن چھوٹی مولی بیماری آئے دن مسئلے کھڑی کر دیتی، کبھی بخار، کبھی سردی، کبھی کمزوری، محسوس ہوتی، روحی،

دونہ اور حماد گردیزی اسے دیکھنے آئے تھے مگر تب تک وہ ڈاکٹر کے پاس ریگولر چیک اپ کے لئے جا چکی تھی، فضا نے پہلے پہل کچھ خاص نوٹس نہیں لیا مگر مسلسل طبیعت خرابی نے انہیں بھی تشویش میں مبتلا کر دیا، انہوں نے اس کی نہ نہ کے باوجود اس کے تمام ٹیسٹ کروائے تھے، کچھ ٹیسٹ رپورٹس کلیئر آچکی تھیں کچھ کارڈز لٹ آتا باقی تھا، آج کافی دنوں بعد وہ آفس آئی تھی، حماد گردیزی نے اسے پرل سوٹ میں ملبوس دیکھا تو جیسے اسے اک پل میں زندگی حسین لگنے لگی، وہ سچ تک تمام ضروری کام نمٹا کر اس کے پاس چلا آیا۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ کہنے کے ساتھ ہی وہ مسکرایا تو ایمان نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

”ایک دفعہ آپ نے میری خیریت دریافت کی اور اب میں گر رہا ہوں، آپ مجھ پر کوئی احسان رکھنا نہیں چاہتیں نا، اس لئے خود بیمار پڑ گئیں کہ قرض باقی نہ رہے۔“ اس کا بھی شکوہ کرنے کا اپنا انداز تھا، اتنے دنوں کی غیر حاضری پر وہ کتنا ڈسٹرب رہا ہے وہ جانتی تھی، وہ اس کے شکوہ کرنے کے انداز سے بھی واقف تھی۔

”آپ کو ایسا لگتا ہے وگرنہ میرے وہم و گمان میں بھی ایسا قرض نہیں تھا۔“ اس نے مسکرا کر اعتراف کیا۔

”لگتا ہے آپ کھانا پینا بھول گئی ہیں، بہت کمزور لگ رہی ہیں، سچ ٹائم ہو رہا ہے سب کام چھوڑیں اور چلیں پہلے سچ کرتے ہیں۔“ اس نے نیا نکتہ اٹھایا۔

”نہیں میرا کچھ بھی کھانے کا موڈ نہیں۔“ اس نے صاف بچنا چاہا۔

”میں آپ سے پوچھ نہیں رہا ہوں کہ کیا



اس نے پر اعتماد انداز میں کہا پھر اچانک اس کا موبائل بپ کرنے لگا گھر کا نمبر تھا، اپنی ماں سے اسے کیا پرسنل بات کرنی تھی لہذا اس نے ایمان کے سامنے ہی فیس کا بٹن پریس کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔

”یس ماما..... لنچ..... نہیں میں گھر نہیں آ سکتا۔“ وہ شاید اسے سچ پر آنے کے لئے کہہ رہی تھیں۔

”وہ اصل میں ماما..... میں نے ایک دوست سے پراس کیا ہے، اب اگر میں نہیں گیا تو وہ ناراض ہو جائے گا۔“ وہ شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، دوست کس دوست کے بارے میں بات کر رہا تھا وہ سمجھ رہی تھی ایمان کو لگا اسے یہاں سے جانا چاہیے اس نے حماد گردیزی کے پہلو سے نکل جانا چاہا مگر بہت تیزی سے اس نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی، وہ ششدر تھی۔

ایمان ارتباط بہت حیرت سے اسے اپنے بہت پاس کھڑا دیکھ رہی تھی، لیکن اسے احساس نہیں تھا وہ بہت بے خیالی میں اس کی کلائی تھامے گفتگو میں محو تھا، ایمان گردیزی کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ کال سے فارغ ہوا تو اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ برہم ہوئی۔

”کیا؟“ وہ انجان بنا۔

”ہاتھ چھوڑیں میرا۔“ اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑانا چاہا مگر گرفت مضبوط تھی، اس نے مسکراتے ہوئے بہت نرمی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا، ایمان ارتباط نے کلائی سہلاتے ہوئے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی۔

”گستاخی کی معافی چاہتا ہوں، مگر اس وقت آپ کو روکنا ضروری تھا، بس بھیجی انسان

بس سے باہر بھی تو ہو جاتا ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا تو وہ رخ موڑ گئی۔

”آتم ساری ایمان۔“ اسے خاموش پا کر وہ ایک قدم آگے بڑھا کر اس کے سامنے آیا اور پھر معذرت کی۔

”اس اد کے۔“ وہ اسے نادیدہ دیکھ نہیں پائی تھی اور حماد گردیزی کو اس کی ناراضی مقصود نہ تھی۔

”اب چلیں مجھے لنچ کروائیں۔“ اس نے حماد گردیزی کو گزشتہ واقعے کے اثر سے نکالنا چاہا اور یہ بات وہ جانتا تھا۔

”آپ۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”بس اب اور کوئی وضاحت نہیں، مجھے کچھ برا نہیں لگ رہا، اب باتیں بند کریں میرا بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔“ وہ خوشی سے بولی، اس کی سنجیدہ طبیعت پر یہ باتیں بہت سچ رہا تھا، وہ اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”اب چلیں بھی۔“ وہ اس کی نگاہوں سے خائف ہوئی اور باہر چل دی۔

”پتہ نہیں یہ سب اتنی جلدی کیسے ہو گیا، میں اتنی جلدی ماما کے قریب ہو گئی، میں نے ان کی محبت فتح کر لی ہے، بعض اوقات میں سوچتی ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ سب اتنی جلدی عطا کیوں کر دیا، مجھے جانے کیوں خوف محسوس ہوتا ہے اتنی خوشی کیسے سنبھالوں، میری زندگی مکمل ہو گئی ہے۔“

وہ اپنے ذاتی معاملات اس سے ڈسکس کر رہا تھا سچ کے دوران اس نے اس سے ڈیروں باتیں کیں، وہ اسے اہمیت دے رہی تھی وہ بس خوش تھا کیونکہ آج ایمان ارتباط خوش تھی۔

”یہ سب کچھ جلدی تو نہیں ہوا، بہت سال آپ نے ان کے لوٹنے کا انتظار کیا ہے، بس خواخواہ کی سوچوں کو اپنے ذہن میں جگہ مت

دیں۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

”تھینک یو صداد..... یہ سب آپ نے مجھے سکھایا ہے۔“ وہ تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا آپ کو میں کوئی غیر دکھائی دیتا ہوں جسے آپ شکر یہ کہہ رہی ہیں۔“ اسے سچ میں تکلیف ہوئی تھی اور ایمان ارتباط کو بھی تکلیف محسوس ہوئی اپنے الفاظ کی غیر موزونیت کا احساس ہوا تھا، کیونکہ حماد گردیزی تکلیف میں تھا۔

”نہیں آپ غیر نہیں ہیں آپ تو میرے اپنے ہیں۔“ اس نے وضاحت دی اور وہ بھی بہت غیر متوجہ اور جلد بازی میں۔

”ہاؤ سوٹ، بھیجی جلد بازی میں نکلے جملے بھی کتنے اچھے ہوتے ہیں بس آپ کا پورا جملہ ٹھیک ہے اس میں سے اپنے کا لفظ حذف کر دیں تو۔“

آج وہ کس موڈ میں تھا وہ سمجھ نہیں پائی، آج سے قبل اس نے بھی کوئی قابل اعتراض بات نہ کی تھی، اس کی بات کا مقہوم سمجھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

”چلیں۔“ وہ لنچ سے فارغ ہو چکے تو ایمان ارتباط نے کہا۔

”آف کورس۔“ اس نے رضا مندی دی اور وہ ہوٹل سے نکل آئے۔

☆☆☆

عجیب آنکھ جھولی چل رہی تھی، کبھی ایمان ارتباط آنس آتی تو حماد گردیزی غائب ہو جاتا، وہ آنس آتا تو ایمان غیر حاضر ہو جاتی، آج پھر حماد گردیزی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا، اس کی کچھ میٹنگز تھیں اسے ناٹم ہی نہیں ملا کہ اس کے بارے میں معلوم کرتی اگلے دو دن بھی اسی مصروفیت میں نکل گئے، وہ لائق تھی تو سب

ٹھیک تھا وہ اس کے پاس تھا ایمان ارتباط کو احساس ہوا تو قدرتی طور پر وہ اس سے دور رہنے لگا تھا، تیسرے دن اس کا ضبط جواب دے گیا، اسے حماد گردیزی پر بھی غصہ آیا تھا جو بنا اسے انفارم کے غائب ہو گیا تھا، اسے کال کرنا بہت عجیب لگ رہا تھا وہ بھی خود سے پھر نجانے کیسے اس نے حماد گردیزی کا نمبر ڈائل کر کے فیس کا بٹن پریس کر دیا، مگر لائن بزی تھی، دوسری بار ٹرائی کرنے کی کوشش اس نے نہیں کی، اب اسے سچ سچ پریشانی ہونے لگی، اس نے بے ساختہ گھر کے نمبر پر کال کی، تیسری ہی منٹ پر کال ریسیو کر لی گئی۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف دونیہ تھی۔

رسمی دعا سلام کے بعد وہ خاموش ہو گئی، اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کیسے حماد گردیزی کے متعلق دریافت کرے۔

”بھیا تو ایئر پورٹ کے لئے نکل چکے ہیں، وہ آج کی فلائیٹ سے آسٹریلیا جا رہے ہیں پاپا کے پاس۔“ دونیہ نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے خود ہی بتا دیا۔

”آپ کو تو پتہ ہو گا نا۔“ وہ حیران ہوئی۔

”ہاں..... مجھے معلوم ہے۔“ وہ گڑبڑائی۔

”کن تک آئیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”پتہ نہیں، وہ تقریباً دو سال بعد جا رہے ہیں۔“ اس کے کہنے کا مطلب تھا کہ قیام لمبا ہے اور ایمان سمجھ رہی تھی، پھر بے دلی سے جبراً دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فون رکھ دیا، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہاتھ سے کچھ پھسل رہا ہے، وہ حماد گردیزی کو کھور ہی ہے اسے اپنا دم نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”تم نے مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ مجھے ایک دفعہ انفارم ہی کر دیتے۔“ اس کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا وجود



کاٹ رہا ہے، وہ مرے مرے قدموں سے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی، فضلہ ایک فیشن شو کی آرگنائزیشن کے لئے کولمبیا جا رہی تھیں۔

”ایمان بیٹا، ایک دفعہ ٹکٹ کی کنفرمیشن کے لئے کال کر لو۔“ انہوں نے کہا تو تقریباً ساڑھے بارہ بجے اس نے ایئر پورٹ کال کی۔

”سوری میم، آسٹریلیا جانے والی فلائٹ کریش ہو چکی ہے، یہاں بہت ہلچل ہے، تھوڑی دیر میں صورتحال قابو میں آتی ہے تو ہم آپ کو ریگولر سروسز پرووائڈ کریں گے۔“ اس کے سوال کے جواب میں ریسپنڈنٹ نے کہا۔

ایمان ارتباط نے کچھ نہیں سنا تھا اس کے ذہن میں بس ایک یہ جملہ گردش کر رہا تھا کہ۔

”آسٹریلیا جانے والی فلائٹ کریش ہو چکی ہے۔“ اسے سچ معنوں میں زمین اپنے قدموں سے کھسکتی محسوس ہو رہی تھی اور وہ گھپ اندھیرے میں کھڑی تھی۔

”اس پلین میں تو حماد گردیزی بھی تھا۔“ اس کا ماؤف ہوتے ذہن میں دوسرے گھر کرنے لگے۔

”نن..... نہیں..... تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“

اس نے خود کلامی کی، اس کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں، وہ بہت کچھ سوچنا چاہتی مگر دماغ سن ہو رہا تھا، دن بے توازن ہو رہا تھا اس کی ٹانگوں نے اس کا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا تھا وہ تیوراکر زمین پر گر پڑی، وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو اسی پرائیویٹ ہاسپٹل میں پایا جہاں اس کا باقاعدہ چیک اپ چل رہا تھا۔

اس نے بہت آہستگی سے نگاہیں وا کیں، چند لمحے تک اس کا ذہن بالکل خالی تھا پھر دھیرے دھیرے اسے اپنی سماعت سے ٹکراتا اس

شعور کی دنیا میں لے آیا۔

وہ بے قراری ہو کر اٹھ بیٹھی، وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی، کھڑکی کے پاس کھڑا حماد گردیزی فوراً اس کی طرف آیا تھا۔

”ایمان آریو آل رائٹ ناؤ (کیا اب آپ ٹھیک ہیں؟)“ اس کے لہجے سے بے تابی چھلک رہی تھی۔

”نہیں تم حماد گردیزی نہیں ہو، تم کوئی اور ہو، مجھے شک لگا ہے تب ہی میرا ذہن تمہاری شکل کے علاوہ کوئی اور صورت قبول نہیں کر پا رہا۔“ وہ خود کو تاویلیں دینے لگی وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے پلے سے اتر آئی، وہ اسے اپنا الوژن قرار دے رہی تھی۔

”قارگاڈ سیک ایمان، پلینز کچھ تو بولو۔“ اس کی خاموشی اسے ڈرا رہی تھی۔

”تم۔“ وہ اس کے قریب آئی، اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو چھونا چاہا لیکن پھر فوراً جھٹک گئی۔

”اگر میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں تو میں اسے توڑا نہیں چاہتی اگر تم میرا خیال ہو تو میں تمہیں چھوٹا نہیں چاہتی کہیں میرا خیال ٹھیک نہ ہو جائے، تم میرے سامنے رہو، چاہے خواب ہی سہی، تم یہیں رہو چاہے میرا ٹھہر بن کر ہی سہی۔“ وہ مدھم سروں میں بول رہی تھی اور آنکھوں سے سادون جاری تھا۔

”کیا ہو گیا ایمان، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔“ وہ اس کی ہلکی ہلکی باتوں سے الجھا تھا۔

ایمان ارتباط نے باہر نکلنا چاہا، مگر حماد گردیزی نے اسے شانوں سے تھام کر روک لیا کہ وقت کی ضرورت تھی، اس کے ہاتھوں کا گرفت محسوس کر کے وہ جیسے خواب سے چونکی مگر جیسے ہوش آیا تھا، کوئی نخیل کوئی خواب نہ تھا واقعی حماد گردیزی تھا۔

”کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو؟ پاگل بنا رکھا ہے تم نے مجھے، بیوقوف سمجھتے ہو مجھے؟“

”جب تمہارا جی کرے گا مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے اور جب دل چاہے گا واپس آ جاؤ، میں ایک کھلونا ہوں تمہارے نزدیک۔“

”جہاں جانا ہے جاؤ، ابھی مت آنا میرے پاس۔“ اسے لگا تھا وہ پانی بن کر بہہ جائے گی، عجیب بے بسی تھی وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔

حماد گردیزی حیران ہوا تھا وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اتنا شدید رد عمل محض اس کے اتنا تہ بتانے کی وجہ سے ہے کہ وہ آسٹریلیا جا رہا تھا۔

”آپ پلینز ریلیکس ہو جائیں، آپ کو بتائے بغیر میں کہیں نہیں جا رہا میں یہیں ہوں آپ کے پاس۔“ حماد گردیزی نے اسے شانت کرنا چاہا۔

”نہیں حماد گردیزی تم مجھ سے دور رہو، مجھے محبت اس نہیں آتی، میری ماں نے مجھ سے بہت محبت کی ہوگی، اس نے ایک ایک گھڑی گن کر میری آمد کا انتظار کیا ہوگا مگر پھر کیا ہوا، وہ چلی گئی تبھی نہ واپس آنے کے لئے میں نے زمن سے پیار کیا، بے انتہا پیار کیا وہ بھی مجھ سے ناراض ہو گیا، میں نے پایا کو چاہا اپنی زندگی سے بھی زیادہ انہوں نے بھی مجھے جدائی کا غم دیا، میں نے کتنی دعائیں لیکن اللہ تعالیٰ سے کہ مجھے بھی زمن اور پایا کے پاس بلا لے مگر اس نے میری التجاء قبول نہیں کی، میری محبت کی تشریح بس چھٹنا ہے، میرا پیار کسی کو اس نہیں آتا اب میں تم سے پیار کرنے لگی ہوں حماد گردیزی، خود کو بہت روکنے کے باوجود بھی میں خود کو روک نہیں پائی، میں اس بار موت کو جیتنے نہیں دوں گی میں اپنے دل سے تمہارا پیار نکال دوں گی میں تمہیں اپنی زندگی سے نکال دوں گی مگر موت کو زندگی پر ترجیح حاصل کرنے نہیں دوں گی، میں تاریخ بار بار نہیں

دہراؤں گی۔“ وہ سکتے سکتے بے حال ہو رہی تھی اس کی آنکھوں میں اضطراب تھا، خوف تھا، وحشت تھی اور نجانے کیا کیا تھا حماد گردیزی کو سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ اس کے اقرار پر خوش ہو یا اس کے خوف پر افسردہ۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا ایمان، سارے خوف اپنے دل سے نکال دیں، حماد گردیزی کو کچھ نہیں ہوگا کیونکہ ایمان ارتباط اس کے لئے دعا کرتی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے یقین دلانا چاہا۔

”نہیں..... تمہیں کچھ نہیں پتہ..... میری بات سنو تم جاؤ یہاں سے، چھوڑ دو مجھے۔“ وہ ہڈیانی انداز میں چلانے لگی تھی، حماد گردیزی نے بہت نرمی سے اس کے دونوں ہاتھ تھامے تھے اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ اس نازک مگر پیچیدہ لڑکی کو کیسے سنبھالے، وہ چلاتے چلاتے خاموش ہوئی تھی، اس کی مسلسل روٹی آنکھوں میں دنیا جہاں کا درد سمٹا تھا، وہ چند لمحے اس کا ضبط سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھتی رہی، پھر بہت ہار مان کر اس نے حماد گردیزی کے چوڑے سینے کا سہارا لیا تھا۔

”مجھ میں اس کچھ کھونے کا حوصلہ نہیں ہے۔“ وہ دھیرے دھیرے بول رہی تھی اور بلکلے لگی تھی اس بار پہلے سے زیادہ شدت تھی، حماد گردیزی نے اسے چپ نہیں کروایا، اس نے اسے بازوؤں کے گھیرے میں بھی نہیں تھاما تھا وہ اپنی طرف سے کوئی جسارت نہیں چاہتا تھا وہ اس کا سہارا استعمال کر رہی تھی یہ اس کی مرضی تھی وہ اسے روک نہیں سکتا تھا مگر خود سے حق جتانے پر بھی وہ خود کو حق بجانب نہیں گردانتا تھا، اس کی محبت میں پاکیزگی تھی، خلوص تھا، وفا تھی، اس نے اپنے کسی خواب میں بھی اسے چھونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کافی دیر آنسو بہانے کے بعد ایمان ارتباط کو



احساس ہوا تھا کہ وہ اس کے سینے سے لگی ہے، وہ آنکھیں رگڑتے ہوئے فوراً دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔  
”آتم ساری۔“ آنکھیں اور ناک رگڑتے ہوئے وہ تادم ہوئی۔

”اٹس اوکے، آپ نے تو میرے ضبط کا امتحان لینے کی مکمل کوشش کی تھی وہ تو بندہ پرور خاصا جینٹل مین تھا جو شرافت کا مظاہرہ کر گیا۔“ شرارت سے کہتے ہوئے وہ سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا، حماد گردیزی کی اب اس کی طرف پشت تھی وہ اس کے تاثرات دیکھ نہیں پاتی تھی، اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ پوری گفتگو میں آپ کی جگہ ”تم“ کا صیغہ استعمال کرتی رہی تھی۔

”سوری..... میں نے آپ کو تم کہا۔“ پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ایمان نے کہا۔

”جی ہاں، آج تو کافی بدتمیزی کر چکی ہیں آپ۔“ وہ شرر ہوا تو ایمان ارتباط مسکرا دی، اس کی آنکھوں میں مسلسل رونے سے سرخی دوڑ رہی تھی، چہرہ بھی گلابی ہو رہا تھا جبکہ آواز بھاری ہو رہی تھی۔

”اب بتانے کا قصد کریں گی کہ رات کے ایک بجے ہوش کی کیا سوچھی اور اس ساری بے سرو سامان گفتگو کا کیا مقصد تھا۔“ وہ کرسی پیچ کر اس کے بیڈ کے قریب بڑی فرصت و تسلی سے بیٹھ گیا، جواباً اس نے اسے تمام روداد سنا دی۔

”ایک لحاظ سے تو اچھا ہی ہوا، اس طرح مجھے یہ تو پتہ چل گیا کہ کوئی میرے لئے اپنے دل میں کتنا پیار دبائے بیٹھا تھا۔“ اس نے مدھم مدھم گیسپ سرگوشی کی، تو ایمان کا جھکا سر مزید جھک گیا۔

”آپ کو دونیہ نے بالکل درست بتایا تھا، میں واقعی آسٹریلیا جا رہا تھا لیکن پھر مجھے پاپا کی کال آگئی، کہ ایک کام کے سلسلے میں مجھے دوران

دوبئی رکنا ہے، سو میں نے اپنی ٹکٹ کینسل کروائی اور دوبئی کے لئے سیٹ کنفرم کروائی، اب وہاں سے سیدھا پاپا کے پاس جاؤں گا، صبح سات بجے مجھے آنٹی نے بتایا کہ آپ ہاسپٹل سڑ ہیں تو سیدھا ادھر بھاگا آیا اور پچھلے نو گھنٹوں سے آپ کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا ہوں، بھلا اپنی بھی کیا مینشن، ابھی کچھ دیر پہلے آنٹی کو میں نے گھر بھیجا ہے، وہ کافی تھک گئی تھیں۔“ وہ آہستہ آہستہ اس تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا۔

”اگر انکل کی کال نہیں آتی تو آپ اسی پلین میں ہوتے۔“ گہری آنکھیں پھر لبالب پانی سے بھر گئیں۔

”لیکن میں تھا تو نہیں نا، پلیز ایمان بھول جائیں جو ہوا اور بس آرام کریں، تنگ میں آنٹی کو انفارم کر دیتا ہوں، سحر بھی آفس سے سیدھا یہیں آئیں گی، مہاسلام آباد خالہ کے پاس ہیں ورنہ وہ بھی آج آئیں۔“ پھر وہ چلا گیا تو ایمان بھی پرسکون ہو کر لیٹ گئی، جب وہ واپس آیا تو سحر اور فضہ اس کے پاس موجود تھیں۔

”آنٹی گیارہ بجے میری دوبئی کی فلائٹ ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔“ وہ اجازت طلب کر رہا تھا، پھر وہ ایمان کی طرف آیا تھا جو سحر کے ساتھ باتوں میں مگن تھی۔

”اگر اجازت ہو تو جاؤں؟“ وہ پوچھ رہا تھا، ایمان ارتباط محض مسکرا دی۔

”اپنا بہت خیال رکھیے گا پلیز میرے لئے اب میں یہ نہ سنوں کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔“ وہ بہت پیار سے سر زس کر رہا تھا، اس نے فرمانبرداری سے سر ہلایا تو وہ گڈ بائے کہتا ہوئے وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆

ایمان ارتباط کو اپنی پیشانی پر اک نرم لمس کا احساس ہوا تھا، اس نے پٹ سے آنکھیں

کھولیں، فضہ اس پر جھکی تھیں۔

”ایمان میری بچی۔“ اس کی ساکت ہوئی آنکھیں دیکھ کر وہ تڑپ کر بولیں، مگر وہ مجسمے کی طرح ساکت تھی، اسے چنداں اثر نہیں ہوا، اس کی زیورس کلیئر نہیں آئی تھیں اسے بلڈ کینسر تھا، فضہ کو لگا تھا ان کی آخری آس بھی ٹوٹنے والی ہے ایمان ارتباط کو آج بلڈ ٹرانسپلانٹ کے لئے ہاسپٹل لایا گیا تھا اور پچھلے چار ماہ سے یہی ہو رہا تھا، ایمان ارتباط کو پہلی بار قسمت سے اختلاف ہوا تھا، شکایت ہوئی تھی، اسے اپنی ماں کے ساتھ جینا تھا، حماد گردیزی کا پیار نبھانا تھا لیکن ایسا کچھ بھی ممکن نظر نہیں آتا تھا، فضہ کی تڑپ، کک اور پیار اسے سب نظر آ رہا تھا اس سے جڑے لوگوں کو اس نے ہمیشہ تڑپے دیکھا تھا، اس نے ٹریمنٹ سے انکار کر دیا تھا، اس کے دل سے ہر چاہ ختم ہوئی تھی مگر اسے حماد گردیزی سے کیا عہد یاد آیا وہ چاہتا تھا کہ وہ تندرست رہے سو اس نے علاج شروع کر دیا کیونکہ ایسا حماد گردیزی چاہتا تھا، چار ماہ تک وہ اسے دلا سے دیتی رہی تھی کہ وہ ٹھیک ہے اس نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا، بہت کوشش کے باوجود حماد گردیزی جلد واپس نہیں آ سکا تھا دونیہ اور روجی بھی آسٹریلیا جا چکی تھیں، لیکن ایک ماہ ہونے کو آیا تھا اس کا رابطہ نہیں ہوا تھا۔

”تم تسلی اور ارتباط کی بیٹی ہو، تو نصیب بھی ان کے جیسے ہی لکھوا کر آئی ہو۔“ فضہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے چلاتے بہت دکھ سے سوچ رہی تھیں، ان کا دل درد سے پھٹ رہا تھا، غم ہو لے ہو لے کر وٹیں لے رہا تھا، مگر ایمان ارتباط کے ہونٹوں پر تالے پڑے تھے۔

”ایمان کچھ تو بولو، اپنی ماں سے کچھ تو کہو، اتنی بے حسی کس لئے۔“ انہوں نے بہت بے کل ہو کر اسے خود میں سمیٹا۔

”میں کچھ محسوس نہیں کرنا چاہتی مہما، شاید

اس طرح موت کی تکلیف کم محسوس ہو۔“ اس کے الفاظ سیاٹ تھے مگر فضہ کو لگا تھا کسی نے ان کا دل مٹھی میں بچھ لیا ہو۔

”کچھ نہیں ہوگا میری جان، تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ انہوں نے ایک بار پھر اس کی پیشانی چوم لی۔

”مہما کاش میں چھوٹی بچی ہوتی اور مجھے کچھ معلوم نہ ہوتا میں آپ کی باتوں اور تاویلوں پہ بغیر پس و پیش کے ایمان لے آتی۔“ وہ انہیں باور کر رہا ہی تھی کہ وہ ان کی تاویلوں کو نہیں مانتی اپنی بیماری کی شدت اور نوعیت کو سمجھتی ہے، ڈاکٹر اسے لے جا چکے تھے اور فضہ کا دل بیٹھ رہا تھا، انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ آئندہ وہ اسے دیکھ نہیں پائیں گی، وہ پر کٹے پیچھی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔

☆☆☆

حماد گردیزی آج پورے پانچ ماہ بعد پاکستان لوٹا تھا بہت کوشش کے باوجود جلدی نہیں ٹوٹ سکا تھا، چار ماہ تک سب ٹھیک تھا مگر گزشتہ ایک ماہ سے اس کی بات ایمان ارتباط سے نہیں ہوئی تھی اور اس کا اطمینان رخصت ہو گیا تھا، پہلی فرصت میں ہی وہ پاکستان واپس آیا تھا، وہ سیدھا ارتباط ہاؤس گیا تھا مگر ایمان وہاں نہیں تھی، وائچ مین نے کچھ بھی بتانے سے گریز کیا شاید اسے تنبیہ کی گئی تھی، وہ فوراً آفس آیا تھا اور وہاں اس کی ملاقات سحر سے ہوئی تھی رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

”سحر ایمان کہاں ہے؟“ اس نے بہت ضبط سے کام لیا، وہ بہت بے چین تھا، اس کی چھٹی حس اسے بہت کچھ غلط ہونے کا اشارہ دے رہی تھی، سحر نے اس سے بہت چھپایا تھا جب بھی آسٹریلیا سے اسے کال کر کے ایمان کا پوچھتا وہ ٹال جاتی مگر اب روبرو اس سے جھوٹ بولنا اسے



بہت مشکل لگ رہا تھا۔

”پلیز سحر مجھے بتائیں، میں نے ایک ماہ سے اس کی آواز نہیں سنی، مجھے معلوم نہیں وہ کہاں ہے، ایسا کیا چل رہا ہے جو وہ مجھ سے چھپا رہی ہے؟“ وہ مضطرب تھا، بے قرار تھا، سحر کی خاموشی پر گھنچھلایا تھا، بہت کوشش کے باوجود وہ خود پر کنٹرول نہیں رکھ پا رہا تھا، چند لمحوں تک وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی پھر فیصلہ کیا۔

”حماد! ایمان لندن ہے گزشتہ ایک ماہ سے، جب سے اس نے تم سے رابطہ نہیں کیا۔“ بہت ٹھہر کر بہت سنجیدگی سے اس نے مطلع کیا اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ چونک گیا، حماد گردیزی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”اسے بلند کینسر ہے۔“ بہت ہمت مجتمع کر کے اس نے حماد گردیزی پر بجلی گرائی، پھر خود رونے لگی تھی۔

حماد گردیزی لمحہ بھر میں حائلے میں آتا تھا، ہر احساس سے رشتہ ٹوٹا تھا، بڑی تیز ہوا چلی تھی اس کے قدم اکھڑنے لگی تھی، اس کے جسم میں واضح لرزش پیدا ہوئی تھی، اسے قسمت کی ستم ظریفی پر یقین نہیں آیا تھا، اسے واضح طور پر اپنے چہرے پر مکی کا احساس ہوا تھا، وہ بے بسی کی انتہا پر تھا، درد کا کوئی احساس جیسے چٹکیاں بھر رہا تھا۔

”مجھے محبت راس نہیں آتی۔“

کتنا سچ کہا تھا اس نے، حماد گردیزی نے اسے مانا، اس کے ڈر کو اپنے اندر اتارنا محسوس کیا، پانچ ماہ قبل آخری بار اس نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ اس کے تصور میں اتر آیا، اس کی اگلی منزل لندن پہنچنا تھا۔

☆☆☆

وہ لندن Bridge ہسپتال پہنچ چکا تھا، جہاں وہ ایڈمٹ تھی، وہ بیڈ پر دراز تھی، وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا وہ جانتی تھی کہ حماد گردیزی

وہ احساس تلاش کر رہا تھا جسے پیدا کرنے میں اسے دو سال پانچ ماہ لگ گئے تھے اور وہ پھر اسے دو سال پانچ ماہ پیچھے کھڑی محسوس ہو رہی تھی۔

سپاٹ، بے تاثر، لائق، احساسات سے عاری مگر اس بار اسے بحسب نہیں ہوا تھا، اس نے اسے باور بھی نہیں کروایا تھا کہ وہ بے حس ہو رہی ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ زندگی کو لمحہ بہ لمحہ خود سے دور جاتا محسوس کر رہی ہے۔

”آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ بیمار نہیں پڑیں گی۔“ خود پر ضبط کے ہزار پہرے بٹھاتے ہوئے اس نے بظاہر بڑے نارمل انداز میں پوچھا، مگر شدت ضبط سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور یہ بات ایمان ارتباط، حماد گردیزی کی طرف دیکھے بنا بھی سمجھ سکتی تھی۔

”یہ سب میرے اختیار میں نہیں در نہ میں وعدہ خلاف نہیں ہوں۔“ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی، اسے لگا تھا وہ پارے کی طرح پاش پاش ہو جائے گی، اس کی بے بسی آنسوؤں میں ڈھلنے لگی تھی جو شخص اس کے سامنے تھا اس کی جذبات پر حکمرانی تھی وہ اس سے اپنا آپ بھی چھپا نہیں پاتی تھی جب لائق بھی تب بھی نہیں اور اب تو وہ بنا دیکھے اسے اندر تک پڑھ لیتا تھا۔

اس نے ایمان ارتباط کے چہرے کو بہت غور سے دیکھا اس پر موت کی سی زبردی چھائی تھی کبھی اس چہرے پر گلابیت دوڑتی تھی، اس کے دل میں بیس سی اٹھی۔

”آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا، ساری تکلیف تنہا برداشت کرتی رہیں، ہر طوفان سے اکیلی ہی نبرد آزما ہوتی رہیں مجھے پلٹ کر آواز دینا بھی مناسب نہیں سمجھا۔“ اس نے سرگوشی کی، کوئی شکوہ تھا یا درد کا اظہار۔

”کیا بتاتی آپ کو، زندگی کی ہار کا قصہ سناتی یا یہ بتاتی کہ میں وفا نہیں کر پاتی۔“ اس کے لہجے

میں شکست تھی، وہ غیر مری مر کوئی نقطہ کو دیکھنے لگی، دو آنسوؤں چپکے سے آنکھوں سے سفر طے کرتے ہوئے رخسار پر نکل آئے تھے۔

”ہم نے مل کر زندگی گزارنی ہے۔“ وہ پر امید تھا، اس نے کوئی سینا دکھایا، ایمان ارتباط کا دل کہیں گہرائی میں ڈوب کر ابھرا۔

”زندگی ہی تو نہیں ہے۔“ الفاظ تھے یا دو دھاری تلوار، حماد گردیزی کٹ کر رہ گیا، اس نے تیزی سے رخ موڑا تھا اور زندگی موت سے لڑتی اس لڑکی سے اپنے آنسو چھپاتے تھے وہ دیکھے بغیر بھی بتا سکتی تھی کہ اس کا چہرہ چھکا ہے، ایمان ارتباط کے آنسوؤں میں روانی آئی تھی، اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں، اس کے ذہن میں سحر کے الفاظ گونج رہے تھے۔

کسی کی نظروں میں خاص ہونا، کوئی ایسا جو صرف آپ کی فکر کرے، جسے دنیا میں آپ سے بڑھ کر کوئی نہ ہو، جو صرف آپ کا احساس کرے، وہ آپ کے لئے سب کچھ کرے اور بدلے میں ویسا کچھ بھی نہ مانگے، بے ریا اور بے لوث چاہت دے یہ سب کچھ بہت انوکھا، پر کیف اور اچھوتا لگتا ہے، ایک دن تم اس احساس کو محسوس کرو گی، تم پیار کا اقرار کرو گی، تم اس احساس کی تمنا کرو گی اور چاہت کی قدر کرو گی، وہ خاص تھی کوئی اس کی فکر کر رہا تھا کوئی اسے بے ریا چاہت خلوص اور پیار دے رہا تھا، ہاں اور کوئی نہیں وہ حماد گردیزی تھا، اسے بہت خوبصورت احساس نے چھوا تھا، وہ احساس کی تمنا کر رہی تھی اس نے اقرار کیا تھا کہ حماد گردیزی سے اسے پیار ہے شدید محبت ہے وہ اس کی قدر کر رہی تھی، مگر کچھ بھی پورا ہوتا محسوس نہیں ہو رہا تھا، سب کچھ گنڈ ہو کر بکھر گیا تھا۔

”میرے ایک سوال کا جواب دیں۔“ اس کی آواز پر وہ مڑا تھا، آنکھیں رگڑیں مگر آنسوؤں

نے پھر بغاوت کی، اب کی بار اس نے نہیں چھپایا کہ وہ اس سے کچھ چھپا ہی نہیں سکتا تھا، بہنے دیا غم کا اظہار ہوا تو ہونے دیا۔

”جی پوچھیں۔“ اس نے پہلی بار اتنے لمبے چوڑے مرد کو بچوں کی طرح سکتے دیکھا تھا، ایمان ارتباط کو لگا تھا وہ وقت سے پہلے مر جائے گی۔

”ہم شادی کریں گے، بہت سارے لوگوں کی طرح کنبہ بنائیں گے دادا، دادی بنیں گے ایک بھر پور زندگی گزاریں گے مگر پھر کیا.....؟“ وہ بہت محکم آواز میں پوچھ رہی تھی، وہ جواب جانتا تھا لیکن خاموش تھا۔

”اس کے بعد بھی موت ہے تو پھر اب کیوں نہیں۔“ وہ جیسے سب کچھ مانے ہوئے تھے، حماد گردیزی نے اس کی بھیگی آنکھوں میں دیکھا تھا وہ بہادر بننے کی کوشش کر رہی تھی خود سے زیادہ اسے دلا سے دے رہی تھی۔

”آپ میری ایک بات مانیں گے؟“ وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے والی ہے۔

”جی کہیں۔“ اس نے مختص اجازت دی۔

”آپ اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کر لیجئے گا۔“ وہ بہت رحم سے مسکرایا۔

”کیا وہ ایمان ہوگی؟“ بہت تیکھا سوال آیا۔

”دعا مانیں کہ وہ ایمان نہ ہو، ایمان بے وفا ہے وہ آپ سے کوئی عہد نبھانے پائی۔“ وہ سسکی۔

”آپ نے میری جان مانگی ہوتی تو میں ایک لمحہ دیر نہیں کرتا لیکن آپ نے مجھ سے میرے عشق کی تقسیم مانگی ہے، محبت کی ہوتی تو ایک بار سوچتا میں نے آپ سے عشق کیا ہے اور اس میں کسی کی مداخلت میں برداشت نہیں کر پاؤں گا، ویسے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ایک بھی لڑکی کے ساتھ آپ نے مجھے ہنستا مسکراتا دیکھ لیا تو آپ یقیناً بیڈ روم میں میرا داخلہ بند کر دیں گی۔“

آخری بات بہت شرارت سے کی تھی، کسی موہوم



## ماہیاں میٹھون یاد آوے

تحسین اختر



تھی، وہ سانس بجال کرنے کے لئے بیچ پر بیٹھ گیا تھا جہاں سات سال اور پانچ ماہ پہلے ایمان ارباط موج آنے پر بیٹھی تھی، چلی بار وہ اسے نہیں ملی تھی، حماد گردیزی کے آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے، اسے اپنے آس پاس اس کا احساس بکھرا محسوس ہوا تھا، اس سے پچھڑے پانچ سال بیت گئے تھے، وہ تکلیف برداشت نہیں کر پائی تھی اس کا نازک وجود لڑتے لڑتے ہار گیا تھا، وہ لندن Bridge ہاسپٹل سے واپس سانس لے کر نہیں آئی تھی، اس کے پھر ائے وجود میں روح کا لمس نہیں تھا، وہ شام اسے اپنے ساتھ لے کر گم ہو گئی تھی، اسے لگتا تھا کہ یہ شام ان کے فراق پر رخ سے سرشار ہے، لیکن اب اسے احساس ہوا تھا کہ یہ شام اس کے ساتھ سو گوار ہے، اس نے ایک نگاہ میں گہری ہوتی تاریکی کا جائزہ لیا، دھیرے دھیرے شام کا ناکت و جامد منظر بھی اندھیرے کی سیاہ چادر میں چھپتا جا رہا تھا، تاریکی ویسی ہی تھی ہولناک اور پرسوز کوئی درد کا رنگ الٹی بظاہر خاموشی میں سوگ ماتم بچھائے بھی جان لیوا اور اداس تو بھی جامد و چپ چاپ اور بے بسی کی المناک تصویر۔

اس نے بھیجی آنکھیں بند کر لیں، کر لاتے دکھ کو اپنے اندر اتارا، ایمان ارباط اس کے روح میں بسی تھی اس کے دل کی دھڑکن میں بستی تھی، چند محوں بعد آنکھیں کھولیں، نمی کور گڑا اور تاریک ہوتے فضا کے جھونکوں کے ہم قدم آگے بڑھ گیا۔

”ایمان ارباط کو فراموش کرنا یہ میری وفا کا تقاضا نہیں یہ میرے عشق کو گوارا نہیں۔“ اس نے خود سے عہد باندھا اور وفا کی راہوں پر اور مضبوطی سے گامزن ہو گیا۔

☆☆☆

امید میں ڈوبی، غم کی شکست دینے کی کوشش کرتی ہوئی شرارت، یا آخری لمحوں کی یادیں بناتی ہوئی شرارت، وہ بے ساختہ مسکرائی تھی، آنسوؤں سے بھری دوسنہری آنکھیں بہت خوبصورت لگی تھیں اس نے اپنے عشق کی گواہی دی تھی، نرس اسے لے جا رہی تھی، حماد گردیزی نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ تھاما اس کی ہتھیلی کی پشت پر اپنا لمس چھوڑا پھر بہت عقیدت سے اس کا ہاتھ چھوڑا۔

باہر شام اتر رہی تھی، اسے بہت خوف آیا تھا، اسے شام کے جھٹ پٹے سے بہت وحشت ہوئی تھی۔

”میں مکمل ہوئی ہوں مجھے کوئی دکھ نہیں۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی، لیکن حماد گردیزی کا اطمینان رخصت ہو رہا تھا، وہ لمحہ بہ لمحہ اس سے دور ہو رہی تھی، حماد گردیزی کو لگا کوئی دور ہاتھ سے پھسل رہی ہے۔

کوئی نانا ٹوٹ رہا ہے  
کوئی فراق کا لمحہ ہے  
کوئی جدائی کا احساس ہے  
کچھ چھوٹ جانے کی کسک  
کچھ ٹوٹ جانے کی کھٹک

اس کے ہونٹوں سے دعا کے لئے جنبش ہوئی مگر الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے، اس نے پھر دعا مانگنے کی کوشش کی مگر اس کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی اس نے بہت تھک کر ایک شکوہ کناں نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی تھی اس کا دل چاہا تھا کہ وہ بھاگ کر اسے روک لے اسے اپنے حصار میں قید کرے جہاں اسے کوئی نہ ڈھونڈ پائے مگر وہ ایسا کچھ نہیں کر پایا اور.....

☆☆☆

حماد گردیزی اپنا بزنس آسٹریلیا سے پاکستان مستقل طور پر شفٹ کر چکا تھا، وہ جاگنگ ٹریک پر بھاگ رہا تھا اس کا سانس پھول رہی



سن چرنے دی مٹھی مٹھی کوک  
 ماہیا مینوں یاد آوندا  
 میرے دل وچوں اٹھ دی اے ہوک  
 ماہیا مینوں یاد آوندا  
 میری عید والا چن کدوں چڑھے گا  
 اللہ جانے ماہی کدوں ویڑے وڑے گا  
 دکھ ڈاہڈے نے جندڑی ملوک  
 ماہیا مینوں یاد آوندا  
 سن چرسینے دی مٹھی مٹھی کوک  
 آج کھسی شیشہ سرخی سب اداس پڑے  
 تھے، زلیخا اجڑی حالت اور اجڑی صورت لئے  
 ٹوٹی کھاٹ پر دہری ہو کر پڑی تھی، پاس ہی نیچے  
 زمین پر اس کی اماں نصیبو کا سر گود میں رکھے موٹی  
 موٹی جو میں نکال کر پنگ پنگ ناخنوں سے  
 مارے جارہی تھی، رات آنے والی آندھی نے جو  
 دھول مٹی اڑائی تھی اس نے ہر چیز کو ڈھک دیا تھا،  
 ان کا جھونپڑی نما گھر جو پہلے ہی گندا تھا دھول مٹی  
 کی لپیلا پونی سے اور بھی گندا ہو گیا تھا مگر یہاں کسی  
 کو کوئی احساس نہیں تھا۔  
 ”اری اٹھتی کیوں نہیں ہو، کچھ پیٹ کا  
 دوزخ بھرنے کا ہی سامان کر دے، جانے تو کس  
 کا ماتم کر رہی ہے، کل سے ایسے پڑی ہے جیسے  
 پتہ نہیں اس کا کون مر گیا ہے۔“ نینا بولنے لگی تو  
 پھر آگاہ پیچھا نہیں دیکھتی تھی، زلیخا کے جسم میں  
 ہاں کی باتوں پر بھی ذرا سی جنبش تک نہیں ہوئی  
 تھی۔  
 ”چل دفع مر پرے، مجھے ہی کچھ کرنا  
 پڑے گا، یہ تو نہیں اٹھنے والی۔“ نینا نے نصیبو کو جھکا  
 دے کر پرے کیا تھا اور خود ہاتھ دھو کر آٹا  
 گوندھنے بیٹھ گئی تھی، زلیخا کی آنکھیں رات بھر  
 رونے سے لال ہو رہی تھیں، اب تو آنسو بھی  
 خشک ہو گئے تھے، وہ ایسے ہی پڑی مراد کو یاد کئے  
 جارہی تھی۔

مراد صرف نام کا مراد نہیں تھا اس کے  
 سوہنے دل کی مراد تھا، اس نے رنج کر مراد کو پیار  
 کیا تھا، شمس آباد کی بچی آبادی میں جب مراد کے  
 ابا نے گھر خریدا تھا تو اس بچی آبادی کی جوان  
 لڑکیوں نے اونچے لمبے گھبرو جوان مراد کو دیکھ کر  
 جانے کتنے ہی سینے بن لئے تھے، ان میں سر  
 فہرست زلیخا تھی، جس نے صرف سینے ہی نہیں  
 بنے تھے مراد کو اپنی کھری اور بچی محبت کا امین بھی  
 بنادیا تھا، پھر چاچا جو رے کی ٹوٹی ہوئی دکان میں  
 کتنی ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں اور ان ملاقاتوں میں  
 ہر بار محبت کا رنگ اور گہرا چہرہ تھا۔  
 ”زلیخا تو نے تو مراد سے کو کسی اور جوگا چھوڑا  
 ہی نہیں۔“ نصیبو گناہ چلیتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھر کر  
 بولی تھی۔  
 ”نی خبردار جو میرے مراد علی کے بارے  
 میں کچھ کہا تو۔“ جب سے اس کی محبت کے  
 چہرے سکھوں میں معمول کا قصہ بنے تھے تب  
 اس نے بھی مراد کا نام پر شرمانا، لجانا اور آنکھیں  
 چرانا چھوڑ دیا تھا۔  
 ”میرا مراد علی؟“ گوگی کو تو کھانسی کا دورہ سا  
 پڑ گیا تھا۔  
 ”ہاں میرا مراد علی۔“ وہ تو ڈنکے کی چوٹ پر  
 اعلان کرنے کو تیار تھی۔  
 ایک بار یونہی وہ مراد علی کے پاس بیٹھی تھی  
 کہ ابا چاچا جو رے کی خالی دکان کے پاس سے  
 بکریوں کے لئے چارہ لے کے گزرا تھا کہ اس پر  
 نظر پڑ گئی تھی اور پھر اس روز دینو نے جوان بیٹی کو  
 گھر آتے ہی بالوں سے پکڑ لیا تھا۔  
 ”وے دین محمد چھوڑ دے اس کو، اس نے  
 کیا قصور کیا ہے۔“ نینا کے سامن میں گنگناتے  
 ہوئے مٹی کی لپائی کر رہی تھی، زلیخا کے گھر میں  
 داخل ہوتے ہی دینو نے اس کو پکڑا تو وہ مٹی سے  
 بھرے ہوئے ہاتھوں سے بیٹی کا دفاع کرنے کو

ڑی تھی۔  
 ”تیرے جیسی مانیں ہوتی ہیں جو اندھی بن  
 کے گھر بیٹھی رہتی ہیں یہ جانے بغیر کہ جوان جہان  
 لیاں باہر کیا گل کھلا رہی ہیں، اس سے پوچھ یہ  
 مراد کے ساتھ کہاں بیٹھی تھی اور کیوں۔“ اس نے  
 اگو ہٹا کر ایک ہاتھ زلیخا کے جڑ ہی دیا تھا۔  
 ”ہیں نی بتا تیرا پوچھ کہہ رہا ہے۔“ دنیو کی  
 بات سن کر تو نینا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی  
 تھیں، وہ خاموش سے ڈھیٹ بن کر کھڑی رہی  
 تھی۔  
 ”اچھا ہے جو بات ایک نہ ایک دن ان کو  
 چلنی ہے آج ہی پتہ چل جائے۔“ اس نے  
 دل میں سوچ لیا تھا۔  
 ”نی بتا، اب کیا گونگے کا گڑ کھا لیا ہے۔“  
 اس کی خاموشی نینا کو بھی ہولائے دے رہی تھی اس  
 نے اس کی کمر پر دو ہتھ مارے تھے۔  
 ”سمجھالے اس کو اچھی طرح، ورنہ تو بھی  
 مجھے جانتی ہے اور یہ بھی، آئندہ اس نے ایسی  
 حرکت کی تو اس کے ٹوٹنے کر کے کتوں کو کھلا دوں  
 گا۔“ دنیو بکتا جھکتا باہر نکل گیا تھا۔  
 ”تجھے پتہ ہے نا اپنے پیو کی سخت طبیعت کا،  
 اس لئے اپنی جوانی کو لگام ڈال کے رکھ نہیں تو دو  
 بول پڑھو اگے آپا ریمیاں کے پتر کے ساتھ دفغان  
 کر دوں گی۔“ نینا نے اپنے بھانجے کا حوالہ دیا تھا  
 جو دل سے زلیخا کے ساتھ بیاہ کا خواہش مند تھا۔  
 ”میں نہیں کرتی کسی سے بیاہ دیاہ۔“ وہ  
 ماتھے پر تپوریاں ڈال کر اندر چلی گئی تھی۔  
 ”کل تو میں مرتے مرتے بچی ہوں ابا کے  
 ہاتھوں۔“ مراد سے اگلی ملاقات جلد ہی ہو گئی  
 تھی۔  
 ”وہ کیوں۔“ مراد اس کے گھٹکروؤں  
 والے پراندے سے کھیلتے ہوئے بولا تھا۔  
 ”اس نے ہم دونوں کو اکٹھے بیٹھے دیکھ لیا تھا

بس پھر کیا، گھر جاتے ہی میری کم بختی آگئی۔“  
 ”تو نے بتا تو نہیں دیا کہ ہم دونوں ایک  
 دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔“ مراد تیزی سے  
 بولا تھا۔  
 ”اس میں ڈرنے والی بھی کیا بات ہے،  
 آخر ایک نہ ایک دن تو سب کو پتہ چلنا ہی ہے  
 نا۔“ وہ مراد کا دل ٹٹولنے لگی تھی۔  
 ”وہ تو جب پتہ چلنا ہے چلنا ہے، ابھی سے  
 یہ سیا پا ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔“  
 ”مراد علی یہ تو نے اچھی بات نہیں کی، تو  
 ہمارے پیار کو سیا پا کہہ رہا ہے، قسم رب کی اگر یہ  
 بات کسی اور کے منہ سے نکلی ہوئی تو میں اس کا منہ  
 توچ لیتی۔“  
 ”زلیخا اتنی جلدی غصے میں نہ آ جایا کر، میں  
 تو ایسے ہی کہہ رہا تھا، چل چھوڑ یہ بتا، میں کل شہر جا  
 رہا ہوں، تیرے لئے کیا لاؤں۔“ بھی بھی تو  
 مراد بھی زلیخا کے جذبول سے ڈر جاتا تھا، اب  
 بھی جلدی سے بات بدلتے ہوئے بولا تھا۔  
 ”کچھ نہیں، بس تم جلدی سے آ جانا، پتہ  
 ہے جب تم پنڈ میں نہیں ہوتے نا تو پنڈ کی ساری  
 گلیاں سونی لگتی ہیں۔“  
 ”تو بھی جھکی ہے، میں کون سا دور جا رہا  
 ہوں، ایک دن کے لئے تو جا رہا ہوں اور یہ  
 قریب تو شہر ہے۔“  
 ”جو بھی ہے تو جہاں بھی جائے مجھے دور ہی  
 لگتا ہے، کیونکہ جب جب میری اکھیاں سمجھیں نہ  
 دیکھیں مجھے چین ہی نہیں پڑتا، گوگی کہتی ہے زلیخا  
 مراد سے کا تصویر بنا کر گلے میں ڈال لے۔“  
 ”تم کیا اپنی سکھوں سے ہر وقت میری ہی  
 باتیں کرتی رہتی ہو۔“ مراد نے ہنستے ہوئے پوچھا  
 تھا۔  
 ”تو اور کیا، میرے پاس اور ہے ہی کیا،  
 تیرے سوا۔“ وہ بڑے جذب سے بولی تھی اور



مراد علی اس کا یہ روپ دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

☆☆☆

”میڈم جی آپ کے لئے اورنج جوس لاؤں۔“ قلم کی شوٹنگ کامیابی سے جاری تھی میڈم روپی اس فلم کی ہیروئن تھی، روپی کا شمار اس وقت ٹاپ کلاس ہیروز میں ہوتا ہے، جس فلم میں روپی کا ایک سین بھی شامل ہو جائے وہ فلم کامیابی کی ضمانت بھی جاتی ہے، اس وقت تھوڑی دیر کے لئے شوٹنگ رک گئی تھی اور سہگل صاحب کا اسٹنٹ دوڑا دوڑا اس کے پاس آیا تھا۔

”پوچھنے کیا آئے ہو جوس لے کر ہی آتے۔“ روپی کا رخہ بھی بڑا مشہور تھا، کوئی عام سا بندہ اس سے بات نہیں کر سکتا تھا، وہ دو منٹوں میں اگلے بندے کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتی تھی۔

”ابھی لایا میڈم جی۔“ وہ اگلے قدموں دوڑا تھا حالانکہ سہگل صاحب جیسے مشہور معروف ڈائریکٹر کا اسٹنٹ ہونے کی وجہ سے خود اس کا مظنہ بھی کم نہیں تھا مگر اس وقت روپی کو برداشت کرنا اگر سہگل صاحب کی مجبوری تھی تو اس کی بھی تھی، وہ بڑے ریلیکس موڈ میں بیٹھی ہوئی تھی، وقفے کے بعد اگلے شاٹ میں اس کا رقص تھا، اس لئے ابھی سے اسٹوڈیو کے ادھر ادھر کے لوگ اور دوسرے ڈائریکٹر ایکٹرو وغیرہ بھی اس سیٹ پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے، لوگ اس کے رقص کے دیوانے تھے۔

”میڈم جی یہ لیں۔“ وہ اورنج جوس کا فل سائز گلاس لا کر بڑے احترام سے اس کے سامنے رکھ گیا تھا جسے اس نے اک ادا سے تھاما تھا اور گھونٹ گھونٹ اپنے اندر اتارنے لگی تھی۔

وہ ناچ رہی تھی، اس کے قدم اک ردھم سے حرکت کر رہے تھے اس کے جسم کا ہر عضو میوزک کے ساتھ یوں تھرک رہا تھا جیسے وہ پانیوں پر چل رہی ہو، جب تک اس کا رقص جاری

رہا تھا لوگ سانس روکے آنکھیں جھپکے بنا اس دیکھتے رہے تھے، وہ کسی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی، اس کو کسی کی طرف دیکھنا بھی نہیں تھا، یہ اس کے عروج کا زمانہ تھا، ابھی تو لوگوں کو اس متاثر ہونا تھا لوگوں کو بس اسے دیکھنا تھا، وہ یہ جانتی تھی یہ عروج اک خاصی مدت تک ہے اور اس تمام عرصے کو پوری قیمت اور اپنی پوری قدر کے ساتھ وصول کرنا چاہتی تھی اور کر رہی تھی۔

”مزہ آگیا، روپی جی ناچیں اور مزہ نہ آئے کہاں لکھا ہے۔“ رقص ختم ہو گیا تھا، وہ تھک چکی تھی، وہ ڈریسنگ روم میں چلی گئی تھی، لوگ بھی ایک ایک کر کے پھرنے لگے تھے، اس کے پونٹ کے لوگ اگلے سین کے لئے تیاری کرنے لگے تھے۔

”روپی جی زیادہ تھک گئی ہیں تو ریسٹ کر لیں۔“ سہگل صاحب روپی کی پر فارمنس سے بڑے خوش تھے، انہوں نے روپی سے خوشامد انداز میں کہا تھا اور ساتھ ہی ایک ملازمہ کو اشارہ کیا تھا وہ روپی کے پاؤں دبائے لگی تھی۔

”میں ذرا چیچ کر لوں پھر ریسٹ کروں گی۔“ روپی نے اک ادا سے کہا تھا۔

”آج لंच میں کیا لیں گی۔“ سہگل صاحب نے جاتے جاتے پوچھا تھا۔

”آپ کو پتہ ہے میزری پسند کا اور ضرورت کا ڈائٹ بول، فریش سلاد اور تھوڑی سی کم آئل والی چکن کڑھائی۔“

”روپی جی مجھے پتہ ہے آپ چکن کڑھائی کے بغیر تو کھانا ہی نہیں کھا سکتیں۔“ سہگل صاحب ہنستے ہوئے چلے گئے تھے۔

رات کے گیارہ بجے تھے جب روپی شوٹنگ ختم کر کے اپنے ڈرائیور اور لی اے کے ساتھ گھر واپس جا رہی تھی کہ ڈیفنس کے قریب پہنچ کر کچھ لوگوں نے اس کی گاڑی کو زبردستی روک لیا تھا،

ساتھ لے کر جانا ہے، ہم اصل میں دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسکرین پر اتنا خوبصورت ناچنے والی قریب سے دیکھنے پر کیسی لگتی ہے۔“ ایک نے اپنا مقصد بتایا تھا اور روپی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بد معاش ٹائپ لوگ ہیں کوئی ڈاکو لٹیرے نہیں، اسے تو اب اور بھی خوف محسوس ہوا تھا۔

”میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گی، خبردار مجھے کسی نے ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو بہت برا ہوگا۔“ روپی چیخ رہی تھی، اس کے پی اے نے پولیس کو فون کرنا چاہا تھا، لیکن نقاب پوشوں کی عقابی نظروں نے ایک منٹ میں اس کو قابو کر لیا تھا، اب وہ روپی کو بازو سے پکڑ کر گاڑی سے باہر نکال رہے تھے، روپی نہ جانے کے لئے بھرپور مزاحمت کر رہی تھی، اس کا پی اے بھی اسے پیچ رہا تھا جبکہ ایک نقاب پوش نے مستقلاً ڈرائیور کو قابو کیا ہوا تھا، روپی اس وقت خود کو بے بس کی انتہاؤں پر محسوس کر رہی تھی، اس کے پاس اتنے تعلقات تھے کہ وہ چاہتی تو وزیر اعلیٰ ہاؤس تک تھرملی جاسکتی تھی مگر ایسا تب ہوتا اگر اس وقت وہ کچھ کر سکتی، اس وقت وہ بے بس تھی، اپنی مدد کے لئے کسی کو بلانہ سکی تھی۔

☆☆☆

مراد کو بھانوید کے پاس بیٹھے اور اس سے کہیں مارتے کافی رات ہو گئی تھی، پھر وہ بھانوید سے اجازت لے کر بھامیرو کے گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا، نوید اس کا چچا زاد جبکہ بھامیرو اس کا سگا بھائی تھا۔

”یار رات ادھر ہی رک جاؤ۔“ بھانوید نے اسے اٹھتے دیکھ کر کہا تھا۔

”بھانوید رک جاتا لیکن پھر بھامیرو میرا انتظار کر رہا ہوگا، میں انہیں کہہ آیا تھا میں انہی کے پاس سوؤں گا۔“

”کہہ آئے تھے تو کیا ہوا، اسے فون کر

”میڈم صاحبہ باہر نکلو۔“ ایک نقاب پوش گاڑی کی طرف آیا تھا۔

”کیوں، تم لوگوں کا مقصد کیا ہے۔“ روپی نے جواب دیا تھا۔

”ہمیں کچھ نہیں چاہیے، ہمیں تو بس آپ کو



دیتے ہیں۔“ بھانوید اور اس کی بھی گاڑھی چھتی تھی، وہ اسے ابھی جانے نہ دینا چاہ رہے تھے۔  
 ”نہیں پھر آؤں گا تو آپ کے پاس ہی ٹھہروں گا، ابھی مجھے بھامیرو سے کچھ کام ہے، اس لئے آج میرا ان کے پاس ہونا بہت ضروری ہے۔“ وہ بڑی مشکل سے ان سے اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔  
 ”کیسے جاؤ گے چھوڑ آتا ہوں۔“ نوید نے کہا تھا۔

”آپ نے اتنا کچھ کھلا پلا دیا ہے کہ اب بیدل چلتے ہوئے جاؤں گا، ویسے بھی بھامیرو یہاں سے کتنا دور رہتا ہے بیس چھپیس منٹ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“  
 ”تمہاری مرضی ورنہ میں تو کہہ رہا تھا چھوڑ آتا ہوں۔“

”نہیں بھانوید اب تم آرام کرو، میں چلا ہوں۔“ وہ ان سے اجازت لے کر باہر نکل آیا تھا، موسم اچھا تھا، یوں بھی جیسے جیسے رات بھینکی جاتی تھی، موسم اچھا ہوتا جاتا تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، وہ ایک شوخ سے گانے کی دھن بجاتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہی سامنے عجیب سی صورت حال نظر آئی تھی، تین نقاب پوش اس سنسان گلی میں ایک، کار کو گھیرے کھڑے تھے اور پھر اس نے چھپ کر دیکھا تھا کہ اب وہ اس کار میں سے ایک لڑکی کو گھسیٹ رہے تھے، لڑکی ان کے ساتھ نہ جانے کی بھرپور مزاحمت کر رہی تھی، وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کا مقصد کیا تھا اور وہ کون لوگ تھے ڈاکو تھے لیرے تھے یا ان کے دمن، اسے تو بس یہ دکھائی دے رہا تھا کہ وہ ایک معصوم سی لڑکی کو اغواء کر رہے ہیں، پھر اس کے جوان و غیرت مند خون نے جوش مارا تھا اور وہ بے خطر اس پر اے پھٹے میں کود پڑا تھا، بے شک اس میں اس کی

جان کا خطرہ بھی تھا لیکن اس وقت اسے یہاں کہاں تھی، وہ کار کے ڈرائیور کے ساتھ مل کر ان کی اچھی طرح ٹھکانی کرنے لگا تھا، بے شک وہ بھی بہت طاقت ور تھے مگر مراد نے بھی کسی سے ہارنا نہ سیکھا تھا، آخر نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ مراد کو دھمکیاں دیتے ہوئے فرار ہو گئے تھے کیونکہ وہ کہیں پولیس موبائل کا ہارن بھی سنائی دینے لگا تھا، میڈم روپی آج ان کے لئے تر نوالہ ثابت ہونے والی تھی مگر اس پینڈو جوان نے آکر ان کے رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا، ان کے جانے کے بعد مراد نے غور سے دیکھا تو اس نے پہچان لیا تھا کہ وہ مشہور فلم ہیروئن روپی تھی، روپی کو ان کیس جانتا تھا، ان کے شمس آباد میں ہی ہری جی اور کئی دکان پر اس کے ہوش رہا بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے اور تو اور شمس آباد کے کوچواؤں نے بھی اپنے اپنے تانگوں پر میڈم روپی کے بڑے بڑے اوو خوبصورت پوسٹرز لگا رکھے تھے۔  
 ”روپی جی آپ۔“ وہ ہاتھ اور کپڑے جھاڑ کر اس کے قریب آ گیا تھا۔  
 ”تمہارا بہت بہت شکریہ، اگر آج تم نہ ہوتے تو پتہ نہیں ہمارے ساتھ کیا ہوتا۔“ روپی کا سارا رخہ اس وقت ختم ہو گیا تھا وہ مراد علی کی بہت احسان مند ہو رہی تھی۔  
 ”یہ کون لوگ تھے اور ان کی آپ کے ساتھ کیا دشمنی تھی۔“ اس نے بھی بہت سی فلمیں دیکھ رکھی تھیں اور ہر فلم میں روپی کا کردار بہت اچھا ہوتا تھا، وہ بھی اس کے کردار سے متاثر تھا اور نہیں جانتا تھا کہ فلم نگری کی چکا چوند کے پیچھے کیسے کیسے اندھیرے پنہاں ہوتے ہیں۔  
 ”میرے ساتھ کسی کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے، بس ڈاکو تھے لوٹنے آئے تھے۔“ روپی نے مختصراً بتایا تھا۔  
 ”او اچھا ہوا آپ بچ گئیں۔“ اس نے ایک

بار پھر روپی کے بچنے پر شکر کا اظہار کیا تھا دل ہی دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ جب وہ شمس آباد پہنچ کر بتائے گا کہ اس نے مشہور ہیروئن روپی کی جان بچائی ہے تو سب اس سے کتنا متاثر ہوں گے۔  
 ”اچھا جی میں چلتا ہوں۔“ روپی جتنی خوبصورت سکرین پر نظر آتی تھی اس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت تھی، اس مووی جسے کے پاس سے ہٹنے کو اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر جانا بھی مجبوری تھی۔

”اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔“ روپی نے اس سے پوچھا تھا۔  
 ”مراد علی۔“ وہ خوش ہو کر مڑا تھا۔  
 ”مراد علی کہاں رہتے ہو؟“  
 ”شمس آباد میں۔“  
 ”یہ لو میرا کارڈ رکھ لو۔“ روپی نے اپنا کارڈ نکال کر مراد کی طرف بڑھایا تھا جسے اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ تھام لیا تھا۔  
 ☆☆☆

زلیخا نے صبح سارے کاموں سے فارغ ہو کر اپنا سبز سوٹ پہنا تھا جس پر کہیں کہیں لال دھاگے سے کڑھائی کی ہوئی تھی اور شیشے ٹانگے لگے تھے، اس نے لمبے بالوں میں پراندہ ڈالا تھا آنکھوں میں بھر بھر کر کاجل لگایا تھا اور چپکے سے گلابی لب اسٹک ہونٹوں پر لگا کر رگڑ ڈالی تھی، اس نے ساری تیاری کر بھی لی تھی اور اب یہ بھی چاہتی تھی کہ اس کی تیاری گھر میں کسی کو نظر بھی نہ آئے، ابا تو یوں بھی اس دن والے واقعے کے بعد سے اس پر کڑی نظر رکھنے لگا تھا اور اماں نے بھی اس پر پھرے بٹھانے شروع کر دیئے تھے، آج مراد علی کو دو دن بعد شہر سے واپس آنا تھا، وہ ایسے تو اس سے نہیں مل سکتی تھی، اتنی تیاری تو اس کا حق بنتا تھا کہ مراد کا دل اسے دیکھتے ہی خوش ہو جاتا۔

شام ڈھلنے تک مراد شہر سے واپس آ گیا تھا اور اس کو بھی پیغام مل گیا تھا کہ وہ ذرا دن ڈھلنے پر اس سے ملے، اس کے ہونٹ آپ ہی آپ مسکانے لگے تھے اور سانولی رنگت خوشی کی شدت سے دھنکے لگی تھی۔  
 ”نی کہاں جا رہی ہے تو۔“ نیا لال مرچ گھوٹ رہی تھی اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔  
 ”گوگی کی طرف جا رہی ہوں۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا تھا۔  
 ”یہ کوئی ٹیم (ٹائم) ہے گوگی کے گھر جانے کا۔“  
 ”اماں کیا ہر وقت پیچھے ہی پڑی رہتی ہو، ابھی آ جاؤں گی۔“ اس نے نیا کے مزید سوالوں سے بچنے کی خاطر دوپٹہ سر پر نکایا تھا اور جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔  
 ”پتہ ہے زلیخا شہر میں مجھے مشہور و معروف فلم ہیروئن روپی ملی تھی، نسیم رب کی وہ اتنی سوتی ہے کہ ہاتھ لگانے سے میکی پڑ جائے، میں نے تو جب اس کو اتنے قریب سے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔“  
 ”کیا روپی؟ وہ تمہیں کہاں مل گئی۔“ زلیخا کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا مگر جب مراد نے اس کو سارا قصہ سنایا تو اس کو یقین کرنا ہی پڑا تھا۔  
 ”یہ دیکھ، یہ اس نے اپنا کارڈ بھی مجھے دیا ہے۔“ سفید کاٹن کے کرتے کی جیب سے مراد نے سنہری حروف سے جگمگاتا کارڈ نکال کر زلیخا کو پکڑا دیا جو اس کے سانولے ہاتھ میں کچھ اور بھی چمکنے لگا تھا۔  
 ”یہ تمہیں کیوں دیا ہے؟“ زلیخا کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی تھی۔  
 ”اس لئے کہ میں جب اس سے ملنا چاہوں تو جا کر مل لوں، کوئی مجھے روک نہیں سکے



”اچھا پھر تو مجھے بھی ساتھ لے جانا، میں بھی اس سے مل کر آؤں گی۔“ زلیخا اب بچوں کے سے اشتیاق سے بولی تھی۔

”تیرا ابا تجھے میرے ساتھ جانے دے گا۔“ مراد ہنستے ہوئے بولا تھا۔

”نہ جانے دے میں چوری چوری چلی جاؤں گی۔“ مراد کی محبت میں وہ ایسے ہی بہادر بن جایا کرتی تھی، پھر اس روز کی ملاقات میں مراد اس کے ساتھ سارا وقت روپی کی ہی باتیں کرتا رہا، اس کے حسن کی اس کی خوبصورتی کی، اس کے لباس اور میک اپ کی، اس روز روپی کا لال شیشوں والا سبز سوٹ، آنکھوں کا کاجل اور ہونٹوں پر رگڑ کر لگائی گئی گلابی لب اسٹک جو اس کے نمکین حسن کو دو آتشہ کر دیتی تھی مراد علی کی تعریف کو ترستے رہ گئے تھے، مراد کو تو سب کچھ بھولا ہوا تھا بس یاد تھا تو روپی سے ملاقات کا اک اک رنگ۔

عورت ایسی بھی ہوتی ہے، نرم و نازک دودھ شہد سے دھلی ہوئی، چمکتی ہوئی، مکی سنوری ہوئی طنطنے والی، اس رات کھلے صحن میں ستاروں تلے چارپائی بجھائے لیٹا مراد جانے کن سوچوں میں گم تھا، اس رات ایک بار بھی زلیخا کا خیال اس کے آس پاس بھی نہیں پھٹکا تھا بس وہ سارا وقت روپی کو ہی سوچتا رہا تھا، رات کے پچھلے پہر جب آنکھ لگی تب بھی بس روپی کے خواب نظر آتے رہتے تھے، ابھی وہ اسکے ساتھ کہیں بیٹھا ہوتا اور ابھی کہیں گھوم رہا ہوتا، روپی کے حسن نے تو اس کو پاگل کر چھوڑا تھا، اس پاگل پن کا نتیجہ ہی تھا کہ وہ ٹھیک چار روز بعد شہر جانے کے لئے تیاری کر رہا تھا مگر اس بار اس کی تیاری بہت بہت ہی خاص تھی، اس بار وہ شہر کسی کام سے نہیں بلکہ روپی سے ملنے جا رہا تھا۔

”پھر شہر جا رہے ہو؟“ زلیخا نے پوچھا تھا۔  
”ہاں کچھ کام ہے۔“ وہ دل کی بات زلیخا سے چھپا گیا تھا۔

”کب لوٹو گے؟“ زلیخا تو ہمیشہ اس کے جانے کا کم مکر واپس آنے کا زیادہ پوچھتی تھی۔

”ایک دن میں ہی۔“ اسے شہر جانے کی جلدی تھی اس لئے اس بار زلیخا سے ملاقات بھی اچھوری رہی تھی، زلیخا تشنہ تشنہ سی واپس گھر آگئی تھی اور وہ خوش خوش شہر روانہ ہو گیا تھا۔

”کون ہو کہاں سے آئے ہو۔“ صبح کے گیارہ بجے ہی وہ روپی کے گھر کے آگے کھڑا تھا، بڑی بڑی موچکوں والے چوکیدارم نے بکڑی نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میرا نام مراد علی ہے، تمس آباد سے آیا ہوں، یہ میڈم جی نے کارڈ دیا تھا انہوں نے خود آنے کا کہا تھا۔“ چوکیدار کی لمبی چوڑی نفیث سے بچنے کے لئے اس نے ذرا سا جھوٹ بھی بول دیا تھا۔

”اچھا تم ٹھہرو میں میڈم صاحبہ سے پوچھتا ہوں۔“ چوکیدار گیٹ کے ساتھ بنے گیٹن میں گیا تھا اور انٹرکام پر میڈم صاحبہ سے پوچھا تھا۔

”کون مراد علی، میں کسی مراد وراڈ کو نہیں جانتی۔“ روپی ابھی سو کر ابھی تھی اور فریش جوس کے ساتھ آج کے اخبارات سرسری سا دیکھ رہی تھی جب اسے پیغام ملا تھا۔

”جاؤ یہاں سے، میڈم صاحبہ کہہ رہی ہیں میں کسی مراد وراڈ کو نہیں جانتی۔“ چوکیدار نے درستی سے کہا تھا، اس کے لئے یہ معمول کی بات تھی، روپی کے بہت سے پرستار گھنٹوں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اس کے گھر کے آگے کھڑے رہتے تھے۔

”تم نے سچ سے میرا نام تو بتایا تھا نا۔“ مراد کو یقین نہیں تھا کہ روپی اتنی جلدی اس کا احسان

بھول جائے گی۔  
”اد جاؤ یہاں سے، ہمارا دماغ نہ خراب کو، تمہارے جیسے تو جانے کتنے ہی اس کی راہوں میں پڑے رہتے ہیں۔“ وہ دل برداشتہ سا واپس لوٹ آیا تھا، سارے خواب ملیا میٹ ہو گئے تھے، دل کی بے قراری جوں کی توں تھی، اس بے قراری کو تو روپی کی اک جھلک سے سچ ہونا تھا۔

مراد شہر سے واپس آ گیا تھا، زلیخا اس کے پیغام کی منتظر ہی رہی مگر اس شام اسے کوئی پیغام نہ ملا تھا، رات اڑ کر شمس آباد پر چھا گئی تھی، زلیخا بے چینی سے چارپائی پر لیٹی کروٹیں بدلے جا رہی تھی، مراد سے دو دن ہو گئے تھے ملے ہوئے بے چینی تو حد سے سوا ہونا ہی تھی۔

دوسری طرف بے چین تو مراد بھی تھا، روپی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور وہ دل شکستہ سا تھا، پھر وہ اٹھ کر سراج کی بیٹھک میں آ گیا تھا جہاں اس نے روپی کی فلم منگوا کر دیکھی تھی، روپی کی ہر ادھر روپ قیامت خیز تھا، اس کا رقص اس کا حسن اپنے اچھوں کے ہوش اڑا دیتا تھا یہ تو مراد علی تھا، جس نے عورتوں میں پہلے اتنی خوبصورتی کہاں دیکھی تھی اور جب روپی میں دیکھی تھی تو دیوانہ سا ہو گیا تھا۔

پھر وہ رہ نہ سکا تھا اور دوبارہ سہ بارہ شہر گیا تھا روپی سے ملنے کو، مگر ہر بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا، روپی سے ملنا ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

”مراد تم بہت بدل گئے ہو۔“ اس شام زلیخا نے خود ہی اسے پیغام بھیج کر بلوایا تھا اور اس کی آنکھوں کا پھیلا پھیلا کاجل کہہ رہا تھا کہ اس کے دل نے مراد کی بدلتی نگاہوں کا پیغام پڑھ لیا ہے۔  
”کیوں میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔“ وہ زلیخا سے نظر چرا کر بولا تھا۔

”تو پھر میری طرف دیکھو نا اگر تم نہیں بدلے۔“ زلیخا اس کی گہری نظروں کی عادی تھی اس کی سرسری نظریں محسوس کیسے نہ کرتی۔  
”تمہاری طرف ہی تو دیکھ رہا ہوں۔“  
”میری طرف نہیں دیکھ رہے ہو تم، مراد تم بدل رہے ہو۔“ وہ ایک ہی بات کی گردان کیے جا رہی تھی۔

”اچھا میں چلتا ہوں، کچھ کام ہے۔“ زلیخا کے ضدی لہجے سے وہ گھبرا کر بولا تھا۔  
”اتنی جلدی کس بات کی ہے۔“ زلیخا کچی مٹی پر بیٹھی ایک سوکھی ٹہنی سے لکیریں کھینچ رہی تھی۔

”کوئی دیکھ لے گا۔“ مراد علی نے بودا سا بہانہ بنایا تھا۔

”محبت میں ڈرنے بھی لگے ہو۔“ وہ پھسکی سی ہنسی ہنس کر بولی تھی اور سوکھی ٹہنی پرے پھینکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”زلیخا تیرا مراد علی تو میڈم روپی کی محبت میں جکڑا گیا ہے، کیا کروں اس کے سوا کچھ اور اچھا ہی نہیں لگتا یہاں تک کہ تمہاری محبت بھی۔“  
زلیخا پاؤں پیچنے والے انداز میں چلتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چلی گئی تھی، پیچھے دھول سی اڑتی تھی اور مراد علی کھڑا من ہی من میں سوچے جا رہا تھا۔

☆☆☆

ماہیا مینوں یاد آندا  
میرے دل وچوں اٹھ دی اے ہوک  
ماہی آوے گا تے خوشیاں مناداں گی  
اودے راہواں وچ آکھیاں وچھاواں گی  
جان کر چھڈی اے وچھوڑیاں نے پھوک  
سن چرنے دی منٹھی منٹھی کوک  
ماہیا مینوں یاد آندا  
مراد علی تو شہر کا ہو کر رہ گیا تھا، جانے شہر کی لمبی لمبی سڑکوں پر اونچی اونچی عمارتوں میں بے تحاشا



شارش میں اس کا کیا کھو گیا تھا کہ جو اسے ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا تھا، زلیخا کا تو رنگ روپ ایسے اجڑا تھا کہ جیسے اس کی حیاتی کے سارے رنگ مراد شہر لے گیا ہو چرا کے، وہ سارا سارا دن بے چین رہتی تھی، گلیوں میں کھوئی کھوئی پھرتی تھی، سکھوں کے پاس بیٹھی ہوتی تو بھی مراد کو یاد کر رہی تھی، رات سوئے کو لپکتی تو مراد کے ہو کے بھرتی، کھانا کھانے بیٹھتی تو مراد کا نام حلق میں پھنس جاتا پھر ایک نوالہ بھی حلق سے نیچے نہ اترتا۔

”آپا اب تو کچھ کھالے، اماں نے خود ہی سب کام کر لیا ہے۔“ نصیبو ہاتھ پیہ روئی رکھے چپڑ چپڑ کھا رہی تھی اسے ہلا کر بولی تھی، دیوار کے ساتھ کروٹ لئے لئے اس کی کمر دکھنے لگ گئی، اس نے سیدھے ہو کر لال لال آنکھوں سے نصیبو کو گھورا تھا، جواب پوری روئی کھا چکی تھی اور اپنی انگلیاں جاٹ رہی تھی، اس کو بھی کبھی ایسے ہی بھوک لگا کرتی تھی مگر اب تو وہ روئی بھی مارے باندھے کھاتی تھی۔

”نی مہارانی اٹھ جا اب، کیوں چار پائی کی دشمن بن گئی ہو۔“ نیا رکا کھانہ فرش پر چھٹی ہوئی دری پر کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گئی تھی۔

”سب میرے ہی پیچھے بڑ جاتے ہیں۔“ وہ بڑ بڑاتی ہوئی اٹھی تھی اور نکلے کے پاس جا کر منہ دھونے لگی تھی، جو بڑی دیر تک رونے سے اب دکھنے سالگا تھا۔

مراد علی کو شہر گئے تو بہت دن ہو گئے تھے، منہ دھوتے دھوتے اک یاد ایسی نہیں بن کر دل سے اٹھی تھی کہ وہ گزرے دن انگلیوں پر شمار کرنے لگی تھی جو اتنے بہت سارے تھے کہ انگلیوں پر گنے ہی نہ جاتے تھے۔

☆☆☆

مراد نے تو میڈم روئی کے در کو ہی پکڑ لیا

تھا، ایک محبت شمس آباد میں زلیخا کو تڑپا رہی تھی اور ایک محبت ڈیفنس کے ایک محل نما گھر کے گیٹ پر مراد علی کی صورت میں رل رہی تھی۔

مراد کی قسمت زور آور تھی یا محبت سچی تھی کہ ایک دن میڈم روئی کی نظر کرم اس کی طرف ہو گئی، اس کا ڈرائیور جو اس کا باڈی گارڈ بھی تھا، وہ اس کو چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اب روئی کو ایک ایسے بندے کی سخت ضرورت تھی جو اس کی گاڑی بھی ڈرائیو کر سکے اور اس کی حفاظت بھی کر سکے، مراد علی جس طرح بے دریغ اس دن ڈاکوؤں سے لڑا تھا، وہ روئی کو بخوبی یاد تھا، روئی کئی ماہ سے اسے مسلسل نظر انداز کر رہی تھی مگر اب ضرورت پڑی تھی تو اس نے گاڑی اندر لے جاتے ہوئے گیٹ پر مامور گارڈ سے کہا تھا کہ اس شخص کو اندر بھیج دے۔

”جاؤ میڈم نے تمہاری سن لی ہے، تمہیں اندر بلا رہی ہیں۔“ گارڈ اس سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا، اب اس کے قریب آ کر خوش دلی سے کہا تھا۔

”کیا کہا تم نے؟ میڈم نے مجھے بلایا ہے۔“ مراد کو تو کتنی دیر تک اس کی بات پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔

”ہاں جاؤ جلدی کرو، پھر کہیں ان کا ارادہ بدل نہ جائے اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔“ گارڈ نے کہا تو وہ اندر کی طرف بھاگا تھا۔

”کیا حال ہے مراد علی۔“ روئی کو ابھی تک اس کا نام بھی یاد تھا، وہ تو اس کے منہ سے اپنا نام سن کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا، روئی نے اس سے پوچھا تھا اور وہ ابھی تک اس کی حسن کی تجلیوں میں گھویا ہوا تھا، بڑے دنوں بعد حسن یار کی دید سے سیراب ہو رہا تھا، اس لئے آنکھیں دیکھتے دیکھتے نہ تھک رہی تھیں۔

”مراد علی میں نے حال پوچھا ہے۔“ وہ

دوبارہ گویا ہوئی تھی۔

”جی ٹھیک ہے، ٹھیک ہوں۔“ وہ گڑبڑا گیا تھا، روئی مسکرا کر رہ گئی تھی۔

”میرے پاس نوکری کرو گے۔“ آج تو وہ پرستم پرستم ڈھار ہی تھی، وہ اک جھلک کے لئے بے تاب تھا اور کہاں اب مستقل قرب نصیب ہونے والا تھا۔

”بالکل کروں گا جی۔“ اس نے نہ کام کی نوعیت پوچھی تھی اور نہ کچھ اور اسے تو بس میڈم روئی کے پاس کام کرنا تھا اور بس۔

”گاڑی چلا لیتے ہو؟“

”جی بہت اچھی ڈرائیونگ کرتا ہوں۔“

”بس تو پھر تمہاری نوکری کئی، ڈرائیور بھی تم ہی ہو اور آج سے میرے باڈی گارڈ بھی تم۔“

روئی اس کے والہانہ انداز بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی اس نے مراد علی جیسے کئی پروانے اپنے عشق کی آگ میں تڑپتے سکتے اور پھر جلتے ہوئے دیکھے تھے۔

”میرا بیتر تم سے باقی معاملات طے کر لے گا، تنخواہ وغیرہ کے۔“ وہ بے نیازی سے بولی تھی۔

”اس کی کیا ضرورت ہے جی، بس جو آپ نے کہہ دیا سو کہہ دیا۔“ مراد علی اتنا ولے پن سے بولا تھا بس پھر وہ دن تھا اور آج کا دن مراد علی نے شمس آباد کو خیر باد کہہ دیا اور روئی کا ہی ہو کر رہ گیا، نہ شمس آباد یاد رہا نہ اس میں بسنے والی زلیخا، جس کی صبح بھی مراد علی پر ہوتی تھی اور رات بھی اسی پر، جو اس سے بڑا گہرا عشق کرتی تھی، جس کا ہار سنکھار بھی مراد علی تھا اور چند جان بھی وہی، وہ اور اس کی محبت شمس آباد کی کچی گلیوں میں ہی رہ گئی تھیں اور مراد علی مشہور فلمسٹار روئی کا بے دام غلام بن کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

طعنے مار دے نے اپنے شریک دے لکھ چھٹی وجہ اون دی تاریک دے کالی رات ڈنگے مینوں شوک سن چہنے دی منھی منھی کوک ماہیا مینوں یاد آوندا ماہیا مینوں یاد آوندا

”مراد علی تیرا تھا ہی کہاں، تو ہی اس کے پیچھے چلی تھی۔“ وہ جہاں سکھوں میں بیٹھتی اسے وہاں ایک ہی طعنہ ملتا تھا، طعنہ ملتا بھی کیسے نہ، وہ اب ہلے والی زلیخا کہاں رہی تھی، نہ وہ سکھوں سے تیلے جیسی باتیں کرتی تھی نہ ان کے ساتھ مل کر ہنسی کی نہ ان کے کسی کام آتی تھی، بس مراد علی کی جدائی اور بے وفائی کی پکی تصویر بن کر رہ گئی تھی۔

”زلیخا تمہیں پتہ ہے مرادے کو فلمسٹار روئی کے پاس ڈرائیور کی نوکری مل گئی ہے۔“ ایک دن چھپو نے انکشاف کیا تھا۔

”تو مراد علی تمہیں تمہاری منزل مل ہی گئی۔“ وہ جانتی تھی، مراد علی روئی کے پیچھے اس کو چھوڑ کر گیا ہے اور اب اس کے پاس نوکری کا سن کر اسے بہت تکلیف ہوئی تھی، پھر ایک دن اس نے سنا کہ مراد شمس آباد آیا ہوا ہے، اس کی آنکھیں سارا سارا دن مراد کے گھر کو جانے والے راستے کو دیکھا کرتی تھیں کہ وہ گھر سے باہر نکلے اور وہ اسے گھیر لے، ایک دن یہ موقع بھی آ گیا تھا، وہ جا رہا تھا اور زلیخا نے راستہ سنسان دیکھ کر اس کو جالیا تھا۔

”زلیخا تم۔“ اسے دیکھ کر وہ یوں بدکا تھا جیسے کالی بلی نے راستہ کاٹ دیا ہو۔

”ہاں مجھے دیکھ کر اتنا حیران کیوں ہو رہے ہو، میں وہی زلیخا ہوں، جو کبھی تمہاری زلیخا تھی۔“ وہ پھنکاری تھی۔

”میرا راستہ چھوڑو، مجھے گھر جانا ہے۔“

”زلیخا تم۔“ اسے دیکھ کر وہ یوں بدکا تھا جیسے کالی بلی نے راستہ کاٹ دیا ہو۔

”ہاں مجھے دیکھ کر اتنا حیران کیوں ہو رہے ہو، میں وہی زلیخا ہوں، جو کبھی تمہاری زلیخا تھی۔“ وہ پھنکاری تھی۔

”میرا راستہ چھوڑو، مجھے گھر جانا ہے۔“



”تو میں نے کون سا کہا ہے مجھے بھی ساتھ لے چلو، میں تو بس تمہیں اک نظر دیکھنا چاہتی تھی کہ میڈم روبی کی محبت نے تم پر کیا اثر ڈالا ہے۔“ وہ طنز سے بولی تھی۔

”بس اتنا بتا دو اس کے حسن سے محبت کی ہے یا دولت سے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ آنکھیں دکھانے لگا تھا۔

”میں پوچھ رہی ہوں کچھ تو ہے جس نے تمہیں بدل ڈالا۔“

”مجھے نہیں پتہ مجھے جانے دو۔“ وہ اسے ہاتھ سے پرے ہٹا کر لیے لیے ڈگ بھرتا ہوا آگے نکل گیا تھا، زلیخا کی آنکھوں سے بے رنگ پانی ٹپ ٹپ بہنے لگا تھا۔

اک طوفان تھا اک طغیانی تھی جو زلیخا کی سوچوں پر چھائی ہوئی تھی، محبت میں ناکامی اور بار اس کے اندر ایک پھرا ہوا طوفان بن گئی تھی وہ تو بس روبی اور مراد کو نیچا دکھانے کا سوچنے لگی تھی مگر اندھیر سا اندھیرا تھا کوئی کرن سے بچھائی ہی نہ دیتی تھی، وہ زمین کی گردھی اور آسمان کو چھونے کی تمنا کر رہی تھی اور اس کے لئے اسے سیڑھی درکار تھی ایسی سیڑھی جو اس گرد کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دے اور پھر اک روز اسی رات کے وقت جب چاند پورے جو بن پر تھا ہوا تھی وہ بھی اور ہر شے ساکن تھی وہ اپنی چارپائی پر لیٹ کر بیٹھ گئی تھی، اسے آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے والی سیڑھی کا سراغ مل گیا تھا، مگر اس سیڑھی پر چڑھنا سولی چڑھ جانے کے مترادف تھا، وہ چارپائی سے اٹھی تو چارپائی سے جڑ جڑا ہٹ کی آواز آئی تھی۔

”کون ہے؟“ نیما نے سوتے میں پوچھا تھا۔

”اماں میں ہوں، پیاس لگی ہے۔“ وہ پیر

گھسیٹی ہوئی گھڑی تک پہنچی تھی اور دو تین گلاس غٹا غٹ چڑھا گئی تھی، پیاس بھی کہہ سکتی ہی نہ تھی اور یہ کیسی پیاس تھی اسے خود سمجھ میں نہ آتا تھا۔

پانی پی کر بھی جو اس بحال نہ ہوئے تھے وہ سولی چڑھنے کو تیار تھی اور اس سولی کا نام تھا چوہدری انوار، چوہدری کبیر کا سب سے چھوٹا بیٹا جو شہر میں زیادہ اور گاؤں میں کم رہتا تھا اور جس کے اونچے اونچے لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے، اور جو جب بھی گاؤں آتا تھا زلیخا کے ممکن حسن کو ایسے وحشی انداز میں ٹکا کرتا تھا کہ زلیخا اندر تک کانپ جاتی تھی، اس نے بہت سوچا تھا بہت پرکھا تھا، ادھر ادھر نظریں دوڑائی تھیں مگر چوہدری انوار کے سوا اس کے لئے سیڑھی کوئی بھی نہیں بن سکتا تھا، اب وہ مطمئن ہو کر لیٹ گئی تھی، کام کچھ آسان ہوتا دکھائی دینے لگا تھا۔

☆☆☆

”نی چوہدری انوار کی جیب دو تین دفعہ تیری گلی کے پھیرے مار کر گئی ہے، خیر تو ہے نا۔“ کوئی نے اسے سے پوچھا تھا، وہ کیا بتاتی کہ چوہدری انوار کو بس دو تین دفعہ مسکرا کر دیکھا تھا اور اس دل پھینک چوہدری نے تو اس کی گلی میں ڈیرہ ہی ڈال لیا تھا، ابھی وہ جب گاؤں میں ہی رہتا تھا تو زلیخا کا بڑا طلب گار تھا مگر جب شہر چلا گیا تو اس کی عیاشیاں شہر والوں سے پوری ہو جاتی تھیں اور پھر زلیخا اسے لفٹ بھی کہاں کرواتی تھی، اب جبکہ زلیخا نے خود پہل کی تھی اس کے دل میں زلیخا کی قربت کی بہت پرانی طلب جاگ اٹھی تھی۔

”نی میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔“ کوئی نے اس کا گھٹنا ہلایا تھا۔

”لو مجھے کیا پتہ، وہ ادھر کیا کرنے آیا تھا، ویسے بھی وہ گاؤں کے چوہدریوں کا بال ہے جہاں جا ہے جاسکتا ہے، تمہیں کیا ہے۔“ اس نے

گوگی کو بڑا روکھا سا جواب دیا تھا۔

”جب سے شہر گیا ہے تب سے گاؤں میں کم ہی نظر آتا ہے، اس لئے پوچھ رہی ہوں اور میں نے کیا اس کا اچار ڈالنا ہے۔“ زلیخا کے روکھا بولنے کا گوگی نے کافی برا منایا تھا۔

”تو چوہدری انوار کو چھوڑ یہ بتا کہ تمہاری اماں نے ساگ کب پکانا ہے۔“ زلیخا نے اس کی توجہ بٹائی تھی۔

”ابھی تو سردیاں شروع نہیں ہوئی، ساگ کہاں سے آگیا، تیرا کیا ساگ کھانے کو دل کر رہا ہے۔“

”تمہیں میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔“ وہ گوگی سے بولی تھی، حالانکہ دل کہاں اب کچھ چاہتا تھا دل تو جیسے مراد کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔

”میں تیرے ساتھ شہر جانا چاہتی ہوں، نکاح کر کے لے جا، یا بھگا کر، یہ تیری مرضی ہے بس مجھے تو تیرے ساتھ جانا ہے۔“ جہاں چوہدریوں کے آموں کے باغ لگے ہوئے تھے انوار اپنی جیب میں وہاں بیٹھا تھا اور زلیخا اس کی جیب کا دروازہ پکڑ کر کھڑی اس سے ضد کر رہی تھی۔

”یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔“ محبت کے غم نے اس کو اتھری گھوڑی بنا دیا تھا، چوہدری انوار کو اس کی یہ اکڑ، یہ باغیانہ انداز سیدھا اپنے دل پر وار کرتا محسوس ہوتا تھا، وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔

”جب تم سے دور نہیں رہنا تو پھر یہی طریقہ ہے بات کرنے کا۔“ اس نے چوہدری انوار کے ایسے اپنی اداؤں میں گھر لیا تھا کہ وہ یہی سمجھتا تھا کہ زلیخا اس پر مر مٹی ہے۔

”ایسے تو نہ کہو یہ نہ ہوا بھی تمہیں جیب میں بٹھا کر شہر لے جاؤں۔“ اس کی بات سن کر وہ بے قرار ہوا تھا۔

”لے جاؤ اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔“ وہ بھی کہاں ڈرتی تھی۔

”تمہارے گھر والے ماں باپ بہن بھائی پنڈ والے کیا تمہیں ان کی پرواہ نہیں ہے۔“ ”نہیں ہے بس تمہاری پرواہ ہے۔“ وہ بے نیازی سے پراندہ جھلانے لگی تھی۔

”جلدی کرتا ہوں کچھ۔“ وہ جانے کے لئے مڑی تو اس نے پیچھے چوہدری انوار کی آواز سنی تھی اور پھر اپنے گھر واپس آ گئی تھی۔

☆☆☆

روبی کو مراد کی شکل میں ایک اچھا ڈرائیور ایک اچھا اور مضبوط باڈی گارڈ مل گیا تھا اس کے ساتھ ساتھ جس طرح وہ اس کے آگے پیچھے پھرتا تھا، وہ جہاں پاؤں دھرتی تھی وہاں وہ ہاتھ دھرتا تھا اس سے روبی کے احساس برتری کے جذبے کی اور تسکین ہوتی تھی، وہ ایک فلم کی شوٹنگ کے لئے دہلی گئی تو مراد کو بھی باڈی گارڈ کی حیثیت سے ساتھ لے گئی تھی، مراد کے تو پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے، روبی کے شب و روز کا قرب اس کو حاصل تھا اور نئے نئے چیزوں سے ملاقات ہوتی تھی جن کو اس نے ہمیشہ لی وی پر ہی دیکھا تھا اور اس نے بھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ بھی ان چہروں کو قریب سے دیکھ سکے گا یا ان لوگوں سے مل سکے گا۔

مراد روبی کے لئے بس ایک ڈرائیور اور باڈی گارڈ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا مگر مراد خود کو جانے کیا سمجھتا تھا، وہ تو خود کو روبی کا سب کچھ سمجھنے لگ گیا تھا۔

چوہدری انوار زلیخا کے ساتھ شادی کر کے نہ لے جاسکتا تھا اس کے لئے اسے اپنے گھر والوں کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا وہ اس کوئی الوقت ملازمہ کی حیثیت سے ساتھ لے جا رہا تھا۔



”نیا میرا دل نہیں مانتا زلیخا کو شہر بھیجنے کو۔“  
دینو کو چوہدری ان کا پیغام ملا تھا کہ ان کی بڑی بہو جو  
چوہدری سجاو کی بیوی اور چوہدری انوار کی  
بھابھی شہر جا رہی ہے اور ساتھ زلیخا کو لے جانا  
چاہتی ہے۔

”کیوں، بھیج دیتے ہیں، زلیخا ان کی  
ملازمت کرے گی تو ہم بھی کچھ سکون کا سانس  
لے سکیں گے، چار پیسے آئیں گے۔“ نیا جو روز  
روز بڑھتی مہنگائی سے خائف تھی، دینو سے کہنے  
لگی تھی، اس طرح دینو بیوی کو رضا مند دیکھتے  
ہوئے زلیخا کو شہر بھیجنے پر تیار ہو گیا تھا، چوہدری  
انوار کی اپنی بھابھی سے گاڑھی چھنتی تھی، اس نے  
بھابھی کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ زلیخا کو  
ساتھ لے جانا چاہتا ہے، بھابھی تو دیور کی خاطر  
بہت کچھ کر سکتی تھی یہاں تو سوال صرف زلیخا کا تھا  
جو ان کے کسی کھاتے میں نہیں تھی اس طرح ان  
کی مدد سے انوار زلیخا کو شہر لے جانے میں  
کامیاب ہو گیا تھا۔

زلیخا انتقام کی آگ میں جھلس رہی تھی شہر آ  
کر اس نے چوہدری انوار کا خوب دل بہلایا تھا،  
نہ یہاں کوئی روکنے والا تھا نہ ٹوکنے والا، بھابھی  
سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی تھی اور زلیخا  
چوہدری کے ساتھ عیاشیوں میں مصروف رہتی  
تھی۔

”میں تجھ سے بہت خوش ہوں، آج مانگ  
کیا مانگتی ہو۔“ ایک دن چوہدری انوار نے ترنگ  
میں آکر کہا تھا۔

”تو میرے لئے کیا کر سکتا ہے۔“ وہ  
چوہدری انوار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی  
تھی۔

”سب کچھ بس ایک کام ذرا مشکل ہے،  
نکاح کرنا، تم تو جانتی ہو اماں اپنی بیٹی کے ساتھ  
میری شادی کرنا چاہتی ہے اگر میں اس کی بہو کسی

اور کو بنا لیتا ہوں تو وہ اپنی جان لے لے گی اور  
زلیخا تو یہ بھی جانتی ہے اپنی اماں سے میں کس قدر  
محبت کرتا ہوں۔“

”بھئی کہتا ہے زلیخا تجھ سے محبت کرتا ہوں  
اور کبھی تو کہتا ہے اماں سے محبت کرتا ہوں۔“ وہ  
اٹھلائی تھی۔

”ہاں تو دونوں سے ہی کرتا ہوں بس تم سے  
محبت کرنے میں فرق ہے اور اماں سے محبت میں  
بھی فرق۔“ زلیخا اسے بھی بڑا برا گھیرتی تھی۔

”چل پھر ایسا کر مجھے ڈراموں فلموں میں  
کام دلا دے، میں نے دیکھا ہے تیرے بہت  
تعلقات ہیں اس دن بھی ایک فلم بنانے والا  
تیرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔“ زلیخا نے سمجھ لیا تھا کہ  
وہ ٹائم آگیا ہے جس کے لئے اس نے اتنا انتظار  
کیا ہے اور اپنا اتنا کچھ گنوا دیا ہے، اب چوہدری  
انوار کے لئے وہ اتنی اہم تھی کہ کم از کم اس اتنا  
وہ اس کی کوئی بات رو نہیں کر سکتا تھا۔

”اونے تو فلموں میں کام کرے گی۔“ اس  
کی انوکھی خواہش کا سن کر چوہدری انوار کا تہقہ  
بے ساختہ تھا۔

”ہاں تو مجھے کیا ہے، کیا خویصورت نہیں  
ہوں۔“

”نہیں وہ تو تم ہو، ایسے ہی نہیں چوہدری  
انوار تمہارے پیچھے پاگل ہے، مگر میری جان  
فلموں میں کام آسانی سے تو نہیں مل جاتا، بڑے  
پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، بڑے امتحان سے گزرنا پڑتا  
ہے۔“ وہ مجھ رہا تھا وہ مذاق کر رہی ہے، مگر وہ تو  
حد درجہ سیریس تھی۔

”تعلقات ہوں تو سب کچھ ہو جاتا ہے،  
پھر چوہدری انوار اتنا بھی گیا گزرا نہیں کہ میرا یہ  
کام نہ کر سکے۔“ اس نے اسے طیش دلایا تھا۔

”خیر یہ تو تمہاری بات ٹھیک ہے، چوہدری  
انوار اب اتنا بھی گیا گزرا نہیں، کرتا ہوں کچھ

میری جان۔“ وہ کچھ سوچنے لگا تھا اور زلیخا کو اپنی  
شہر قریب آتی محسوس ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

کتان پونیاں تے ہنجو میرے دگدے  
ہن ہا سے دی نہیں مینوں چنگے لگدے  
کیوں بھل جانواں اوہدے میں سلوک  
سن چرنے دی منھی منھی کوک  
میرے دل وچوں اٹھ دی اے ہوک  
ماہیا مینوں یاد آوندا  
چوہدری انوار نے اپنے ایک دوست سے  
زلیخا کو ملوایا تھا جو قلمی دنیا کا بڑا مجھتا ہوا ڈائریکٹر تھا  
اس نے زلیخا کا اسکرین ٹیسٹ لیا تو زلیخا کے نمکین  
حسین نے اسکرین پر جلوہ افروز ہو کر اس  
ڈائریکٹر کو مہموت سا کر دیا تھا، وہ ہیرا بھی مگر ابھی  
اے بہت سارے اشتیاقی تھا اور اس کی اس تراش  
خراش میں کیا کیا کچھ کام آیا اس کی عزت مان جیا  
حرم وہ سب چھوڑ چلی گئی اور پھر وہ دن بھی آیا  
جب شاہ صاحب نے اعلان کر دیا کہ ان کی نئی فلم  
میں ایک نئی لڑکی ہیرون آرہی ہے، جس کا نام سلیم  
ہوگا۔

جس رات اسے ایک نئی پہچان ملی تھی، وہ  
زلیخا سے سلیم بنی تھی اس رات وہ بے وفا ٹوٹ کر  
یاد آیا تھا، چھوٹی چھوٹی ٹیٹل سونے کی بالیاں جو  
مراد کا پہلا تحفہ تھیں ابھی تک اس کے کانوں میں  
ہلکورے لیتی تھیں اور جنہیں مراد نے اپنے  
ہاتھوں سے پہنایا تھا، بے ساختہ ہی اس کا ہاتھ  
اپنے دونوں کانوں کو چھو گیا تھا، ان بالیوں پر ابھی  
تک مراد کے ہاتھوں کا لمس تازہ تھا، وہ نرم گرم  
بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی آج بھی اس کی یاد اتنی  
زور آور تھی کہ اس کی ہستی کی تمام بنیادوں کو ہلا  
دیتی تھی۔

”روٹی جی سنا ہے شاہ صاحب اپنی نئی فلم  
میں کسی نئی لڑکی کو لا رہے ہیں۔“ روٹی کے پی

اے نے اس سے پوچھا تھا۔  
”ہاں تو پھر کیا ہے، شاہ صاحب کو ایسے  
کڑاک کرنے کی عادت ہے، بے شک وہ نئی  
چلے یا نہ چلے۔“ روٹی لب اسٹک لگا رہی تھی چلے  
کے انداز میں بولی تھی، ویسے بھی اسے امید تھی کہ  
شاہ صاحب کی نئی فلم کی ہیرون وہی ہوگی، مگر  
انہوں نے اس بار اس کے بجائے ایک نیا ہی  
رول ڈال دیا تھا۔

”وہ کہاں چلے گی جی، آپ کے سامنے کس  
کاٹوطی بول سکتا ہے۔“ اس کے پی اے نے اس  
کی خوشامد کی تھی، روٹی کے ہونٹوں پر معنی خیزی  
مسکراہٹ اند پڑی تھی، آخر اس کا پی اے ٹھیک  
ہی تو کہہ رہا تھا۔

شاہ صاحب کی نئی فلم بڑی محنت اور بڑے  
سرمائے سے بنی تھی، زلیخا عرف سلیم نے اس میں  
جان توڑ محنت کی تھی اور اس کا نتیجہ حسب منشا نکلا  
تھا، اس فلم نے سینماؤں میں لگتے ہی اگلے پچھلے  
تمام ریکارڈ توڑ دیئے تھے، زلیخا نے اس میں کافی  
بولڈ کام کیا تھا اور وہی آج کے دور کا تقاضا تھا،  
جس کی نے بھی ایک دوسرے سے اس فلم کی  
تہنیک سنی تھی وہ سینما کی طرف دوڑا چلا تھا یہ فلم  
دیکھنے کو، سلیم کے رقص بے ساختہ اداکاری نے  
شائقین کے دل جیت لئے تھے، ایک ہی رات  
میں ایک ہی دن میں غیر معروف سی زلیخا بے حد  
مصروف ہستی سلیم بن کر ابھری تھی اور اس طرح  
اس کی تقدیر ہی بدل گئی تھی، چوہدری انوار بہت  
خوش تھا کہ اس نے سلیم کو متعارف کروایا تھا، سلیم  
ایک ہی رات میں ایک سلیم بن گئی تھی  
چوہدری انوار کے گھر کے آگے کارڈز اور پھولوں  
کا ڈھیر لگ گیا تھا کیونکہ یہ سلیم کی آماجگاہ تھی، ٹیلی  
فون کا تانا بندھ گیا تھا، دوسری طرف روٹی  
پاؤں شیخ رہی تھی۔

”اس شاہ کو بھی جانے کیا بیماری ہے، جب



بھی کوئی ہیروئن اپنے قدم جما لیتی ہے یہ کسی نے چہرے کو لا کر اس کے قدم اکھاڑ دیتا ہے۔“ روبی ایسا سوچ رہی تھی جیسے وہ بھی شاہ صاحب نے ہی متعارف کروایا تھا اور جس نے اپنے وقت کی مشہور و معروف ہیروئن کے یونہی چھکے چھڑا دیئے تھے۔

”دفع کریں جی، زیادہ ٹینشن نہ لیں، ایک فلم ہٹ ہو گئی ہے تو کیا ہوا، آپ کا مقابلہ تو کوئی نہیں کر سکتا۔“ روبی کا غم غلط کرنے والے اسے تسلیاں دے رہے تھے، مگر اس کی جلن کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی یہی حال فلم انڈسٹری کی دوسری ہیروئنز کا بھی تھا، نیلم ایک ہی رات میں شہرت کی بلند یوں تک جا پہنچی تھی۔

☆☆☆

”زیلخا یہاں پہنچ جائے گی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ مراد کی حیرت سب سے سوا تھی۔ جب سے شاہ صاحب کی فلم کی پبلسٹی ہو رہی تھی وہ نیلم نام کی ہیروئن کا نام سن رہا تھا اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دراصل نیلم زیلخا ہوگی، شمس آباد کی رہنے والی اس پر مرثیہ والی سانولی سلونی زیلخا اور جب اس فلم کے پوسٹر لگے تھے تب بھی اس نے ہی جانا تھا یہ زیلخا کی کوئی ہم شکل ہے، مگر جلد ہی اس کا گمان یقین میں بدل گیا تھا، نیلم زیلخا ہی تھی، شمس آباد کی زیلخا۔

نیلم کے پاس پہلی ہی فلم ہٹ ہونے کے بعد فلموں کی لمبی لائن لگ گئی تھی، ہر ڈائریکٹر اسے ہی کاسٹ کرنا چاہتا تھا کیونکہ لوگ اب اس نئی دلکش فنکارہ کو کسی اور روپ کسی اور گیٹ اپ میں بھی دیکھنے کے خواہاں تھے۔

☆☆☆

”زیلخا میں مراد ہوں۔“ مراد علی کب سے زیلخا سے ملنا چاہ رہا تھا مگر وہ اتنی مصروف و مشہور

ہستی بن گئی تھی کہ اس کی رسائی اپنے شمس آباد کی سیدھی سادھی زیلخا تک ہونہ پار ہی تھی وہی زیلخا جو اس کی راہوں میں آنکھیں بچھائے رکھتی تھی، ایک دن وہ گھنٹوں وہاں بیٹھا رہا تھا جہاں نیلم کی نئی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی، جیسے ہی شوٹنگ ختم ہوئی اور نیلم اسے تنہا نظر آئی وہ اڑتا ہوا اس تک پہنچا تھا۔

”کون مراد؟“ اس نے جان بوجھ کر نہ پہچاننے کی اداکاری کی تھی حالانکہ اس بے وفا کو دیکھ کر دل تو ابھی بھی تیز دھڑکنے لگا تھا۔

”مجھے بھول گئی ہو۔“ وہ حیران ہی حیران تھا۔ ”میں تو بہت سارے لوگوں کو بھول گئی ہوں، لیکن اب مجھے کوئی نہیں بھول سکتا۔“ اس نے اک ادا سے کہا تھا، وہ دیکھ رہی تھی کہ مراد علی کی نظریں اس کے چہرے اس کے سر پر سے ہٹ ہی نہیں رہی ہیں، اسے شمس آباد کی وہ سچی شام یاد آئی تھی جب مراد روبی کا حسین عکس نگاہوں میں سمو کر گاؤں لوٹا تھا اور پھر اس کی نظر میں زیلخا کا سادہ سا چہرہ آج ہی نہیں رہا تھا، مگر آج اس نے دیکھا تھا کہ مراد علی کی پرشوق نگاہوں میں اس کا عکس ڈوبتا اور ابھرتا تھا اور اسی ایک پل کو دیکھنے کے لیے وہ یہاں تک آن پہنچی تھی۔

”بہت خوبصورت ہو گئی ہو۔“ مراد نے کہہ ہی دیا تھا۔

”خوبصورت تو میں پہلے بھی تھی، تمہیں نظر آج آئی ہوں، ویسے بھی میرا تجربہ کہتا ہے کہ مرد ہمیشہ خوبصورت چہرے اور خوبصورت جسم سے ہی محبت کرتا ہے، دل جیسی کھری چیز تو اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔“ اتنا کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی گاڑی کی طرف چلی گئی تھی جہاں شاہ صاحب اس کے منتظر تھے، اسے ابھی مراد کو اور تڑپانا تھا جیسا کہ مراد نے اسے تڑپایا تھا۔

☆☆☆

”مشہور فلمسٹار روبی کا ڈرائیور اور ہاڈی گارڈ ڈاکوؤں سے لڑتے ہوئے جاں بحق۔“ اخبار میں یہ ایک چھوٹی سی خبر تھی مگر زیلخا عرف نیلم کا تو کوئی کلیجہ ہی نکال کر لے گیا تھا۔

”چوہدری صاحب پتہ کریں یہ خبر سچی ہے کیا۔“ وہ بھاگتے ہوئے چوہدری انوار کے پاس آئی تھی، چوہدری انوار نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر خبر پڑھی تھی اور پھر بولے تھے۔

”خبر تو سچی لگتی ہے، مگر تم کیوں پریشان ہو رہی ہو، ایک ڈرائیور کے لئے نیلم کا اس طرح پریشان ہونا چوہدری انوار کی سمجھ سے باہر تھا۔“

”فلمسٹار روبی کا ڈرائیور اور ہاڈی گارڈ اپنے پنڈ کا تھا مراد علی، پتہ تو کریں مراد علی ہی ہے نا۔“ وہ چوہدری انوار کے ساتھ پڑے صوفے پر ڈھسے ہوئے تھے۔

”ابھی پتہ کرنا ہوں، تم پریشان مت ہو۔“ چوہدری انوار نے سمجھا تھا کہ اپنے گاؤں کے ایک بندے کے لئے وہ پریشان ہو رہی ہے اور بس، ان کا آپس میں کیا رشتہ تھا یہ تو اسے پتہ ہی نہ تھا۔

کچھ دیر وہ ادھر ادھر ٹیلی فون گھماتے رہے تھے، پھر نیلم کے پاس آ بیٹھے تھے۔

”مراد علی ہی تھا شمس آباد کا اور خبر بھی سچی ہے۔“ جوں جوں الفاظ چوہدری انوار کے لبوں سے ادا ہو رہے تھے تو اس نے زیلخا کا دل بیٹھتا جا رہا تھا۔

”نہیں ایسے نہیں ہو سکتا۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور پھر بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔

”میڈم روبی کے گھر چلو۔“ اس نے ڈرائیور سے کہا تھا، جب تک چوہدری انوار اس کے پیچھے باہر تک آئے تھے تب تک گاڑی فرارے بھرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔

”مراد! مراد!“ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی

تھی، مراد کی ڈیڈ ہاڈی ابھی ابھی ہاسپٹل سے لائی گئی تھی اور اب اسے شمس آباد پہنچانے کے انتظام ہو رہے تھے، روبی بھی حیران تھی، سب ملازم بھی اور چند ایک میڈیا والے بھی جو وہاں موجود تھے، نیلم اب کوئی عام سی ہستی نہ تھی جو کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا، وہ سب کی نگاہوں کا مرکز بن گئی تھی، جس طرح مراد علی کے مرنے پر وہ رو رہی تھی، چیخ رہی تھی سب حیران تھے کہ ان کا آخر آپس میں کیا تعلق ہے، لیکن شاید کسی کو یہ نہیں پتہ تھا کہ دو عام سے انسانوں کو جب محبت نے جکڑا تو ان کی عقل بھی سلب ہوئی اور دانائی بھی، مراد اس طوفانی محبت کو نہ سمجھ سکا اور روبی کا اسیر ہو گیا اور زیلخا محبت کی اس بے وفائی کو برداشت نہ کر سکی اور اپنا سب کچھ گنوا کر بھی انتقام پر اتر آئی، یہ جانے بغیر کہ ایک ہستی اوپر موجود ہے جو بنا بنایا کھیل بل بھر میں بگاڑ سکتی ہے اور انسان جب اس کو فراموش کر کے سمجھتا ہے کہ اس نے کوئی میدان مار لیا ہے اور منزل اب بس دو گام ہے تو وہ ہستی اپنا آپ دکھاتی ہے اور سب کچھ بگڑ جاتا ہے۔

شمس آباد کی زیلخا سب کچھ چھوڑ کر مراد کے بے جان وجود کے ساتھ ہی واپس آ گئی تھی اس نے اتنا کچھ جس کے لئے کیا تھا جب وہی نہ رہا تو اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگا نہ پیسہ نہ شہرت نہ خوبصورتی نہ حسن، جب محبت نہ رہی تو سمجھ کچھ نہ رہا۔

سن چرنے دی مٹھی مٹھی کوک  
ماہیا مینوں یاد آوندا  
میرے دل وچوں اٹھا دی اے ہوک  
ماہیا مینوں یاد آوندا  
ماہیا مینوں یاد آوندا

☆☆☆



## وہ ستارہ صبح امید کا

نوزیہ غزل

پچھلی قسط کا خلاصہ

ماریا کو فوراً ہسپتال پہنچایا جاتا ہے وہاں ایک مسلم ڈاکٹر نزہت حیدر اسے اپنا بلڈ ڈونیٹ کرتی ہے ہوش آنے پر ماریا کے دوست اور ڈاکٹر نزہت سمجھاتی ہیں کہ زندگی ضائع نہیں کرتے محبت و خلوص سے اور سلیقے، قرینے سے گزارتے ہیں۔

شہریار ایک بک شال پہ کھڑے وہاں حسن سے ٹکراتا ہے تو اس کی موجودہ زندگی اور فرسٹریشن پہ حوصلے کا درس دیتے ہوئے ایک مہینی میں ٹرائی کا مشورہ دیتا ہے۔

سعیدہ ایم بی اے میں پنجاب بورڈ میں ٹاپ کرتی ہے، تو سب خوش ہوتے ہیں۔ شہریار کے مشورہ پر وہاں متعلقہ مہینی پہنچا تو اس کی ہائی کوالیفیکیشن دیکھ کر پُرکشش سہولیات اور اچھی سیکری کے ساتھ اسے ٹرائی سیشن پر رکھ لیا گیا۔

محلہ کی عورتیں انزلہ پر الزام تراشی کرتی ہیں، تو وہ ان سے الجھ پڑتی ہے، محلہ کے مولوی صاحب کا پروفیسر بیٹا موقع پر پہنچ کر معاملہ رفع رفع کرواتا ہے اور اگلے دن انزلہ کے لئے رشتہ بھجوا دیتا ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

Scan & PDF  
FIAZ AHMED  
Friends Korner.com



یہ سب بہت خلاف توقع تھا سو غم سے سنبھلنا بھی مشکل تھا مگر زندگی صرف روتے روتے نہیں گزرتی کہ آخر کار بھوک کا ایندھن خالی پیٹ کو تڑپاتا ہے تو اپنے لئے نہ سہی اپنے سے وابستہ لوگوں کے لئے زندگی گزارنا پڑتی ہے، مگر زندگی کرے تو کیسے کرے؟ بہت دسوزی سے پیشانی مسکتے ہوئے سوچ رہی تھی جب وہاں صحن میں داخل ہوا تھا اس کے ہاتھ میں کافی بھاری شاپر تھے۔ ”دیکھ لو اچھی طرح سب سامان پورا ہے اگر کوئی چیز کم ہے تو ابھی بتا دو۔“ وہ برآمدے میں رکھے تخت پر سامان رکھتے ہوئے بولا۔

اریبہ اٹھ کر شاپر کھولتے ہوئے اس کے اندر موجود اشیاء کو دیکھنے لگی، بریڈ کے تین بڑے پیکٹ جام، چلی ساس، کچپ، قیمہ، گوشت، سلاڈ کا سامان بسکٹ، دودھ کے ڈبے بقیہ سودا سرف کم سے کم یہ بھی تمام سامان تقریباً تین چار ہزار کا تھا اور صرف دودن میں ہضم ہو جانا تھا، دونوں بڑی بہنیں اپنے بچوں سمیت (دینی سے) نوٹکی پہ پہنچی ہوئی تھیں اور انہیں بہنوں یا ماں کو سنبھالنے سے زیادہ اپنے بچوں اور شوہروں کے ناشتے کھانے کی فکر لاحق رہتی تھی، ہر چیز بہتر سے بہترین اور مہنگی ہو پھر وافر مقدار میں مکی ہوئی، اریبہ کا سیارادن بچن کی نذر ہو جاتا تھا صحن یا ہما میں سے کوئی ایک اکثر اس کی مدد کے خیال سے آجانی پر جو رقم ان شاہی اخراجات پہنچتی اس نے بہت جلد ان کا جمع جتھا ختم کر دیا تھا کہ ابو کی دکان تو اس دن سے تقریباً بندھی، شہباز کے ایگزامز سر پر تھے وہ پڑھائی سے توجہ ہٹا کر کیفے اینڈ نہ کر سکتا تھا اچھا خاصا مسئلہ بن چکا تھا ان کے لئے۔

”کیا سوچ رہی ہو کوئی چیز کم ہے یا خراب آگئی۔“ وہاں نے پوچھا۔  
”نہیں سب ٹھیک ہے بلکہ تم تو میرے اندازے سے زیادہ ہی سامان لے آئے ہو مگر۔۔۔۔۔“  
وہ بولتے بولتے رکی پھر یکدم سر جھٹک کر بولی۔  
”خیر اللہ مالک ہے تم بیٹھو میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔“

”نہیں اریبہ! مجھے بہت ضروری کام سے جانا ہے میں چلتا ہوں اور سنو کسی ایسی ویسی بات کو سوچ کر یا زندگی کی نگلی ترشی کو لے کر خود کو آزر دہ نہ کرنا اچھے برے دن زندگی کا حصہ ہیں، آج دکھ تو کل سکھ کوئی وقت خواہ کتنا تاریک ہو ہمیشہ نہیں رہتا۔“ وہ اس کی شرتی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا تھا۔

”ٹھیک کہتے ہو تم اور جوتار کی چھٹے ہی نہ تو یہ مٹی کا بت کیا کرے، کتنا صبر ہے جبکہ جبر کا موسم طویل تر ہوتا جائے۔“ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”استغفر اللہ، یہ کلمہ کفر ہے خدا اپنے بندوں پہ آزمائش ڈالتا ہے تو محض ان کے صبر برداشت اور ایمانی کیفیت کو جانچنے کے لئے اسے رضائے الہی سمجھ کر سہنا چاہیے نہ کہ جیل و حجت کر کے اپنی ایمانیت مشکوک کر لیں۔“ وہاں سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”مگر وہاں! تم خود سوچو پہلے تو ہم جانے کیسے گزارہ کر رہے ہیں اوپر سے یہ دونوں آیاؤں نے اپنی فیملیز سمیت جو ہفتہ برے ڈیرا ہمارا کھا ہے اور اس ہفتے میں دو مہینے کا راشن ٹھکانے لگا دیا جبکہ ہمارا تو اب کوئی ذریعہ آمدنی بھی نہیں ذرا بھی کھانے پینے میں کمی انہیں برداشت نہیں سوائے مشن، چکن، فیش کے وہ کھاتے نہیں ہم یہ سب آخر کیسے برداشت کریں، بجائے اس کے کہ اس مشکل وقت میں وہ ہماری کچھ امداد کریں خود ہم پہ بوجھ بن گئی ہیں۔“

”ہاں جی، اب تو ہم تمہیں بوجھ لگیں گے دو دن پکا کے کھلانا کیا پڑ گیا، وہ دن یاد نہیں جب یہیں سے فون کر کے ہزاروں کے گفٹ بہانے بہانے اینٹھا کرتی تھیں، ارے تم تو ایسی طوطا چشم ہوئیں کہ کیا سود سن رہے ہوتے ہوئے یہ مت بھولو کہ ابو کے مرجانے سے ہمارا حق ختم ہو گیا ہم اتنے ہی حصہ دار ہیں اس گھر کی ملکیت میں جتنی کہ تم۔“ شہناز آیا جو جانے کب سے اس کی گفتگو سن رہی تھیں نان اسٹاپ بولتی گئیں اور وہ ”ارے آیا“ ”نہیں آیا“ جیسے الفاظ منمناتی رہ گئی۔

”کیا ہو گیا ہے اتنا شور ڈالا ہوا ہے۔“ مہناز آیا بھی ناگوار لہجہ میں بولتی آگئی۔  
”شور عذاب کو غضب خدا کا ہم اپنے ماں باپ کے گھر میں اجنبی اور الٹے تلے ٹھہر گئے۔“  
”ہوا کیا ہے؟“ مہناز نے شہناز اور اریبہ کو دیکھا تھا اور شہناز نے سارا قصہ مرج مصلحہ لگا کے بیان کر دیا، اریبہ سن سے حواس اور بھیگی آنکھیں لئے بہت بے بسی کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی، جبکہ وہاں اچانک کری ایٹ ہونے والی پوزیشن پہ اپنی موجودگی اور اریبہ کی پوزیشن پہ بہت عجیب محسوس کر رہا تھا۔

”یقین کریں مہناز آپ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا جو شہناز آپا نے نکالا ہے نہ میں نے یہ الفاظ اس نیت سے کہے تھے۔“ اریبہ نے بولنے کی ہلکی سی کوشش کی۔  
”ارے رہتے دو تمہارے سب مطلب سمجھتی ہوں، ارے ہاتھ پکڑ کر دھکا دینے کی کوشش رہ گئی باقی سب تو کر دیا۔“ شہناز ہاتھ نچا کر بولیں۔

”آیا! اریبہ کا واقعی یہ مطلب نہیں تھا جو آپ نے اخذ کیا، وہ تو گھر کے اخراجات کی زیادتی اور معاشی تشدد کی تذکرہ کر رہی تھی کہ بریکل تذکرہ آپ کا ذکر آ گیا اور آپ نے اسے اپنے اوپر اٹیک سمجھ لیا۔“ وہاں نے اریبہ کی پوزیشن کلیئر کرنے کا خیال سے کہا۔

”تم اس کی ٹھنڈی پی بردہ نہ ڈالو وہاں، یہ میری بہن ہے میں جانتی ہوں اس میں اپنے علاوہ کسی اور کو برداشت کرنے کا کتنا حوصلہ ہے، جسے شروع سے تنہا کھانے، تنہا پانے کی طبع رہی ہو وہ سگے رشتوں کو بھی شیر نہیں کر سکتا، ہم تو جانے کیا سوچ کر آ گئیں تھیں مگر اب سب فضول ہے، مہناز تم سامان پیک کر دو میں خالد کو بھیج کر واپسی کے ٹکٹ او کے کرواتی ہوں۔“ مہناز حد درجہ سنجیدہ اور متاسف لہجے میں بولی تو اریبہ کو صبح معنوں میں اپنا وجود ٹھہرے میں محسوس ہوا اس کی آنکھیں دکھ اور بے بسی کے شدید ترین احساس کو پا کر چھٹک اٹھیں۔

”آیا! پلیز آپ مجھے معاف کر دیں میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، مگر پلیز ایسے ناراضگی میں مت جائیں۔“ وہ رو پڑی۔

”جب جانا ہی تھا تو ناراضگی، خوشی کیا؟ تمہاری بہت مہربانی تم نے جتنے دن سنبھالا، خرچہ کیا، ہم وہ سب ادا کر کے جائیں گے۔“ مہناز سر جھٹک کر آگے بڑھی اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی۔

”اریبہ! پلیز کول ڈاؤن، کچھ نہیں ہوگا، بی ایزی میں امی کو بھیجتا ہوں وہ آکر معاملہ ہینڈل کر لیں گی۔“ وہاں لہجہ بھر کو اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے تیز قدموں سے چلتا مڑا اور بیرونی دروازہ پار کر گیا، خالی کمرے میں اریبہ کی کھٹی کھٹی سسکیوں کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔  
اس کا سوچنا نہ تھا اب کے جو تنہا گزری



وہ قیامت ہی غنیمت تھی جو یکجا گزری  
میری تنہا سفری میرا مقدر تھی فرازا!  
ورنہ اس شہر تمنا سے تو دنیا گزری

☆☆☆

کافی کلر کا اسٹائلش سا سوٹ پہنے دونوں ٹائٹل اور پر کے آلتی پالتی مارنے کے انداز میں وہ  
فلور کشن کے سہارے صوفہ پہ بیٹھی تھی ہاتھ میں پراجیکٹ فائل تھی اور پاس چائے کا بڑا لگ رکھا تھا،  
جبکہ لاؤنج کے کارنر میں چلتے لی وی پہ کوئی نئی مغنیہ بڑے اچھے انداز میں غزل سراہی۔  
”بہت ریلیکس بیٹھی ہو آفس جانے کا ارادہ نہیں کیا؟“ شہریار کلائی پہ گھڑی باندھتے ہوئے  
لاؤنج میں داخل ہوئے۔

”جاؤں گی تو مگر تھوڑا لیٹ ان فیکٹ مجھے اپنے نئے بوتیک والے آئیڈیا پہ پاپا یہ کچھ اہم امور  
پہ بات کرنا ہے۔“ وہ چہرہ اوپر اٹھا کر بولی۔

”تم واقعی اس سلسلے میں سیریس ہو۔“ شہریار کچھ تحیر سے بولا۔

”بالکل بلکہ میں نے تو اپنے آفس اور کام کے لئے جگہ عملے کا سلیکشن بھی کر لیا ہے صرف  
افتتاح کیلئے ہے۔“ وہ کھلے بالوں کو ایک طرف سے کان کے پیچھے اڑتے ہوئے بولی۔  
”تم جتنی ہو کہ یہ کام بہتر طور پر کر لوگی تو شروع کرنا ورنہ یہ بزنس ہی بہت ہے تمہارے لئے  
اسی میں سروائیو کر لو۔“

”مجھے خود یہ اعتماد ہے اور میں صرف اسی کام کا ذمہ لیتی ہو جس کا یقین ہو کہ وہ پورا ہوگا۔“  
”Amazing۔“ شہریار بڑے محظوظ انداز میں ہنسا تھا۔

”آپ کا کیا مطلب ہے میں کچھ نہیں کر سکتی، میں آج کی لڑکی ہوں، مجھے ستر ہوئی  
اٹھارویں صدی کی مخلوق نہ سمجھیں۔“ وہ کچھ خفا سی بولی۔

”بائے داوے یہ آج کی لڑکی کیسی ہوتی ہے۔“ شہریار نے مسکراتی آنکھوں سے دیکھا۔

”وہ جسے آپ کپڑے دھونے ڈش واشنگ کوکنگ گھر کے جھاڑو پونچھے تک محدود سمجھتے ہیں، جو  
مرد کے لئے سچے سنور نے اس کے آنے پہ کھانا گرم کر کے دینے پاؤں دبانے تک اپنے دماغ اور  
ذہن کو محدود رکھے، اسے اٹھارویں صدی کی اور جو اپنے لئے آواز اٹھا سکے اپنے حقوق کو اعتماد و  
جرات سے حاصل کرے، آپ جیسے کنزرویٹو مردوں کو ہر فیلڈ میں مشکلات دے آج کی لڑکی کہتے  
ہیں۔“ وہ غصے سے بولی تھی اور شہریار ہنس دیا تھا۔

”آپ مجھے بیوقوف سمجھ رہے ہیں۔“ اس نے منہ پھلایا۔

”Keep my comments۔“ وہ چڑانے والے انداز میں ہنسا۔

”مجھے آپ سے یہی توقع ہے آگے بڑھتے ہوئے بھلا کیسے دیکھ سکتے ہیں مرد بھرے ناں اور  
مرد کب عورت کو کامیاب دیکھ سکتا ہے اونہہ ماما پاپا کے سامنے تو بڑے فریبردار بن رہے تھے، سب  
دیکھ لوں گا۔“ وہ روپائے لہجے میں بولتی آخری الفاظ منہ میں بڑبڑانے لگی۔

”اچھا ناراضگی چھوڑو یہ فائل دکھاؤ ذرا، میں دیکھوں تم نے ورک پیپر کیا پلاننگ کی ہے  
اپنے بجٹ لوکیشن کا کیا تخمینہ لگایا ہے۔“ وہ ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بڑے صراحت جو انداز میں بولا

تھا۔

”رہنے دیں مجھے جو سکس کرنا ہوا پاپا سے کر لوں گی ان کا ایکسپیرنس بھی زیادہ ہے آپ  
سے اور وہ مجھے اچھا مشورہ اچھی رائے ہی دیں گے۔“ شہریار بھرپور انداز میں مسکراتا تھا اس کی  
سنجیدگی و خشکی پر۔

”برا تو میں بھی تمہارا نہیں چاہوں گا سعید، اگر تم میرے خلوص پہ غور کرو۔“ وہ کچھ جتانے  
والے لب و لہجہ میں بولا۔

”آپ کی سنسیریٹی اپنی جگہ میں چھوٹی چھوٹی پرابلیمز سے پریشان ہونے والی لڑکی نہیں زندگی  
کو بڑی سمجھ بوجھ سے دیکھتی بھتی ہوں اور دھیان سے ہر لمحہ کو برتی ہوں، مجھے ہمدردی کی ضرورت  
کم ہی پڑتی ہے۔“ ست رنگی آنکھوں میں لالچلی کارنگ بھرے وہ خاصے بیگانہ انداز میں بولی۔

”اور بہت دفعہ تم جیسے خود کو عقل کل سمجھنے والے لوگ اپنے ہی پوائنٹ آف ویو سے بات کھا  
جاتے ہیں؟“ وہ لمحہ بھر کو اس کے چہرے پہ نرم نگاہ ڈالتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔

”شہریار Mind it اگر زندگی میں ایسا مقام آیا بھی تو میں آپ سے ہمدردی کی بھیک  
مانگتے ہرگز نہیں آؤں گی۔“ اس کے دو ٹوک انداز و الفاظ یہ شہریار نے لب بھینچے کچھ دیر بہت غور  
سے اس کا ملکونی چہرہ دیکھا تھا پھر گہرا سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا میں تمہارا واحد ہمدرد اور سچا دوست صرف میں ہوں۔“

”ضروری نہیں ہے کہ مقابل آپ کی سمجھ لے کر چلے۔“ سعید نے سر جھٹکا۔

”صد افسوس سعید خان تمہارے جیسی (باشعور) لڑکی کا زندگی کی حقیقتوں اور خوبصورتیوں  
سے امتزاج تمہارے شعور کی کم مائیگی کا اظہار کرتا ہے اور دنیا میں جینے کے لئے یہ عادت ٹھیک  
نہیں۔“

”میرے لئے کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط یہ میں آپ سے بہتر طور پر جانتی ہوں۔“

”غلط جانتی ہو اگر تم اپنے آپ کو جان جانتیں سعید تو خوابوں کے موسم کو آنکھوں سے  
بات کرنے دیتیں تمہیں پتا ہوتا یہ موسم روٹھ جائیں تو نیندیں بہت گہرے اضطراب کا شکار ہو جاتی  
ہیں۔“ شہریار کا ہاتھ اس کے شانے پہ تھا اور لبوں پہ مسکراہٹ، سعید خان نے بہت آہستگی سے  
نگاہوں کا رخ پھیرا تھا۔

”بکھی سوچا ہے تم نے زندگی کتنی قلیل ہے اور اس کے مختصر لمحوں میں تمہاری چاہ کا کشکول  
تھاے کوئی اپنے دل پہ کتنا صبر جمیل رہا ہے کتنی اضطرابیوں کو سہہ رہا ہے کوئی چیز دسترس میں نہ ہو تو  
نفسیاتی طور پر دل و دماغ کو سمجھانا صبر کرنا آسان ہوتا ہے لیکن جو چیز دسترس میں مکمل طور پر ہو مگر  
اختیار کے باوجود اس کے پانے میں دل بے اختیار ہو تو کیسی ٹوٹ پھوٹ اور شکستگی ہوتی ہے وجود  
کے اندر باہر۔“ شہریار نے اس کے بچ چہرے کو دھیرے سے چھو کر رخ اپنی سمت موڑا تھا اور وہ  
کسی قدر حیران ماؤف سے ذہن کے ساتھ دیکھتی رہ گئی۔

”محبت تو محبت کو بڑا حوصلہ دیتی ہے بڑے راستے سمجھاتی ہے مگر میرے حوصلے میرے راستے  
کہاں گم ہو رہے ہیں زندگی کے وہ لمحے جو صرف ہمارے ہوں خالص ہمارے حد توں شد توں سے  
پر وہ کیوں خفا ہیں، زندگی کا محبت کا یہ دلکش و دلفریب روپ مجھ سے کس لئے گریز پاپا ہے۔“ کتنی



محویت سے دیکھتے ہوئے وہ اس سے پوچھ رہا تھا سنجیہ خان نے خود کو بے حد بے بس محسوس کیا تھا اس لمحے، بہت مشکل سے اس نے حوصلہ کر کے شہریار کا ہاتھ اپنے شانے سے پرے کیا اور سرعت سے بنادیکھے پلٹتی سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

محبت بڑا فطری اور بے اختیار کردینے والا جذبہ ہے اس سے بے خبر رہنا یا انجان بنانا اتنا آسان نہیں، امید کا دیا دل میں روشن ہو جائے تو پتا چلتا ہے شاہتوں سے شاہتیں تلاشنا، لہجوں میں صدائے محبت کھوجنا اور کسی کے حسن سے بہت سے رنگ چرا کے اپنے لمحوں کو دلفریب، جیون کو دلکش بنانا یہ خواہش کتنا تڑپاتی ہے پھر محبت کو کھوجنا انسان اپنی ذات کی گمشدہ کڑیوں کو ملانے کی خواہش کو تکمیل دینے خود بخود طلب کی راہوں میں بھٹکتا ہے۔

☆☆☆

اپنے بھورے سونے کے تاروں جیسے چمکدار بالوں کو ہوا کی شدت سے بکھرتے پا کر اس نے ہیٹ کو سیدھا کر کے یوں سر پر رکھا کہ اس کے خوبصورت چہرے سے چھیڑ خانی کرنے والے اسکی بال اب صرف پیچھے کو اڑ رہے تھے، اپنے لائنگ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسانے اس نے کورٹنے پیلس میں قدم رکھ دیا، کورٹنے پیلس ٹائٹ لائف کا گڑھ ہے اپنی رد مائٹک، ہنگامہ خیز اور پر لطف لائف کی وجہ سے سیاحوں میں جانا جاتا ہے، یہ ایک مشہور سٹریٹ ہے جو کہ لی آراو سے لے کر وکٹوریہ تک جاتی ہے یہاں پر ویک اینڈز پر بہت رش ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ پورا شہر ہی یہاں اٹھ آیا ہے، ماریا کو یہ اس لئے بھی پسند تھا کہ یہاں کھانا پینا سستا تھا اور تقریباً چھ ڈالر (نیوزی لینڈ) میں مل جاتا تھا، سٹوڈنٹس ایسی چھوٹی موٹی بچتوں کا بہت خیال کرتے ہیں جبکہ وہ اکثر سکون کی تلاش میں نکلتی تو ایسے پر شور یا حول میں اپنے آپ کو گم کرنے کی کوشش کرتی۔

وہ کیفے کے اندر آگئی تھی بہت سے لوگ ڈریس کوڈ کی پرواہ کیے بغیر ننگے پیر آرہے تھے، ماریا نے اک گہرا سانس لے کر کیفے میں پھیلی ملائیشین فوڈز اور لبنانی کبابوں کی ریسی خوشبو کو محسوس کیا تھا، یہاں کی اک منفرد خصوصیت ایشیائی اور انگریزی وچائیز کھانوں کی ورائٹی تھی، ماریا نے اپنے پسندیدہ فوڈز کا آرڈر بک کروایا اور قدرے کارنر والی ٹیبل منتخب کر کے بیٹھ گئی، ویٹر نے حسب عادت پہلے بیئر پیش کی ماریا کے ناگوار انکار پر پھر سے کاندھے اچکاتے مطلوبہ آرڈر پیش کر دیا۔

نشو اٹھا کر اپنے آگے پھیلاتے ہوئے اس نے ذرا کی ذرا گلاس ونڈو سے باہر جھانکا تھا اور نگاہیں جیسے واپس آنے سے انکاری ہو گئیں، کچھ عیسائی راہبات (Nuns) کو لمبے چوٹے پہنے سامنے سے گزرتے دیکھنا ایک تکلیف دہ امر تھا اس کے لئے، کبھی وہ عیسائیت کی پیروکار تھی اور انہی (Nuns) کی طرح عبادت کرنے کی متمنی ہوتی تھی۔

اور پھر اللہ اور اس کی سچائی کی تلاش نے اس کے اندر عیسائیت سے متعلق سوالات، ابہام پیدا کرنے شروع کر دیے، گر جا گھر میں موجود بائبل کے مقدس اسباق دہراتے ہوئے بھی وہ بے سکون رہنے لگی اس کی حالت اس اجنبی سی ہو گئی جو انجانے شہر میں آپہنچا ہو اور وہ ٹھکانے کی تلاش میں بھی ایک چوک پر رکتا ہو بھی دوسرے پر، کیا بھی یہ تلاش کہ جس میں منزل بھی بہت قریب لگتی اور بھی بہت دور، سب مذاہب کھوکھلے رسوماتی اور روحانیت سے بہت دور لگے تھے، اس کی روحانی جستجو کے سفر میں اک گہرا اضطراب پیدا ہو چکا تھا اور یہ اضطراب بڑھتا تو سب چیخ پڑ جاتا ہنگامے، آسائش، لطف سب بے معنی لگتے، جیسے اس لمحہ لگے تھے کہ وہ اچانک سب چھوڑ کر بنا کچھ چکھے

مطلوبہ رقم خالی پلیٹ میں رکھتی کیفے سے باہر نکل آئی اور تیز قدموں سے چلنے لگی۔  
”سانس کا سفر آس کے سفر کا ساتھ دے گا کہ نہیں تلاش کسی لمحہ شہر آدر سے بازیاب ہو پائے گی یا نہیں۔“ وہ لمحہ کورک گئی۔

”جس شخص کو صداقت اور نیکی کا سفر کرنے کی خواہش ہو وہ جان لے کہ یہ سفر منظوری کا اعلان ہے جس کو منظور نہیں کیا جاتا اسے یہ شوق ہی نہیں ملتا۔“ کوئی اس کی سوچ کو پڑھ کر بولا تھا وہ یکدم مڑی اور جیسے ساکت رہ گئی۔

مائیکل تدرے بد لے رنگ و روپ میں اس کے سامنے تھا لیکن کچھ غور کیا تو وہ مائیکل نہ تھا بلکہ حد درجہ مشابہت رکھتا تھا اس سے۔

”یہاں تم سکون تلاش کر رہی ہو وہاں کچھ نہیں، سکون چاہتی ہو تو ”بدھا“ میں کھو جاؤ جو انسان کو چنی روحانیت کی آفاقی بلند یوں تک پہنچا دیتا ہے۔“ ماریا یکدم ٹھکی اور ایک بار پھر اپنے سامنے کھڑے بھکشو کو غور سے دیکھنے پر مجبور ہو گئی اور اس کے لبوں سے بہت آہستگی سے یہ الفاظ نکلے۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں سکون کی متلاشی ہوں؟“

”یہ مت پوچھو بس اپنے کام سے مطلب رکھو، نروان پالو گی تو روحانی کمال کی یہ معمولی

ماہ اگست کا شمار ”عید نمبر“ ہے جس میں ہم نے قارئین کی دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک سروے ترتیب دیا ہے، آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس سروے میں ضرور شرکت کریں، ہمیں دلی خوش ہوگی۔ شکریہ

سروے کے سوالات:

کہتے ہیں عید کارڈ جس کو روایت ہے اک زمانے کی

دستک ہے یہ ان کے ذہنوں پہ عادت ہے جن کو بھول جانے کی

۱۔ اپنے چاہنے والوں کو عید کی مبارکباد کیسے دیتے ہیں؟

۲۔ کیا زمانے کی تیز رفتاری نے عید کا روایتی و مذہبی جوش و خروش کم کر دیا ہے؟

۳۔ افطاری میں کیا چیز نہ ہو تو افطاری ادھوری لگتی ہے؟

۴۔ رمضان اور عید کی سب سے اچھی روایت کون سی لگتی ہے؟

۵۔ عید لینا اچھا لگتا ہے یا دینا، اس حوالہ سے کوئی خوشگوار یاد ہو تو؟

چاند کو دیکھ کر گر ہاتھ اٹھیں

مانگنا بھول نہ جانا ہمیں

۶۔ چاند دیکھ کر مانگی ہوئی کوئی دعا قبول ہوئی؟

ان سوالوں کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 20 اگست تک موصول ہو جائیں۔



بلندیاں بھی تمہیں اپنے سامنے بچ نظر آئیں گی۔“  
”مگر کیسے؟“ وہ کچھ ابھی۔

”یہ پڑھو تمہیں سب پتا چل جائے گا۔“ وہ شاید مشنری کا بندہ تھا کہ اس نے ماریا کو ایک پمفلٹ تھما دیا جس میں ”شوشو بدھ مت“ کے بارے میں کچھ لکھا تھا، وہ بدھ مت کے بارے میں بہت کم جانتی تھی مگر اتنا پتا تھا کہ یہ لوگ بیرون ملک مبلغ نہیں بھیجتے، تاہم اس نے وہ پمفلٹ رکھ لیا اور ذرا سا پیچھے ہٹ کر اپنے سامنے سے گزرتے سادھوؤں کی ٹولی دیکھنے لگی جو شاید جین فرتے (ہندو مذہب کی اک شاخ) کے لوگ تھے کہ مادر پدر آزاد بدن پر را کہ ملے سروں کو منڈوائے کسی انجان طرف کی جا رہے تھے، وہ محض وقت گزاری اور کچھ تجسس کے ہاتھوں مجبوران سینا سیوں کے پیچھے جانے لگی کافی چلنے کے بعد جس جگہ وہ لوگ پہنچے وہ ایک بڑا سا مندر تھا مگر اس مندر میں کسی دیوی دیوتا کا بت نہ تھا، ہاں مندر کے سب سے بڑے آستان یعنی ہال کمرے میں وسط میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر کچھ کتابیں تھیں جو شاید مہادیر کی پرانی کتابوں یا تعلیمات کے نسخے تھے، مہادیر جینی فرتے کا بانی تھا اس کی پیدائش بھارت کے صوبہ بہار کے شہر ویسالی میں چھ سو سال قبل مسیح میں ہوئی یہ مہاتما بدھ کا ہم عصر تھا اس کا نام وردھمن تھا مگر وہ مہادیر کے لقب سے مشہور ہوا، جینا سے اس وقت کہا گیا جب اس نے جنگوں میں گوتم بدھ کی طرح برس برس تپسیا کی بعد نروان حاصل کیا جینا سے مراد فلاح ہے یعنی جس نے ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق نروان یعنی بار بار آتما کے جنم لینے سے نجات حاصل کر لی ہو اور اپنے آپ پر فتح پالی ہو، جین مذہب کا آغاز صوبہ بہار کے ایک شہر سے ہوا مگر اس مذہب کو عروج بحرات کاٹھیاوار میں حاصل ہوا کانگرس کا ہندو لیڈر مہاتما گاندھی بھی اس جین مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔

ماریا ایک ستون کی اوٹ میں ہو کر ان سادھوؤں کے کام و عمل کا مشاہدہ کرنے لگی، حالانکہ یہ ایک رکی کام تھا مگر وہ تھل کے موڈ میں تھی، کچھ سادھو اپنے ننگے جسموں کو جگہ جگہ سونی سے سی کر دھاگے سے کنکر، بجری لٹکائے ہوئے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ اپنے آپ کو تکلیف پہنچا کر ہی انسان مکتی (نجات) حاصل کر سکتا ہے۔

ماریا آہستگی سے کھسکتی ہوئی آگے کو بڑھی یہاں تک سادھو اپنے ناک منہ گیلی مٹی سے پلستر کے سانس روکنے کی تپسیا کر رہے تھے، وہ بہت خیر، تجسس اور کچھ خوف کے تاثرات لئے یہ سب دیکھ کر واپس جانے کے لئے مڑنے لگی تھی کہ ایک سخت اور مضبوط ہاتھ بڑی سرعت سے برآمد ہوا اور اس کے منہ پہ تختی سے جم گیا جبکہ اس کی کمر بھی کسی فولادی شکنجے میں تھی، اس کا سارا تھل ہوا ہو گیا تھا ڈر، خوف اور سراسیمگی کی اک سرد ہراس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور حواس من ہونے لگے۔

☆☆☆

انزلہ کے ہاں خوشی کی خبر تھی ان کے گھر میں جو رنجیدگی اور سنجیدگی خالو اور معاذ کی ذمہ تھ کے بعد سے پیدا ہوئی تھی اس میں جیسے پتھر آمیز سکون و خوشی کی لہریں اٹھ کھڑی ہوئیں، انزلہ نے یہ خبر فون پر بڑے شرمائے لہجے میں بتائی تھی اور من نے سن کر پورے گھر میں نقارہ بجا دیا تھا۔  
”میرا دل پہلے کہہ رہا تھا کہ آج کچھ نہ کچھ اچھا سننے کو ملے گا۔“ ہما خوشی سے بولی۔

”دیکھ لو ہم کتنے پریشان رہا کرتے تھے اپنے گھریلو حالات نے بی مجبوری کی زندگی سے شاکہ اور انزلہ آئی تو باقاعدہ فرسٹریشن کا شکار رہنے لگی تھیں، پھر اللہ نواز نے یہ آیا تو صرف وہاں بھائی کی ملازمت کا بندوبست ہو گیا بلکہ انزلہ آئی بھی اپنے گھر کی ہو گئیں انہیں نہ صرف اپنے ہم سفر کا ساتھ ملا بلکہ سسرالی عزیز بھی مخلص اور ملنسار ملے اور اب اولاد کی امید یہ سب سے بڑھ کر خوشی والی بات ہے۔“ من، ہما کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”یقیناً اللہ بڑا مہربان ہے اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، وہ اپنے بندوں کو کبھی نہیں بھوتاتا بس یہ ہم گناہگار بندے ہیں جو دنیا داری کے دھندوں میں کھو کر اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے رب کو بھولا دیتے ہیں وہ پھر بھی دیتا ہے دیتا چلا جاتا ہے ابتدا دیتا ہے کہ جھولی کم پڑنے لگتی ہے، لینے والے ہاتھ ٹھکنے لگتے ہیں مگر اس کی رحمت بڑھتی جاتی ہے۔“ ہما اک جذب کی کیفیت میں بولی تھی۔

”آؤ امی کو بتاتے ہیں۔“ من خوش خوش بولتی ماں کے پاس آئی، وہ بڑی مضحل اور خاموش سی بیٹھی تھیں ایک تو من کے لئے تشویش انگار کے بعد دو چند ہو گئی تھی دوسرا بہن کی بیوگی، دینی توازن کی خرابی جو ان بھانجیوں کا دکھ یہ سب انہیں غدھال کیے دے رہا تھا۔  
”امی آپ کے لئے بڑی اچھی خبر لائی ہوں اتنی اچھی کہ ساری افسردگی اور اداسی منٹوں میں دور ہو جائے گی۔“ من چپکی۔

”اچھی خبر، کیا وہاں کی ترقی ہو گئی ہے؟“ وہ کچھ چوٹیں۔  
”ارے امی! آپ کی ترقی ہو گئی ہے ماشاء اللہ سے آپ نانی بننے والی ہیں اللہ تعالیٰ نے انزلہ آپ پر اپنی رحمت کی ہے وہ امید سے ہیں۔“ من ان کے دونوں شانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے خوشی سے بھرائی آواز میں بولی۔

”یا اللہ شکر ہے تیرا تو نے میرے دکھ بٹا دیے مجھے اولاد کی خوشیاں صحت و زندگی عطا کیں، یقیناً میں گناہگار اتنے کرم کے قابل نہ تھی یہ سب تیری عظمت و بزرگی کے انعام ہیں، بس ایک نوازش اور کر دے، میرے مولا میری ان تینوں بچیوں کو بھی اچھے براچھے گھرانے عطا کر دیے، مجھے ان کے فرائض سے صحیح وقت پر خوش اسلوبی سے نپٹنے کی ہمت دے دے بے شک تو ہی دعاؤں کا سننے والا ہے، میرا کبھی پہ کامل ایمان اور بھروسہ ہے یا لرحم الراحمین۔“ رشیدہ بیگم اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھیں۔

”امی! ہم انزلہ آئی کے ہاں چلیں گے ابھی۔“ آمنہ بولی۔  
”ضرور کیوں نہیں مگر تیرا بھائی آجائے پھر مٹھائی منگوا کر جائیں گے۔“ وہ جائے نماز تہہ کر کے اٹھیں۔

”ہما نمبر ملاؤ ذرا انزلہ کا میری بات کرواؤ۔“ اب وہ آکر برآمدے میں بیٹھ گئیں۔  
”جی امی! یہ لیس رنگ ٹون جا رہی ہے۔“ ہما نے موبائل ان کے کان سے لگایا۔  
”وعلیکم السلام بیٹے کیسے ہو، کام کیسا جا رہا ہے تمہارا۔“ راحیل کے سلام کے جواب میں وہ خوشدلی سے بولیں۔  
”شکر ہے آنٹی اللہ کا بڑا کرم ہے ابھی ہم آپ کو یاد کر رہے تھے۔“ وہ شائستگی سے بولے۔



”بس بیٹا محبتوں کا معاملہ ہے تم نے یاد کیا میں نے بات کر لی، یہ انزلہ کہاں ہے ذرا اس سے بات کرواؤ۔“

”جی وہ آپ کے فون پر شرما کے باہر بھاگی ہے میں بلاتا ہوں۔“ چند لمحوں بعد انزلہ کی بڑی شرمائی جھجکی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

”ارے میری لگی دھی، مان سے کیسی شرم، ماں بیٹی کا تو ایک پردہ ہوتا ہے، اللہ نے تجھ پر کرم کیا ہے میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات بھلا کیا ہوتی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ مجھے میری زندگی میں خوشی دی۔“ وہ کچھ لمحے سانس لینے کو رکھیں پھر بولیں۔

”بس اب تو راحیل سے کہہ دے کہ کام کرنے کو کچھ دن اپنی بہن کو بلوا لے میں مہینہ تجھے رکھوں گی لا کر خیر سے احتیاط کی ضرورت ہے پہلا موقع ہے ایس کوئی بھاری وزنی کام کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ ماؤں والے مخصوص تشویش زدہ انداز میں بولیں۔

”ارے امی! آپ فکر نہ کریں، مجھے یہاں بہت سہولت ہے راحیل نے میرے کہے بغیر جھاڑو پونچھے اور برتن دھونے کے لئے ماسی کا انتظام کر لیا ہے اور رہنے والی بات تو یہ آپ انہی سے کریں کیونکہ میں تو ان کی مرضی کی پابند ہوں۔“ انزلہ نے نرمی سے کہتے ہوئے موبائل راحیل کو پکڑا لیا۔

”دیکھو راحیل بیٹا میں انزلہ کی صحت اور کچھ احتیاط کے خیال سے اسے میکے رکھنے چاہتی ہوں، تمہیں پریشانی تو ہوگی مگر بیٹا ایسے موقعوں پر تھوڑا گزارہ کرنا پڑتا ہے۔“ وہ بڑے سہجاء سے بولیں۔

”آئی! آپ کا کہنا بجا مگر یہ سب مشکل ہے آپ کو معلوم ہے ہمارے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے گھر کا پورا انتظام ڈسٹرب ہو جائے گا کھانا پکانا کپڑے دھونے استری کرنے یہ سب محض نوکرانی نہیں کر سکتی۔“

”مگر بیٹا تمہاری بہن ہے کچھ دنوں کے لئے اسے بلواؤ۔“

”آئی اس کے اپنے چھوٹے بچے ہیں پھر سب اسکول جاتے ہیں اور آج کل تو ان کے ایگزامز چل رہے ہیں، وہ کیسے رہ سکتی ہے، آپ فکر نہ کریں انزلہ کو یہاں مکمل احتیاط اور سہولت حاصل ہے پریشانی والا کوئی مسئلہ نہیں ہے، آپ کی دعا سے انزلہ بہت آسان زندگی گزار رہی ہے۔“ راحیل شائستہ اور مہذب لہجے میں بولے۔

”اچھا بیٹا جیسے تمہاری خوشی، میں تو تم لوگوں کو خوش دیکھ کر خوش ہوں۔“

”آئی! انزلہ اور میں روز آپ سے ملنے آتے رہیں گے۔“

”جیتے رہو رب تمہیں ہر خوشی اور گھر گریستی کا سکھ دے آمین۔“

☆☆☆

جویریہ ٹریے میں ناشتے کے لوازمات سجائے امی کے سامنے بیٹھی تھی اور انہیں بعد اصرار چند نوالے کھلا پانی بھی کہ وہ یکدم ٹرے پر ہاتھ مار کے بولیں۔

”جاؤ پہلے اپنے ابو کو اٹھاؤ وہ ناشتہ کر لیں پھر انہیں جا کر کیفے بھی کھولنا ہے اور معاذ کو بھی بلاؤ وہ تو بھوک برداشت نہیں کرتا تھا اب اتنا دن چڑھ گیا ہے، کالج بھی جانا ہوگا اسے۔“

”امی ابو اور معاذ دونوں ناشتہ کر کے چلے گئے آپ کر لیں۔“ جویریہ نے آنسو پیتے ہوئے ابھی بکھری ماں کو دیکھا۔

”نہیں تم جھوٹ بولتی ہو، وہ تو میرے ہاتھ کی چائے پیئے بغیر کبھی نہیں جاتے اور معاذ اٹھتے ہی سب سے پہلے مجھے سلام کرتا ہے، میری دعا لیتا ہے پھر کالج جاتا ہے۔“ وہ غائب الدماغی کے عالم میں بولیں۔

”امی! اب وہ سلام و دعا کی منزل سے گزر چکا ہے اب اسے ناشتے کی نہیں مغفرت کی ضرورت ہے دعا کریں اس کے لئے۔“ اریبہ گھٹنے ٹیک کر ان کے سامنے بیٹھی۔

”امی! آپ اس بات کو مان لیں ابو اور معاذ اب اس دنیا میں نہیں رہے وہ مر چکے ہیں (اریبہ نے سسکی لی) بہت دن ہوئے انہیں اس دنیا کو چھوڑے، اب ان کا ہر رابطہ ٹوٹ چکا ہے، وہ صرف اپنے رب سے ملتے ہیں ہم سے نہیں، کیونکہ مردہ لوگ کبھی زندوں سے رابطے نہیں کیا کرتے؟“

”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ یکدم خوف سے زرد پڑیں پھر یکایک ان پہ ہسٹریائی کیفیت طاری ہونے لگی۔

”بکتی ہو تم، دشمن ہو میرے شوہر اور میرے بچے کی، چلی جاؤ دفع ہو جاؤ میرے گھر سے، میں تمہیں جان سے مار دوں گی جاؤ چلی جاؤ۔“ انہوں نے ایک زوردار دھکا دے کر اریبہ کو پرے گرایا تھا اور اب ناشتے کے برتن اٹھا کر پھینک رہی تھیں۔

”نہیں مر سکتا میرا معاذ اسے تو بڑا آفسر بننا تھا وہ ضرور بڑا آفسر بنے گا، دیکھو اسے دھکے دے کر نکال دو، یہ میری دشمن ہے۔“ وہ بے ہنگم لہجے میں واویل کرتے ہوئے گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں، جویریہ اور ربیعہ خوفزدہ سی بھاگ کر اندر کمرے میں چھپ گئی تھیں، اریبہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے ہوئے کراہ رہی تھی کہ شہباز بہت گھبرایا ہوا اور پریشان سا صحن میں داخل ہوا تھا۔

”آئی! اریبہ آئی کیا ہوا؟“ وہ پریشانی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔

”میرا سر! بہت سختی سے ٹکرایا ہے، مم..... مجھے درد.....“ اریبہ نے لمحہ بھر کو آنکھیں کھول کر اپنے سامنے بیٹھے ماں جائے کو دیکھا، پھر اذیت سے روتے ہوئے دوبارہ سر کو تھام لیا۔

”مار دو، اسے مار دو یہ میری دشمن ہے اس نے میرے معاذ کو اور تمہارے ابو کو مار دیا ہے، اسے بھی مار دو، ختم کر دو سر پھاڑ دو اس کا۔“ ہوش و حواس سے بیگانہ نجمہ ایک بار پھر اریبہ پہ حملہ آور ہونے لگی کہ شہباز نے بہت ہمت سے انہیں سنہال کر کمرے میں لانے کے بعد جویریہ سے دو گولیاں اور پانی لانے کو کہا تھا، ان کی ایسی ہسٹریائی کیفیت میں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وہ دو گولیاں سکون آور دے دیتے تھے۔

دوا کھلانے کے کچھ دیر بعد وہ نیند میں چلی گئیں تو انہیں اریبہ کا خیال آیا وہ دوبارہ بھاگتے ہوئے اریبہ کے پاس گئے۔

”اریبہ آئی! اریبہ آئی! انہیں پانی پییں، ریا آئی۔“ جویریہ نے بے ہوش پڑی اریبہ کو ہلایا مگر اس نے بس سے بس نہ کی تو وہ اور ربیعہ گھبراہٹ اور پریشانی سے رو پڑیں۔



”مائی گاڈ ان کے تو سر سے اتنا خون بہہ رہا ہے، تم لوگ ذرا خالہ کو بالو میں انہیں لے کر ہسپتال جانا ہوں وہاں بھائی کے ساتھ۔“ شہباز تیزی سے بولا تھا اور ربیعہ رشیدہ خالہ کو فون کرنے لگی۔

”چوٹ سے زیادہ کسی تکلیف دہ بات نے ان کے ذہنی سسٹم کو بری طرح متاثر کیا ہے، شدید پریشانی اور ٹینشن سے یہ حالات ہوئی ہے، شکر کریں نروس بریک ڈاؤن نہیں ہوا، آپ بروقت لے آئے زیادہ خون بہنے سے بچت ہو گئی، بینڈج کر دی ہے زخم کی تاہم ہوش چند گھنٹوں تک آئے گا، اس کے بعد ہی آپ مریضہ کو گھر لے جاسکتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے مکمل چیک اپ اور میڈیکل ٹریٹمنٹ کے بعد کہا تھا، وہاں اور شہباز ڈاکٹر کی بات یہ ایک دوسرے کو دیکھ کر گہرا سانس لے کر رہ گئے۔

”خالہ کی یہ حالت اور کیفیت ایک بہت بڑا مسئلہ ہے یہ تو شکر ہے کہ تم جلد گھر پہنچ گئے، ورنہ وہ اریبہ کو اور زخمی کر سکتی تھیں، ان کے برائے علاج کی ضرورت ہے، یوں سکون آور ادویات کھلانا کب تک مسئلہ کا حل بنے گا۔“ وہاں ہسپتال کے کارڈور میں آ کے بولا تھا۔

”تمہارے پدرانہ جذبات اپنی جگہ قابل قدر ہیں مگر شہباز میرے بھائی ان کے یہ پاگل پن کے دورے مزید خطرناک ہو سکتے ہیں آج انہوں نے اریبہ کو مارنے کی کوشش کی ہے کل وہ اسے حقیقتاً مار سکتی ہیں۔“ وہاں نے پر زور انداز میں باور کرایا۔

”وہاں بھائی! وہ پاگل نہیں بس ان کے ذہن پر غم کا اثر غلط پڑ گیا ہے۔“ شہباز رندھے لہجے میں بولا، ماں کو پاگل ماننے کو اس کا ذہن تیار نہ تھا۔

”تم اپنے الفاظ میں کچھ کہہ لو مگر یہ پاگل پن کی ایک کیفیت ہے اور ان کے ذہنی ابتری کا علاج کروا کے بھی تم ایک نیکی کرو گے، اپنے گھر کے افراد کو آنے والے تھن اور مشکل حالات سے بچانے کے لئے تم لوگوں کو یہ فیصلہ کرنا ہو گا۔“ وہاں نے سنجیدہ الفاظ دلچسپی میں سمجھایا تو شہباز خاموش پرسوج تاثرات کے ساتھ غم آنکھیں لئے شیشے کے پارلیٹی ریا کو دیکھنے لگا۔

”زندگی سے بڑا امتحان بھلا کیا ہو سکتا ہے، زندگی گنتا امتحان لیتی ہے کچھ لوگوں کو اپنے معیارات و سوالات اور آزمائشوں کی کسوٹی پر کتنا زیادہ آزمائی ہے، بار بار آزمائی ہے، کہ حوصلے ہارنے لگتے ہیں، غیر متوقع طور پر ملنے والا دکھ بعض اوقات انسان کو وقت سے پہلے بڑا بنا دیتا ہے دکھ چھوٹا ہو یا بڑا آنکھوں میں آنسو ضرور اتا رہتا ہے، بل بھر کو سانس ٹھہراتی ہیں اور حواس منجمد ہو جاتے ہیں پھر، پھر درد کا ایک لامتناہی سلسلہ جو روکے نہیں رکتا، برداشت ٹوٹنے لگتی ہے خواب روٹھ جاتے ہیں خواہشیں کھوجانی ہیں مگر اذیت ختم نہیں ہوتی، اذیت سہنے والا وجود ختم ہو جاتا ہے۔“

کچھ ٹوٹے خواب، کچھ آنکھوں کے عذاب کچھ درد زندگی میں، کچھ جھین سانسوں میں کچھ زہر لہجے میں، کچھ آگ سا بانسوں میں کچھ تڑپتے سسکتے لمحات

کچھ نامساعد تبدیلیاں، کچھ ناگزیر حالات کچھ کرب آہوں کے، کچھ ناسور یادوں کے کچھ تپتے ہوئے گوشے ماضی کے حال کے مستقبل کے بھی

کچھ معاملے باقی حفا کے وفا کے دل کے بھی پروں کو پکڑتی زمین کہیں نظر سے چلتی روح کہیں

کچھ اذیت سوچوں میں، کچھ زخم ہاتھوں میں کچھ کڑھنا دن بھر، کچھ جلنا راتوں میں کچھ سلسلے تنہائی کے جو ختم نہیں ہوتے کچھ فاصلے درد کے جو کم نہیں ہوتے کیا تھے ہم؟ کیا بنا دیا ہم کو؟ زندگی بتا تو نے بھلا کیا دیا ہم کو؟

☆☆☆

”پرنس بوتیک“ کے نام سے اس نے اپنی بوتیک کا افتتاح شائستہ بیگم سے کروایا تھا، عفنان علی خان کے ساتھ شہریار، صبا اور ہانی کلاس کی کیوٹی کے بہت سے نامور اور امیر و کبیر لوگ خصوصاً ماڈرن سوسائٹی کی بیگمات یہاں کثیر تعداد میں تھے، بوتیک کی ظاہری عمارت، وسعت اور خوبصورتی کے ساتھ جدید ترین مشینری اور سٹائلش ڈریسز کی ورائٹی یہ سب دیکھنے والوں کے لئے متاثر کن تھا۔

بوتیک کے آفس روم کی بیک سائڈ پر بڑے سے خوبصورت ہال کمرے میں خصوصی انتظام تھا سلاکی اور کٹنگ کی باقاعدہ کلاسز کا پھر کڑھائی اور چھپائی کے لئے الگ سے ایک حصہ مخصوص تھا، تیار ہونے کے بعد سارا مال سلیکشن روم میں جمع ہونے کے بعد حسب ضرورت بوتیک پر سج جاتا۔

”تم تو واقعی خاصی ایفی شیٹ، نکلیں بہت زبردست بھئی، میں تو تمہیں خاصی ڈل سمجھتا تھا ان بزنس آئیڈیاز میں۔“ شہریار رشک سے بولا۔

”ڈل آپ نے کس معنی میں استعمال کیا؟“ سعید نے بھنویں اچکائیں۔

”عورتیں اتنا ہائی مینٹرل لیول نہیں رکھتیں بزنس ورلڈ میں ان ہونے کے گرسرف مردوں کو آتے ہیں۔“

”بہت ریسرچ کی ہوئی ہے عورتوں کے بارے میں بائے داوے اور کیا جانتے ہیں عورتوں کے متعلق۔“ صبا نے آکر گفتگو میں حصہ لیا۔

”یہی کہ بہت خود سر ہوتی ہیں نہ خود سکون سے رہتی ہیں نہ دوسروں کو رہنے دیتی ہیں، اپنی خوشی کو بھی بیگانہ سمجھ کر سر جھٹک کے گزر جاتی ہیں اور دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر بہت خوشی محسوس کرتی ہیں۔“ شہریار نے کہا تو وہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی جبکہ صبا نے بڑے محظوظ انداز میں اسے ہلکی مسکراہٹ لئے دیکھا تھا پھر بولی۔

”آپ کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے، ظاہری شخصیت سے کبھی کسی کی باطنی کیفیت کا درست اندازہ نہیں ہو سکتا ہے۔“

”انہوں سے کسی دہریت مگر کوئی اپنا سمجھے تب ہے ناں۔“ وہ بڑبڑایا۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں محبت کا احساس کسی کو بیگانہ یا اجنبی کر سکتا ہے، نہیں شہریار بھائی چاہے



جانے کا بے پایاں احساس اگلے بندے کو مغرور یا احساس برتری ضرور دیتا ہے اور وہ کچھ دیر (میں کسی کے لئے اہم ہوں) کا نشہ سمیٹتا ہے نظر انداز ضرور کرتا ہے مگر تکلیف دینا یہ نہیں کرتا، محبت تو صرف محبت سے جیتی ہے کبھی زخم بھی میچا جتے ہیں۔“ صبا نے دوستی کے ناٹے سنعیہ کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

”تو محبت زخم دیتی کیوں ہے، زندگی کے شفاف راستوں پر آنسوؤں کی دھند کیوں نہ جمانے لگتی ہے؟“

”شہریار بھائی! اتنا گاڑھا فلسفہ پلیز یہ سب کو چھوٹے نازک سے دماغ کے اوپر سے گزر گیا۔“ صبا نے کہا۔

”اچھا تو تمہیں آسان لفظوں میں بتانا ہوں پھر کہنا دماغ نے سمجھا کہ نہیں۔“

بھر کی دھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

رستہ دیکھنے والی آنکھوں کے انہونے گلاب

پیاس میں بھی دریاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں کچھ کر نہیں پاتے

پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

رنگ سے خوشبوؤں کا نانا ٹوٹتا جاتا ہے

پھول سے لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ایک ایک لفظ دل سے ادا کر رہا تھا اور اس کی خفگی سے بھرپور آنکھوں کے کنارے خواخوہ نم ہو رہے تھے۔

”بہت خوبصورت انداز ہے شاعری کا بھی اتنا لطف نہیں جتنا آج اس وقت آیا ہے، بہت خوش قسمت ہے وہ لڑکی جس کو آپ چاہ رہے ہیں۔“ صبا یکدم بولی۔

”اور اسے اپنی خوش قسمتی کا یقین نہیں شاید۔“ اب وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا اور وہ جیسے غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

”آپ کیا جانیں محبت کیا چیز ہوتی ہے جو ہر چیز کو صرف احساس ضرورت سے جانچتے اور رکھتے ہیں کبھی محبت کو پر نہیں تو پتا چلے کہ اس معاملے میں آپ صفر بیٹا صفر ہیں، سنا آپ نے، آپ کو تو محبت کے درست سچے تک معلوم نہیں پہلے خود کو درست کر لیں پھر اوروں کو سبق پڑھائیں۔“

وہ پیر پختے ہوئے مڑی تھی اور اگلے چند لمحوں میں گاڑی نکالتی باہر سڑک پہ لے آئی اور ڈرائیو کرتے ہوئے سلگتے دماغ سے سوچا تھا۔

”سب مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، میری زندگی ہے یہ مجھے اپنی مرضی سے گزارنے کیوں نہیں دیتے، اپنے خیالات، جذبات اور فیصلے مجھ پہ ٹھونسنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں آخر کیوں؟“ آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے تھے اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روکتے ہوئے سرسیت کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔

☆☆☆

درد، تکلیف اور چھین کی شدید لہروں نے اس کے خوابیدہ احساسات کو بیدار کر کے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا اور آنکھیں کھولتے ہی ایک خوفناک احساس نے اس کو مفلوج کر دیا، وہ بہت مضبوط اور موٹے رے کے ساتھ باندھی ہوئی تھی، کمر کی تختہ نمائش سے باندھ دی گئی تھی اور پاؤں پلر کے ساتھ بندھے تھے جبکہ ہاتھ پشت پہ لے جا کر کس دیئے گئے تھے، منہ بہ سفید پٹی نما شپ چپکی تھی، وہ اس قدر سختی سے بندھی ہوئی تھی کہ اک معمولی سی حرکت بھی اس کے لئے ممکن نہ تھی اس نے بہت زور لگا کے کوشش کی تھی کہ رسیوں کو ذرا ڈھیلا کر سکے مگر یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی، اس نے آنکھوں کو پوری طرح کھول کے اپنے ارد گرد کا جائزہ لینا چاہا نیم ملگجے اندھیرے میں عجب بے ڈھب سی دیوار والے کمرے میں وہ قید تھی یہاں کوئی روشن دان تھا نہ درز شاید وہ تہہ خانہ تھا اور اس تہہ خانے میں اس کے ساتھ کیا ہونا تھا، کیا ہو سکتا تھا یہ احساس اتنا بھیاں تک تھا کہ وہ لرز اٹھی یہ سوچ کر، موت اپنے فولادی پنچہ میں اسے دبوچنے کو ایک بار پھر تیار کھڑی تھی اور یہاں اس دیرانے میں اس کی مدد کرنے یا بچانے والا بھی کوئی نہ تھا۔

اس نے زندگی میں کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تھا بلکہ حتی الامکان وہ دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتی تھی اسے اچھی طرح یاد تھا اپنی بیس سالہ زندگی میں اس نے کسی کا دل نہیں دکھایا تھا کسی کو بھی گالی نہیں دی تھی، کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کی تھی، کبھی ڈریک کی نہ ٹامپٹ کلب گئی، سوائے ایک غلطی کے کہ وہ کئی سال سے بے عقیدہ، بے مذہب زندگی گزارتی آرہی تھی، مگر یہ کوئی ایسا بڑا گناہ نہ تھا جس کی سزا ایسی بھیاں تک صورتحال سے وابستگی کی شکل میں ملتی زندگی میں بہت کچھ اچھا کرنے کے باوجود اس کے ساتھ عرصے سے برا ہوتا چلا آ رہا تھا اور یہ سب کیوں تھا؟

وہ اپنے ماؤف ذہن کے ساتھ موجود صورتحال کے ادراک و اسباب پہ کوئی بہتر نکتہ تلاشنے میں یکسر ناکام ہو رہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر ہلنے جلنے کی کوشش کی تھی تاکہ رسی ڈھیلی ہو سکے اور وہ کسی طریقے سے اسے کھول کر اس مصیبت سے نجات حاصل کر سکے مگر یہ حرکت اسے خاصی ہنگامی کیونکہ درد کی تیز لہریں اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئیں، رات گہری ہو گئی تھی، تاریکی کے خوف کے ساتھ، سردی نے کپکپاہٹ پیدا کر دی تھی اس کا جسم کانپتے ہوئے خوف کے اذیت ناک احساس میں گرفتار تھا۔

آبادی سے قدرے ہٹ کر ویران، سنان اور اس صحرائی جگہ پہ کسی معجزے کا انتظار کرنا یا مدد کی امید رکھنا یہ دیوانے کا خواب تھا، یوں یوں وقت گزر رہا تھا اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی اسے کوئی ذی روح ہوش میں آنے سے لے کر اب تک نظر نہ آیا تھا، وہ سب سادھو اس ویران جگہ پہ باندھ کر جانے کہاں غائب تھے، اس اندھیری رات میں اپنی بے بسی اور اس تکلیف دہ صورتحال نے اس کے حواس کو مکمل طور پر خوف کے حوالے کر دیا تھا سختی سے بندھی ڈوری کی اذیت نے الگ درد سے دو چار کر رکھا تھا، مگر اس نے درد کی پروا کیے بغیر ایک بار پھر سے بھرپور جدوجہد کی، رسیوں کو توڑنے یا ڈھیلا کرنے کی مگر اس کوشش نے اسے جیسے دردناک عذاب سے دو چار کر دیا تھا، ایک دم سے بڑے بڑے آنسو اس کی نیلگوں آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔

”مم..... میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا، کسی کو دکھ نہیں دیا کسی کے لئے پریشانی پیدا نہیں

میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا، کسی کو دکھ نہیں دیا کسی کے لئے پریشانی پیدا نہیں

میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا، کسی کو دکھ نہیں دیا کسی کے لئے پریشانی پیدا نہیں

میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا، کسی کو دکھ نہیں دیا کسی کے لئے پریشانی پیدا نہیں

میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا، کسی کو دکھ نہیں دیا کسی کے لئے پریشانی پیدا نہیں

میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا، کسی کو دکھ نہیں دیا کسی کے لئے پریشانی پیدا نہیں

میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا، کسی کو دکھ نہیں دیا کسی کے لئے پریشانی پیدا نہیں

میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا، کسی کو دکھ نہیں دیا کسی کے لئے پریشانی پیدا نہیں

میں نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا، کسی کو دکھ نہیں دیا کسی کے لئے پریشانی پیدا نہیں



کی، میں کبھی شراب، فحاشی کے نزدیک تک نہیں گئی، میں نے کبھی کبھی کو دھوکا نہیں دیا پھر یہ سب اس طرح سے اور میرے ہی ساتھ کیوں ہوا، میری زندگی تو پہلے آسان نہ تھی مجھ پہ اس طرح کی مشکل تو نے کیوں ڈالی، اے خدا! اگر تو ہے تو مجھے اس اذیت سے نجات دلا، مجھے بچالے، میری مدد کر۔“ خوف بے بسی اور اذیت سے سکتے ہوئے اس نے اپنے لئے مدد مانگی تھی، اسے لگ رہا تھا اگر وہ کچھ دیر اور اسی عالم اسی حالت میں رہی تو اس کے اعصاب مفلوج ہو جائیں گے یا وہ مرجائے گی اور اس طرح کی بے بسی کی موت ایسا بھیانک یہ سب سوچ کر ہی اس کا دل بند ہو رہا تھا۔

بھوک، پیاس، بے بسی اور اذیت اور دہشت میں لپٹی موت، اس کے خوبصورت سڈول اور شفاف جسم پر زخموں کے نشان، اسے اپنے ارد گرد مانتی، سوگوار ہوئے ناپتے دکھائی دینے لگے، اس کی آنسو بھری آنکھیں وحشت زدہ ہو کر گہرے اندھیرے میں کوئی موہوم امید، کوئی پردہ کا نشان تلاش کرنے لگیں اور کتنی دیر اسی سکتے میں رہنے کے بعد وہ پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اسے موت بالکل سامنے نظر آرہی تھی، درد خنکی کی کینگی میں سن وہ جانے کب سے یہاں قید تھی کتنے دن، کتنے گھنٹے کتنا عرصہ گزر چکا تھا وہ لاعلم تھی، اسے اپنے ماں باپ یاد آ رہے تھے، جو ذرا سی بات پر تمام رابطے توڑ چکے تھے تمام فریڈز جو اختلاف رائے رکھنے کے باوجود اس کی دوستی و ہمدردی کے خواہاں تھے، وہ سب راستے جن پہ بچپن سے لے کر جوانی تک وہ گزری، اپنے پسندیدہ مقامات، اچھے ریسٹورنٹس اپنی ذاتی چیزیں ان سب سے کچھ دیر بعد اس کا رابطہ کٹنے والا تھا اور وہ موت کی اذیت تک گہری کھائی عبور کرنے والی تھی، اس موت سے پہلے کی تکلیف کا عالم کتنا شدید تھا، یہ اس کے سوا کون جان سکتا تھا، جو غیر ہوتی حالت کے ساتھ ذہنی و جسمانی اذیت کا شکار تھی، جس کی زندگی کے جنونی لمحات اسے دم آخر تک لے آئے تھے اور اس کے دامن میں زندگی بخشوانے کو کوئی نیکی تھی نہ امید، کوئی آس کا جگنو تھا نہ مدد کا اشارہ۔

”میں اس بے بسی کی موت کو قبول نہیں کرتی، مجھے موت نہیں زندگی چاہیے روشنی چاہیے اپنی ذات کا عرفان اس کائنات کے محدود مرکز کا ادراک چاہیے میں نے تو بڑے خلوص سے یہ سب مانگا تھا تلاش حق کی تھی، میری کوشش ایسے عبرتناک انجام سے دو چار نہ کر۔“ اپنے مفلوج زدہ احساسات کے ساتھ اس نے ایک بار پھر ذات حق کو پکارا تھا۔

☆☆☆

”کیا ہوا ار یہ کوہوش آیا کہ نہیں، بھی پتا ہے تم لوگوں کو ماں باگل ہے تو کیوں سنبھال کر رکھا ہوا ہے، باگل جانے داخل کروادو یا زنجیر وغیرہ ڈال کے رکھو، آج کل تو اچھی بھلی لڑکیوں کو رشتے نہیں ملتے کوئی نقص پڑ گیا تو کون پوچھے گا، جوان جہان لڑکی کو منٹوں میں زخمی کر کے ہسپتال پہنچا دیا، کہ جو یہ سے پتا چلا ار یہ ادھر ہے، صبح سے کہاں ہے، وہ کی حالت ہے؟“

یہ زائدہ پھپھوئیں جوانان شاہپ بولتی ہسپتال کے وارڈ میں داخل ہوئی تھیں اور شہباز، راشدہ خاتون انہیں ایک طرف بٹھاتے ہوئے بولے۔

”ابھی پوری طرح ہوش نہیں آیا، ذرا سی دیر کو آنکھیں کھولی تھیں۔“

”پرائیویٹ ہسپتال ہے بل بھی خاصا بنے گا، سرکاری میں لے جاتے تم لوگ، بندے کو کھینچ

تان کے گزارہ کرنا چاہیے، بھی میرے بھائی نے تو کروڑوں کے حساب سے کمایا اور تمہاری بہن نے بس خرچے میں ہی لٹایا، ذرا جو اس عورت نے پیسہ سنبھال کر سوچ سمجھ کر برتا ہو۔“ پھپھو کو بولنے اور پھر اس نکالنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔

”زائدہ میری بہن نے ہمیشہ اپنے گھر اور بچوں پہ خرچ کیا ہے وہ کون سا لوگوں کو دیتی تھیں اپنے رشتے پورے کرنے کو مشکل ہوتی ہے آمدن، کون ایسے لٹاتا ہے۔“ رشیدہ بہن کی حمایت میں بولی۔

”ارے رہنے دو، مجھے سب پتا ہے، اپنے رشتے ارے بھائیوں کے لئے بہنوں سے بڑھ کر اور بیٹیوں کے لئے میکے سے بڑھ کر کیا ہوتا ہے، مگر ہمارے اماں باوا کی آنکھیں بند ہوئیں تو میکے ختم، نام کی رشتہ داری رہ گئی اور بھی عید آئی نہ شب رات یہاں مفت خوروں کے خرچے نکلتے رہے، غریب غرباء پلتے رہے۔“ وہ کٹیلے لہجے میں چپا چپا کر بولی تھیں۔

”مطلب کیا ہے آپ کا یہ سب ہمیں کیوں سنا رہی ہیں۔“ رشیدہ کو غصہ سا آ گیا۔

”مطلب وہی ہے ہے بی بی ہو جو تم سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہ رہیں۔“ وہ تیوری چڑھا کر بولیں۔

”دیکھیں میں بہت لحاظ کر رہی ہوں آپ کا۔“ رشیدہ کو غصہ آیا۔

”ارے جاؤ لحاظ مروت میں تو ہم مارے گئے بھی منہ سے کچھ نہ کہا اور سب دیکھتے رہے کلیجہ سڑتا رہا مگر بھائی سے نہ کہا ورنہ کیا ہم نہ جانتے تھے کہ نجمہ بھابھی بس تم لوگوں کے الٹے تلے پورے کرتی تھیں، ارے پہلے زندہ بھائی کو کھاتی رہے، اب مردہ کی باقیات کھانے آرہی ہو، ہاں جھٹی ٹھیک بھی ہے حرام منہ کو لگ جائے تو حلال کون دیکھتا ہے مال مفت دل بے رحم۔“

”اشاپ اٹ پھپھو جان میرا خیال ہے آپ عیادت کا حق پورا کر چکی ہیں اس لئے آپ جا سکتی ہیں۔“ ان کی نان شاہپ آواز کو شہباز کے سنجیدہ لب و لہجہ نے بریک لگائی تھی۔

”تم تمہاری یہ جرات۔“ مارے غصے کے ان کے نتھنے پھولنے لگے۔

”یہاں آپ کا تماشہ لگانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے آپ کو تو کچھ احساس نہیں مگر ہمیں اپنی خود داری بہت عزیز ہے اور براہ کرم آئندہ کسی ارادہ سے آنا ہو تو مت آئے گا۔“ وہ بہت بے لحاظ ہو گیا زائدہ پھپھو دانت پیستیں اندر آتے وہاج کو بگڑے تیوروں سے دیکھتی نکل گئیں۔

”انہیں کیا ہوا سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔“ وہاج نے استعجاب آمیز لہجہ میں کہا تو رشیدہ بیگم نے اپنے تاثرات چھپانے کو یکدم رخ موڑا تھا اور شہباز نے آنکھیں کھولتی ار یہ کی جانب اس کی توجہ کر دادی تھی۔

”ریبا کیسی ہو تم، اب کیسا محسوس کر رہی ہو۔“ وہاج مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھا۔

”میرے سر کو جانے کیا ہو رہا ہے، درد کے ساتھ کچھ ماؤف سی کیفیت، اف خدا یا۔“ ار یہ نے آہستگی سے بولتے ہوئے اذیت کے احساس کے تحت پھر سے آنکھیں میچ لی تھیں۔

”شہباز تم یہیں رکو ذرا دھیان رکھو میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔“ وہاج ڈیوٹی پہ موجود ڈاکٹر کو بلانے گیا تھا۔

”پریشانی کی بات نہیں ہے خون زیادہ بہنے سے کمزوری ہو گئی ہے تو ایسی کیفیت کچھ غیر فطری



بات نہیں، اب یہ خطرے سے باہر ہیں، آپ انہیں جوس پھل دودھ وغیرہ دیں اگلے دو گھنٹوں میں یہ بالکل ٹھیک ہوگی اور آپ چاہیں تو انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“ ڈاکٹر پروڈینشل انداز میں بولا تھا، وہاں نے ایک گہرا سانس خارج ہوئے اپنے سامنے لیٹی اریہ کو بغور دیکھا تھا نڈھال زرد رو اور کمزور ہو رہی تھی وہ چوٹ کے باعث یوں جیسے برسوں کی بیمار ہو۔

”کون کہہ سکتا تھا کہ کچھ دن پہلے تک یہ لڑکی زندگی کے متعلق کتنی پر امید اور خوش کن باتیں کرتی تھی وہاں کو کھٹن اور مشکل حالات میں حوصلہ قائم رکھنے اور مطمئن کرنے کو کیسے سبق آموز لیکچر سنایا کرتی تھی، کتنے خواب بنا کرتی تھی محبت کے بتوں پر رقص کرتی تھی تیز کے رنگوں جیسے رنگی اور نرم خواب جو امید کی کرنوں سے جگمگاتے تو کیسی چھن چھن کرتی روشیں دلوں کی ہستی میں بسرا کرتی تھیں اور اب.....“

”عم کا موسم خواہ کتنا طویل اور کھٹن ہو مگر تمہارے لئے خوشیوں اور سکھوں کا سورج ضرور نکالوں گا صرف تمہارا اعتماد، یقین اور محبت کا بھروسہ چاہیے۔“ وہاں نے سنہری خوشوں جیسی دہکتی رنگت والی نیم خوابیدہ اریہ کو بہت محبت سے دیکھا تھا۔

آنکھوں میں عکس اور دل میں شائستگی رکھنا  
سنجھال کے جذبوں کی حدائیں رکھنا  
لفظوں کے موسم اگر بھر ہو بھی جائیں تو  
سوچ کی زمین پر سدا بارشیں رکھنا  
جراتوں کی فضا کو گرمائے رکھنی ہے آرزو  
انجان ہوا کے ہاتھ میں بھی خواہشیں رکھنا  
سوئپ دینا رعنائی قربتوں کی اپنی  
آپیل میں میرے تمام صحبتیں رکھنا  
ضروری ہوں چاہے لاکھ بکھیرے دنیا کے  
کار عشق کے نام پہ فرصتیں رکھنا  
غل آرزو پہ تان دینا چادر خوشی کی  
رک جاں میں حسن کی ندرتیں رکھنا  
میسر ہے جو تم کو عطا کر دو بیتابی وہ ہم کو۔  
اترنا جب روح میں تو یہی شدتیں رکھنا  
قرب میں اپنے چھوڑ دینا لمحے تمام قیمتی  
پناہ میں اپنی پیار کی امانتیں رکھنا  
بہ ظاہر چہرے پہ اک تاثر روشنی کا  
پس گفتگو مبہم سی الجھنیں رکھنا  
بے دھیانی میں بھی رہے لگن یہی تمنا کی  
خواب سے بھی قائم سچی نسبتیں رکھنا

☆☆☆

”سنہیہ کہاں ہو تم؟“ وہ میسر بہ بہت خاموش دگر فتنہ سی کھڑی تھی جب شائستہ بیگم نے پکارا تو وہ ناچا پتے ہوئے بھی پلٹی اور سنجیدہ مگر خاموش تاثرات کے ساتھ دیکھا۔  
”سو نو میری جان اگر طبیعت خراب تھی تو میڈیسن لے آئیں یوں شام ڈھلے کھلی ہوا میں رہو گی تو بیزاری اور بڑھے گی۔“

”میں مجھے اچھا لگ رہا ہے یہاں کھڑے ہونا، آپ پریشان نہ ہوں، ہلکا سا سردرد ہے چائے پیوں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ ان کی لٹکی کو ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولی۔  
”پھر بھی بیٹا احتیاط اچھی چیز ہے، تم نیچے آؤ تمہارے پاپا اور شہریار بھی آچکے ہیں، چائے پیئیں اور باتیں کریں گے۔“ کہہ کر شائستہ نیچے کو جانے لگیں۔  
”بہت جلدی آگئے آج سب لوگ۔“ وہ ان کے پیچھے آئی۔

”موسم خراب ہو رہا تھا دھندلا اور گہرا، سو سبھی چلے آئے۔“ وہ گہرا سانس لے کے موسم کی خنکی کو محسوس کرتی گرم ادنی شال کو اپنے گرد اچھی طرح پھینکتی تیزی سے سیڑھیاں عبور کرتی لاؤنج میں آئی تو پہلی نگاہ سامنے صوفہ پہ پاپا کے ساتھ بیٹھے شہریار پر پڑی تھی بلیک ٹراؤزر شرٹ میں بہت ریلیکس موڈ کے ساتھ مسکراتا بلاشبہ بہت اچھا لگ رہا تھا، وہ بوتیک کے افتتاح والے دن ہونے والی گفتگو کی وجہ سے حتی امکان ان سے بچنے کی کوشش کرتی تھی مگر ایک ہی گھر میں اتنے قریبی رشتہ کی وجہ سے یہ سامنا روز ہوتا تھا اور جی دیر وہ بیٹھتی شہریار کی موجودگی کی وجہ سے جلد از جلد اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کیا کرتی، پر آج یہ موقع ملنا بعید تھا کیونکہ پاپا موجود تھے اور ظاہر تھا اگلے دو گھنٹے وہ بہت تفصیلی گفتگو کرتے گزارتے اور اس دوران میں سب کا وہاں موجود رہنا ضروری ہو جاتا تھا۔  
”سنہیہ بیٹی کہاں تھیں تم، اپنے پاپا کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو، مانا تم مستقبل کی ایک ماہر اور مقبول ڈریس ڈیزائنر بننے جا رہی ہو پر بیٹی گھر والوں کا بھی کچھ حق بنتا ہے۔“ وہ ذرا نیم مزاحیہ اور قدرے شفق انداز میں بولے تھے۔

”پاپا! آپ کو میں بھول سکتی ہوں بھلا، آپ ہی تو میرے سب سے اچھے دوست اور بھدر ہیں۔“ وہ بہت لاڈ بھرے انداز میں ان کے کندھے سے سر ٹکا کے بولی۔  
”لگتا ہے بٹر بہت سستا ہو رہا ہے۔“ شہریار نے کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
”بٹر سستا نہیں ہو رہا بلکہ کچھ جلنے کی بو آ رہی ہے۔“ سنہیہ نے فوراً کہا۔  
”ماشا اللہ طبیعت ٹھیک ہو گئی تمہاری۔“ شہریار نے کچھ طنز سے کہا۔  
”ٹھیک ہو بھی گئی ہے اور ٹھیک کر بھی رہی ہوں۔“ وہ کچھ جتانے والے انداز میں بولی۔  
”ماشا اللہ ایسے رہا کرو، ہوشیار اور چالاک یہ ست اور چپ چپ رہنا ٹھیک نہیں کم گولوگوں کو دنیا بہت پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔“ عفتان علی خان خوشدلی سے بولے۔  
”بس شہہ دیں، یہ نہیں کہہ بیٹی ہے تو نرم سبھاؤ کی عادت ڈالیں۔“ شائستہ نے خفیف نگاہ سے دیکھا۔

”شائستہ بیگم بیٹیوں کو نرم سبھاؤ رکھنے کے ساتھ جراتمند اور با حوصلہ بھی ہونا چاہیے اور ہماری بیٹی تو ہے ہی ذہین، ہمدرد خوش مزاج اور صلح جو اسی سے ہمارے گھر کی تمام رونقیں ہیں۔“ وہ بیٹی کو دیکھتے ہوئے پدرانہ شفقت سے بولے۔



# نفاست اور سہولت موویٹا ٹشوز کی بدولت

VIRGIN PULP سے تیار کردہ پاکستان کا واحد پرنٹڈ ٹشو پیپر  
ایکسٹرا ملائم، ایکسٹرا حفظانِ صحت، ایکسٹرا ہولت، جذبہ کرے آسانی سے صاف کرے روانی سے



MOVEETA  
Super Soft

MOVEETA  
Perfumed & Printed  
کاواحد پرنٹڈ ٹشو پیپر

Super  
ہولت... زیادہ نفاست  
Perfumed Sand  
آہستہ آہستہ خوشبو



Mod N  
بقی بالائین ٹشو پیپر  
28 روپے میں 150 ٹشوز

Party P  
تقریبات کے لئے موزوں ترین ٹشو پیپر

MOVEETA  
Super Soft R  
& Kitchen R  
ت بھی... ہولت بھی

life style MOVEETA

لاہور کے لیے ڈسٹری بیوٹرز کلیم بٹ اینڈ سنز 0300-4252808

MOVEETA INTERNATIONAL MADE UNDER LICENCE IN PAKISTAN BY, K.B. TRADERS

P.O. BOX 2223 KARACHI - 74600, PH. OFF: (021) 6609032, 6623757, FAX: (021) 6623513

E-mail: moveeta@cyber.net.pk E-mail: moveetatissuepaper@hotmail.com

”پتا ہے شہر یار تمہاری ماما کو بڑی خواہش تھی کہ پہلی اولاد بیٹا ہوتا کہ مستقبل میں ہمارے کاروبار کو سنبھالے ہمارے کام آئے مگر مجھے شروع سے بیٹی کی خواہش تھی، جانے کیوں میں سب بھی ہاتھ اٹھاتا تو بیٹی مانگتا اور اللہ نے میری دعاؤں کی لاج رکھ لی، سعید نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں تو مانو ہر نعمت مل گئی۔“ ان کی آواز اظہارِ تشکر سے بھاری ہوئی اور سعید کو اپنا آپ بہت معتبر ہوتا محسوس ہوا۔

”تو بیٹی رحمت ہوتی ہے رب نے ہمیں یہ رحمت دی تو ہم نے بھی اسے بہت خلوص اور محبت سے سنبھالا اچھی تربیت دی۔“ شائستہ اطمینان سے بولیں تو عفنان علی خان نے کہا تھا۔  
”آپ کی اسی خدمت اور چاہت کے صلہ میں تو اللہ تعالیٰ نے مزید احسان کیا کہ شہر یار کی صورت اک ذہین، خوبصورت اور پلا، پلایا بیٹا بھی عطا کر دیا۔“

”اور آپ کی ان تمام باتوں کے درمیان سب سے مزید بات گرم چائے اور بھاپ اڑاتے پکوڑے ہیں، جو ٹھنڈے ہو رہے ہیں اجازت ہو تو مرد کروں۔“ سعید نے سب کو متوجہ کیا۔

”واؤ چائے و دو پکوڑے جیو طفیل بہت اچھے لک ثابت ہو رہے ہو۔“ شہر یار نے نئے لک کی تعریف کی۔

”مگر جو ٹیسٹ تمہاری ماما کے ہاتھ میں ہے وہ الگ ہی ہے۔“ عفنان علی خان پکوڑا کھاتے ہوئے بولے۔

”وہ تو ہے، ماما کا مقابلہ کون کر سکتا ہے، پر پاپا طفیل کی بنائی دہی پودینے کی چٹنی دیکھیں کتنی مزیدار ہے۔“ سعید نے چٹنی والا باؤل ان کے آگے رکھا۔  
”والی طفیل تم جیت گئے، اب تم ہر ویک اینڈ پہ بھی پکوڑے اور چٹنی بنایا کرو گے۔“ عفنان علی خان توصیفی انداز میں بولے۔

”کیوں نہیں صاحب جی، ہم تو حکم کے غلام ہیں، آپ سے جی ایک بات کہنا تھی، مجھے دو دن کی رخصت چاہیے۔“ طفیل نے موقع اچھا دیکھتے ہوئے گزارش کر دیں۔

”رخصت مگر کیوں؟ تمہیں معلوم ہے یہاں بازاری کھانا سب کم ہی کھاتے ہیں، بھئی یہ نہیں ہوگا بہت مشکل ہوگا تمہارے بعد۔“ شائستہ نے فوراً سے پیشتر انکار کر دیا۔

”بیگم صاحبہ بہت مجبوری ہے ورنہ میں ہرگز نہ کہتا۔“ وہ بھی ہوا۔

”بھئی کوئی ریزن بھی تو ہو یہ بلا وجہ کی چٹنی کیسے دے دیں۔“

”وہ جی میری گھر والی بیمار ہے خیر سے پاؤں بھاری ہے وہاں گاؤں میں مناسب طبی سہولت نہیں اسی لئے شہر لانا ہے ہسپتال میں۔“

”اوہ، خیر ہو، تمہیں نہ صرف چٹنی مل جائے گی بلکہ تم یہ کچھ رقم بھی لے لو کام آئے گی۔“ شائستہ فوراً فیاضی انداز اختیار کر گئیں۔

”اور ماما کچن؟“ سعید نے کہا۔

”ہم دونوں مل کر دیکھ لیں گے، انسانیت کے ناطے ملازمانہ حقوق بھی کوئی چیز ہیں۔“

”ہرا جمہوریت زندہ باد۔“ شہر یار نے نعرہ لگایا سب مسکرائے لگے۔

(جاری ہے)



”آہ کسے اپنا حال دل سناؤں کس کے آگے اپنا دوکھڑا روؤں کوئی میرا دکھ، میری بات سمجھتا ہی نہیں، ہائے اللہ کس سے کہوں اپنا حال دل؟“

”ارے ارے رکیے تو سنئے تو بوجھلا مجھ کوتاہ بین کی اس سے پہلے آپ پر نظر کیوں نہ پڑی یقیناً وہ آپ ہی ہیں جس سے میں اپنا حال دل کہہ سکتی ہوں صاف صاف الفاظ میں آزادانہ اپنا دوکھڑا رو سکتی ہوں۔“

”جی جی بالکل آپ ہی سے مخاطب ہوں بھلا گرمی کے طویل دن میں جب آپ لوڈ شیڈنگ سے گھبرائے اور بوجھلائے خود کو ڈائجسٹ بڑھ کر مصروف اور ہر پریشانی سے نجات حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر بھلا کون ہے جس سے میں مخاطب ہوں آپ سے ہی ناں (شکر ہے یہ بات تو آپ کی سمجھ میں آئی)۔“

”میرا مطلب ہے کوئی اور افسانہ پڑھنے سے پیشتر میرا افسانہ پڑھیں میرا حال دل سنئے، میرا دکھ جانے میری مشکل سمجھیں اور پھر اس کا حل بھی بتا دیجئے (بھئی پھیلنے کی عادت قومی طور پر پائی جاتی ہے)۔“

”مجھ جیسی مظلوم، معصوم اور بے چاری ہستی شاید ہی اس دنیا میں پائی جانی شادی کے بعد میں جس مشکل اور مصیبت سے دوچار ہوں شاید ہی کوئی ہوا ہو میری مشکل کوئی سمجھ ہی نہیں رہا اب آپ ہی میری آخری امید ہیں ورنہ تو دل اور صاف زبان میں اپنے ارد گرد موجود لوگوں کو اپنا

مسئلہ بیان کر چکی ہوں لیکن کسی نے اسے در خواستہا جانا ہی نہیں، ان کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہیں اور میں جس ٹینشن سے دوچار ہوں وہ سب اسے ناک سے کھسی اڑانے کے برابر گردانتے ہیں۔“

”ارے یہ آپ میں سے کسی نے کیا بڑبڑا ہے کہ وہی ساس بہو کے ازلی بیر کی بور کہانی، چم چم جہاں اطلاقاً عرض ہے میری ساس صاحبہ اس وقت فوت ہو گئی تھیں جب عمر کی عمر (عمر میرے شوہر بھی) محض چار سال تھی اور مجھے اس دنیا میں آئے پونے دو سال کا عرصہ گزرا تھا لہذا یہاں ساس بہو والی بور کہانی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، تو پھر سر، دیور یا منڈ ٹائپ کا مسئلہ درپیش ہو گا قیاس بھی آپ کا غلط ہے، ایک نوجوان خول صورت دوشیزہ کا قیاس ہے کہ مجھے ایک خوبرو، مغرور، اکڑو ہیر و تما شوہر سے واسطہ ہے لیکن ماں ڈیر ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں بھئی میرا شوہر خوبرو بھی ہے اور ہیر و بھی مگر اکڑو ہے اور مغرور ویسے بھی میں اپنے شوہر کے ساتھ تنہا فلیٹ میں رہتی ہوں اور میرا سسرال ذرا دور ایک گاؤں میں آباد ہے، سر صاحب جو کافی حلیم طبیعت کے مالک ہیں میرے جیٹھ کی نیملی کے ساتھ گاؤں میں ہی سکونت پذیر ہیں اور ایک عد بڑی تند ہیں جو بیاہ کر کب کی گینڈا جا بسی ہیں۔“

تو پھر کس بات کی ریں ریں، ہائے اللہ کہا ہو گیا ہے آپ کو میکہ میرا لاہور میں آباد ہے اور میں کراچی بیاہ کر آئی ہوں دو عدد بڑی بھائیوں بھائیوں اور ایک عدد والدین کی اکلوتی اور لاڈلی

ہوں اور میکے میں ہر سو خوشی پائی جاتی ہے راوی کاٹی عرصے سے میرے میکے میں چین چین لکھ رہا ہے۔

”بے چاری کو سخت مزاج ظالم شوہر سے واسطہ ہے جو تنہا سمجھ کر ظلم ڈھار رہا ہے۔“

”ہائے اللہ آئی ایسا تو نہ ہمیں آپ کا گیس غلط ہے عمر بہت اچھے ہیں (شرما کہ ہونٹوں کا ایک کونہ دانتوں میں دباتے ہوئے) عمر بڑے بھائی کے بہت اچھے دوست ہیں اور جاوید بھائی کچھ عرصہ اپنی فرم کی مہربانی سے کراچی کی برانچ



میں ٹرانسفر ہو کر آئے تھے یہی پر عمر سے دوستی ہوئی اور پھر یہی بچی دوستی رشتے داری میں بدل گئی اور عمر جو جاوید بھائی کو شادی سے پہلے بھی "اے بے سائے" کہہ کر بلاتے تھے اب بھی "اے بے سائے" کہہ کر ہی بلاتے ہیں۔

"تو بھی مسئلہ کیا ہے خواہ مخواہ پنس کر بیٹ کر رکھا ہے کم بخت لوڈ شیڈنگ اور گرمی نے کم مت ماری ہوئی ہے جو تم بھی سرکھانے بیٹھ گئی ہو۔"

"ہائیں آپ لوگ تو خفا ہونے لگے اچھا پلیز خفا مت ہوئے اور آگے لکھے یہ چند جملے پڑھیے پھر بتائی ہوں میں تفصیلاً آپ کو اپنا مسئلہ پڑھیے ناں پلیز (اپنی مٹی پلوں والی کجری آٹکھوں کو معصومانہ انداز میں جھکتے جب میں ایسے پلیز کہتی ہوں تو ابا سے لے کر عمر تک سے اپنی بات منوالیتی ہوں آپ کس کھیت کی..... میں، میرا مطلب ہے سوائے ایک بات کے)۔"

"اوہ سوئی میری جانو، مائی ڈارلنگ، مائی سوٹ ہارٹ۔" اپنے شوہر کے منہ سے ایسے جملے میں دن میں ہزار مرتبہ سنی ہوں اور ہر بار دل مرس کر رہ جاتی ہوں (یہ جملے میرے لئے ادا نہیں کیے جاتے اس لئے)۔

"اوہ بے بی ہاؤ بیوٹی فل یو آر (تم کتنی خوبصورت ہو) ہاؤ سوٹ یو آر (تم کتنی نرم ہو)۔"

"سوئی تمہارے نین کٹورے کتنے خوبصورت ہیں۔"

"سوئی لاڈو کدھر ہو بھی۔"

عمر کے رومینک مزاج کا تو آپ کو ان جملوں سے اندازہ ہو گیا ہو گا لیکن ان میں سے ایک جملہ ابھی میرے لئے نہیں اور نہ ہی میرا نام سوئی ہے خدا نخواستہ یہ بھی غلط یہ کوئی عمر کی پرانی یا نئی گرل فرینڈ نہیں اور نہ ہی مشرقی بیوی ہونے

کے ناطے میں اپنے شوہر کو اتنی آزادی دینے کی قائل ہوں کہ وہ واشگاف اپنی گرل فرینڈز کو میرے سامنے یوں پکارتا پھرے نہ ہی یہ کوئی آفس کولیک ہے اور نہ ہی پڑوسن کیونکہ جس جگہ ہم نے فلیٹ لیا ہے یہ بلڈنگ نئی نئی بنی ہے مکمل طور پر آباد نہیں احد سوئے اتفاق ہمارے آس پاس جو دو فلیٹس آباد ہیں ان میں ایک صاحب اپنے گیارہ سالہ بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں بیوی انہیں نامعلوم وجوہات کی بناء پر چھوڑ کر جا چکی ہیں اور دوسرے فلیٹ کے صاحب نے خود اپنی بیوی کو چھوڑ دیا یہ معلومات بھی عمر نے مجھے فرائم کی سو فراموشی کے اوقات میں، میں بے چاری آس پڑوس بھی جا کر اپنا حال دل بیان نہیں کر سکتی۔

"ہاں، ہاں یاد آیا میں آپ کو سوئی ڈیر کے بارے میں بتا رہی تھی یہ میری پڑوسن تو نہیں سوتن ضرور ہے جی یہ میری سوتن ہے مگر دونوں والی نہیں بلکہ چار ٹانگوں والی۔"

(آخر کار ملی تھیلے سے نکل ہی آئی۔)

سوئی میرے شوہر کی عزیز از جان بی بی کا نام ہے۔

ارے آپ میں سے کچھ صفحے پلٹنے کی جلدی میں ہیں پہلے میری بات تو سن لیجئے یہ واقعی ایک نگہبیر اور دردناک مسئلہ ہے جو مجھے معصوم اور نئی جگہ پر ایک نئی نو بیلی دہن کو درپیش ہے مجھے آپ کی واقعی مدد کی ضرورت ہے، آپ ہی بتائیے اگر شادی کی پہلی رات ہینڈ سم شوہر نازک خوبصورت دہن کا گھونگھٹ الٹا کر چند لمحے بعد اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے کی بجائے یہ کہے کہ "ماہین (بھئی میرا نام ماہین) مجھے سوئی بے حد عزیز ہے اور میں اسے کسی صورت گھر سے نہیں نکال سکتا اور مجھے امید ہے کہ میری طرح تم بھی اس کا خیال رکھو گی یہ میری تم سے خاص ریکویسٹ ہے تو

جانیئے میرے دل پر کیا گزرے ہوگی، یہ تو شکر ہے کہ جاوید بھائی کے توسط سے میں گرے کلر کی ایرانی بی بی سے غائبانہ تعارف رکھتی تھی ورنہ نہ جانے کیا سمجھ بھگتی عمر کے جذباتی جملے سن کر، شاید عمر بھی جاوید بھائی کے منہ سے میرے خیالات اور احساسات بلیوں کے بارے میں جان چکے تھے بھی مجھے سوئی کا خیال رکھنے کو کہا جا رہا تھا۔

اصل میں مجھے بی بی سے الرجی ہے اس کی نرم نرم فروالی کھال میرا مطلب ہے بال دیکھ کر ہی مجھے ابکائی آنے لگتی ہے (بی بی جیسے عجیب جانور سے پیار کرنے والے قارئین سے ایک ہی بار بہت ساری معذرت) اور قریب آ جائے تو چیخیں آنے لگتی ہیں، عجیب سی مخلوق بنائی ہے اللہ نے اوپر سے محترمہ مجھ سے عمر کی غیر موجودگی میں عمر جیسے پیار اور لاڈ کی توقع رکھتی ہیں، بعض دفعہ چلتے چلتے کئی بار گرتے گرتے پتی ہوں ہاتھوں میں آ کر گول گول چکر کاٹنے لگتی ہے اور جب اپنی کرچی آنکھوں یعنی برسراء آنکھوں سے مجھے گھورتی ہے تو اللہ قسم مجھے تہا فلیٹ میں بہت ڈر لگتا ہے میں نے بچپن میں ایک کالی بی بی کی ڈراؤنی کہانی پڑھی تھی ایسی دماغ میں بیٹھی کہ گھر میں جہاں کہیں رات کو بی نظر آتی میں چیخ ضرور نکلی جاتی اور اب مجھے اس بلا کے ساتھ دن رات گزارا کرنا ہے بس سمجھئے جان عذاب میں آئی ہوئی ہے اور عمر سے دو ٹوک اسے کہیں مجھوانے کا بھی نہیں کہہ سکتی اگر میں یہ کہہ دوں کہ عمر اس گھر میں میں رہوں گی یا سوئی تو جناب کوئی بعید نہیں کہ موصوف ہاتھ پکڑے مجھے فلیٹ سے باہر نکال کھڑا کرتے اتنے بڑے اجنبی شہر میں یوں تنہا ہونے کے خیال سے مجھے تو جھمر جھمری آتی ہے، پتہ ہے شروع میں جب میں نے سوئی کے خلاف اپنی بیزاری کا اظہار ڈھکے چھپے انداز میں کیا تو صاحب جی کا سارا دن ایسے منہ پھولا

رہا ہے جیسے بھیڑوں نے کاٹ لیا ہوا اور میرے بڑ بڑ کرنے پر ایک روز واضح الفاظ میں کہہ ڈالا کہ۔

"دیکھو تم مجھے جتنا مرضی بلا وجہ برا بھلا کہہ لیا کرو میں بالکل برا نہیں مانوں گا لیکن میری سوئی کو کچھ مت کرو یہ تو جان ہے میری۔" اور یہ سب سن کر جو میری جان جلتی ہے وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

ایک روز بی بی سے متاثر کرنے کے لئے مجھے یہ تک کہہ ڈالا کہ اردو ادب بھی بی بی جیسے ذہین نرم اور پیارے اور خوبصورت جانور سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا باذوق اور باادب لوگ بھی اس جانور پر فریفتہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے بھی تو "بی بی کے بھاگوں چھنکا ٹوٹا" بی بی کو چھبھڑوں کے خواب، یا پھر "ملی تھیلے سے باہر نکل آنا" جیسے محاورے ایجاد کیئے گئے جی بالکل بالکل میں نے بھی اپنا سر پیٹ ڈالا تھا آپ کی طرح اس مثال پر۔

☆☆☆

عمر کافی عرصے سے فلیٹ میں تنہا زندگی گزار رہا تھا اپنی بوریت اور تنہائی کا اس نے یہ حل نکالا کہ ایک ایرانی بی بی کا بچہ (کافی مہنگا میرے نزدیک) خرید لیا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ بے تحاشہ ایچٹ ہوتی چلی گئی اسی اس کے بارے میں حد سے زیادہ حساس بھی ہے اور ویسے بھی عمر کو بچپن سے ہی پالتو جانور پالنے کا شوق تھا عمر کی والدہ کی وفات کے بعد میرے سر نے اس کا دھیان اور توجہ بٹانے کے لئے اسے بکری کا بچہ پال کر دیا پھر اس کے بعد ایک عدد طوطا، ایک عدد کتا اور ایک عدد گائے اس کے شوق کے ذمے میں آتی ہیں چونکہ یہ جانور کافی دیسی اور دیہاتی لائف سٹائل بتانے کے عادی تھے لہذا ان میں سے کوئی بھی فلیٹ میں عمر



کی تنہائی دور کرنے کا سبب نہیں بنا اور میں نے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ سوئی بلی کا نام ہے کسی گائے بھینس کا نہیں اف تصور کیجئے فلیٹ میں پالتو گائے اور میں جھرجھری آگئی ناں آپ کو بھی (یہ تمام معلومات مجھے فون پر سوئی کا ذکر کرنے پر عمر کی بڑی بہن یاہید آپ سے موصول ہوئیں)۔

”ماہین تمہیں یہ فضول قسم کی باتوں میں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے عمر بہت اچھا ہے بیوی ہو تم اس کی لاجول ولاقوہ بیوی اور بلی میں فرق ہی نہیں رہنے دیا مت ماری گئی ہے تمہاری۔“ یہ امی کی جانب سے ڈانٹ ہے جب میں نے فون پر اپنا سب سے بڑا ہمدرد جان کر گلہ کرتے ہوئے کہا کہ عمر بلی کو مجھ سے زیادہ چاہتے ہیں (باقی ڈانٹ سن رہی ہیں) بھابھی، دوستیں بھی لوگوں سے شائستہ الفاظ میں ایسے ہی جملوں کی مار کھا چکی ہوں تو پھر بھلا کس سے اپنا حال دل بیان کروں ہاں ہاں آپ سے تو کر رہی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ میری طرح کے ہی حساس دل رکھنے والے قارئین ہیں تبھی تو میرا مسئلہ بھی غور سے سنے گے اور اس کا حل بھی ڈھونڈ لے گے۔

ایک منٹ ڈورنیل بج رہی ہے عمر آگئے ہیں (آگئے ہیں ان کے علاوہ اور کون تیل بجائے گا ویسے بھی یہ ان کے آنے کا ہی وقت ہے) ذرا آپ بھی میرے ساتھ ان کی آمد کا منظر ملاحظہ کیجئے صرف آمد کا۔

بیجے میں مین ڈور کھول دیا ہے آفس کے کام سے تھکا ہارا ناٹی کی ناٹ ڈھیلی کیے تھوڑے سے اچھے بال، جسے میرا سلجھانے کو بے اختیار دل چاہتا ہے لیکن مجھے بھی ایسی پیش رفت کرنے کا موقع مل ہی نہیں سکا کیوں؟ دیکھئے ذرا گھر میں اینٹری ماری ہے۔

”السلام وعلیکم۔“ تھکا سا سلام متھے مار کر مجھے ہینڈ بیگ تھما دیا گیا ہے (شکر ہے ہینڈ بیگ

متھے نہیں مارتے)۔

”اوہ سوئی باؤ آر یو بے بی (کیسی ہوتی) آئی مس یو بے بی مائی سوئیٹ سوئیٹ سوئیٹ۔“

جی بالکل سوئیٹ صاحبہ کسی کونے سے اچانک نمودار ہوئی ہیں اور میاں صاحب کی ٹانگوں کے ارد گرد میاؤں میاؤں کرتی گھسن چکریاں کھا رہی ہیں اور اب میاں صاحب ساری ٹھکن بھلائے اپنی لاڈلوں کے ساتھ لاڈیوں میں مصروف ہیں۔

”عمر آپ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جائے میں کھانا لگاتی ہوں۔“ میں نے اپنے ہونے کا احساس دلانا چاہا اور دوسروں لفظوں سے اس مصیبت کو دفعہ کرنے کا کہا۔

”ہوں، آں بھئی میں ذرا سوئی جان سے لاڈی تو کر لوں سارا دن اداں ہو جاتی ہے (جسے پہلے تو وہ ان کے ساتھ آفس بھی جایا کرتی تھیں اور اب میری تنہائی کے خیال کی وجہ سے گھر رہتی ہے) اور سوئی نے کچھ کھایا دودو (دودھ) پیا؟“

”ہونہ آجائے آپ بھی میرے ساتھ کچن میں مزید برداشت نہیں کر سکتی میں یہ لاڈ بھرا منظر نامہ۔“

☆☆☆

”جی تو کیا حل سوچا آپ نے؟، ایک منٹ میں ذرا واشنگ مشین کا سوچ آف کر آؤں کم بخت لائٹ خربلی حسینہ کی طرح بے وقت پھر روٹھ گئی۔“

”اوئی ماں! دفعہ ہو، ہائے ہائے آپ کو تھوڑی کہا ہے یہ تو کم بخت سوئی جو صوفے پر خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی اور میں بے خیالی میں اس پر بیٹھ گئی اللہ قسم ابھی تک ہاتھ میں عجیب سی گدگدی محسوس ہو رہی ہے جو اسے چھو گیا تھا میں ذرا ہاتھ دھو لوں ورنہ میں اس سے کچھ بھی کھانہ پاؤں کی نہ جانے عمر کیسے اس منحوس نرم چہرہ کو ہاتھ لگا لیتے ہیں۔“

میرا خیال ہے مجھے کہانی کے آغاز میں وہ نوٹ لگا دینا چاہیے کہ ”بلی سے پیار کرنے والے قارئین اس کہانی کو پڑھنے سے گریز کریں۔“ بالکل ویسے ہی جیسے کمزور دل حضرات کو ہارر مووی دیکھنے سے خبردار کیا جاتا ہے (پھر بھی دیکھئے تو ڈھیٹ ہیں خیر سانوں کی)۔

ہائے یہ کس نے تجویز دی کہ چلتی مشین میں ڈال دوں یقیناً یہ آئیڈیا آپ خاتون میرا مطلب ہے لڑکی یا پھر وہ دو شیزہ افوہ بھئی جو بھی خود کو سمجھے ابھی ابھی میری واشنگ مشین آف کرنے سے آیا ہو گا لیکن محترمہ یہ بھی تو سوچئے کہ بعد میں مجھے ہی اسے کپڑے کی طرح پھینک کر تار پر ڈالنا پڑے گا سو کھانے کے لئے اور میں طبعی اس کم بخت کو ہاتھ نہیں لگا سکتی، (ویسے آپ نے یہ عمر والا جملہ کیوں دہرایا جو میری ایسی بات سن کر ہمیشہ کہتے ہیں کہ ”ماہین تم تو بہت سیانی ہو۔“

یہ آپ نے کیوں پوچھا کہ ہمارا فلیٹ کس منزل پر ہے؟ دوسری منزل اچھا، میں یہ بھی کر چکی ہوں بڑی مشکل سے ابکانی روکتے ہاتھوں پر کپڑا لپیٹ کر میں نے ایک دن سوئی ہوئی سوئی کو بالکلونی سے نیچے پھینک ڈالا کمر کے بل گرتی تو ہڈی پسلی ایک ہو جاتی حس کم جہاں پاک۔

مگر ہوا کیا؟ محترمہ نیچے والے فلیٹ کی بالکلونی میں گری اور وہ بھی بچوں کے بل اور پتہ ہے جب عمر نے ڈورنیل بجائی اور میں نے شاد ہو کر دروازہ کھولا تو عمر مجھے گھور رہا تھا اور سوئی اٹھلاتی ہوئی دم اٹھا کر اندر چلی آئی اور میں جو بھی بیٹھی تھی کہ فلیٹ کا راستہ بھول کر کہیں گم ہو گئی ہے غلط ثابت ہوا۔

”یہ باہر کیسے نکلی میں آیا تو دروازے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی یہ بڑی قیمتی ایرانی بلی ہے کسی کے ہاتھ لگ جانی یا کم ہو جانی؟“

”لو کر لو بات وہ عمر میں تو خود کافی پریشان

تھی اصل میں سوئی بالکلونی سے نیچے گری تھی اور پتہ ہے یہ بالکل سیدھی بچوں کے بل سچ سلامت بالکلونی پر چل گھوم رہی تھی تو چا خود ہی گھوم گھام کر آ جائے گی۔“

”افوہ ماہین یہ کوئی آوارہ بلی نہیں نسلی بلی ہے (کہا تو یوں جیسے اعلیٰ حسب نسب کی خاندانی بلی ہے) اور بلی جب بھی اونچائی سے گرتی ہے قدرت نے اس کے اندر یہ نظام رکھا ہے کہ وہ بچوں کے بل ہی گرتی ہے چاہے کمر کے بل ہی گرے اور اس کے نیچے سے نرم مگر مضبوط نیچے اسے چوٹ لگنے سے محفوظ رکھتے ہیں یونہی تو بلی چھتوں پر چھلانگیں نہیں مارتی ناں اور ہاں میں نے سوئی کو بھی اکیلے یوں باہر نہیں جانے دیا کم ہو جاتی تو مجھے فون کر دینا تھا یا نیچے جا کر ڈھونڈ لاتی (یہ بھی خوب کہی اب نیچے جا کر میں ادھر ادھر منہ کر کے سوئی سوئی پکارتی پکارتی اور بدلے میں دو ٹانگوں والا سوئیٹ بلا پیچھے پڑ جاتا تو۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ اسے تھیلے میں ڈال کر کہیں دور پھینک آؤں میں اتنی بے وقوف ہر گز نہیں، (آپ کا اس بات سے متفق ہونا ضروری نہیں)۔“

پتہ ہے اس آئیڈیے میں کتنے خطرات درپیش ہیں نہر ایک تو یہ کہ عمر کا شک سیدھا مجھ پر جائے گا وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھے بلی سے الرجی ہے اور میں نے ہی اسے غائب کر ڈالا ہے بالکلونی سے گرانے والے واقعہ کے بعد وہ کافی دن میری حرکات و سکنات کو مشکوک انداز سے ملاحظہ کرتا رہا تھا اور اس کے بعد کے حالات تو مجھے گوش گزار کرنے کی ضرورت نہیں ناں؟

دوسرا یہ کہ میں اس اجنبی شہر سے قطعی کوئی واقفیت نہیں رکھتی عمر کے ساتھ ہی بائیک پر ایک دودفعہ باہر آنے جانے کا اتفاق ہوا ہے اور واپسی



مجھے اپنے فلیٹ کا راستہ بھول گیا تھا اس کم بخت  
گوگمانے کے چکر میں، میں خود گم ہو گئی تو کون  
ڈھونڈے گا مجھے؟

اور تیسری اہم بات اگر کسی پولیس پاسی آئی  
ڈی یا ایف بی آئی اور نہ جانے کون سی کون سی  
خفیہ ایس بی سی والوں میں سے کسی کی مجھ پر نظر پڑ  
گئی اور تھیلے سمیت مجھے شک میں دھر لیا گیا تو؟ تو  
جانتے نہیں اپنے پولیس والے تو مجھے چھوڑ دے  
گے مگر کم بخت ایف بی آئی والے مجھے اور ملی کو  
اسامہ بن لادن بقول ان کے مرحوم اسامہ بن  
لادن یا طالبان کا سا بھی بنا کر ہی چھوڑیں گے اور  
یقیناً نائن الیون کے واقعہ میں سوئی اور میرا کردار  
بھی ثابت کر کے دم لے کے یہ ایف بی آئی  
والوں سے ہر قسم کے بے وقوفانہ بات نہایت  
دلیل جھوٹے ثبوت اور یقین سے ثابت کرنے کی  
امید رکھی جاسکتی ہے۔

ارے لائٹ آگئی بس جلدی سے کپڑے  
دھولوں اس مسئلے کا حل پھر کسی وقت آپ بھی اپنے  
رکے کام نبٹا لیجئے اس مسئلے کا حل پھر کسی وقت۔

☆☆☆

”آج کل عجیب سی سستی چھائی ہوئی ہے  
رمضان کے مبارک مہینے کے آغاز ہو چکا ہے  
روزہ رکھ کر سارا دن تنہا گزارنا کافی بیزار کن  
ہے۔“

سوئی کا مسئلہ جوں کا توں قائم ہے ارے  
کیا فرمایا آپ نے کہ ملی سے دھیان ہٹا کر  
ارد گرد آس پڑوس میں کسی سے دوستی کر لوں آپ  
کا خیال ہے میں کوئی آدم بیزار (شاید حوا بیزار) یا  
ایٹنی سوشل ٹائپ کی چیز ہوں آپ کو بتایا تو ہے کہ  
نئی بلڈنگ ہے پڑوس میں دو حضرات ہی رہائش  
پذیر ہیں جن میں سے ایک بیوی کو چھوڑ چکے ہیں  
اور دوسرے کو بیوی چھوڑ کر چاچھی ہیں اور مجھے  
قطع علم نہیں کہ دونوں میں سے کون زیادہ خوش رہ

رہا ہے نیچے والے فلیٹس میں سے ایک دو خواتین  
سے ہیلو ہائے ہے اور اس کی وجہ ان کی مادری  
زبان ہے ایک منہ بھی نیلی ہے اور ایک خان نیلی  
لہذا ان سے میں ہیلو ہائے میں کر سکتی ہوں خیر  
میں کیا کہہ رہی تھی ہاں سوئی کا مسئلہ یونہی چل رہا  
ہے عمر کافی کوشش کرتے ہیں کہ میں سوئی سے  
مانوس ہو جاؤں لیکن ان کے بے جا اصرار پر  
بشکل اسے پکڑنے سے یہ سہلانے کی کوشش کرتی  
ہوں تو مجھے ابکائی آ جاتی ہے میں کیا کروں یہ

میرے بس کی بات نہیں اس دوران میرے سر  
ایک دو دن ہمارے ہاں قیام کر کے واپس گاؤں  
چلے گئے میری حالت دیکھ کر انہوں نے عمر کو آفر  
کی کہ وہ سوئی کو بھی گاؤں لے جاتے ہیں جہاں  
دوسرے پالتو جانور ہیں وہی سوئی کو بھی رکھ لے  
گے شاید ناپید آپا نے بھی عمر کو فون پر کچھ ایسی ہی  
تجویز دی تھی اور اس وقت موصوف کی حالت  
دیکھنے کے لائق تھی ایسے لگ رہا تھا ساٹھ کی دہائی  
کے عاشق کو اس کی معشوقہ کی اچانک شادی کی

اطلاع دے دی گئی ہو بس رونے کی قصہ بانی رہ  
گئی تھی لہذا سوئی صاحبہ سوتن کا بھرپور کردار  
نبھانے کو میرے سینے پر مونگ دل رہی تھیں وہ تو  
اتنا شکر ہے کہ سن کر اب محترمہ بیڈروم سے باہر  
دروازے کے پاس نرم کشن پر رات کو سوئی تھیں  
ورنہ تو عمر کے بیڈ پر ان کے پیروں کے پاس  
سونے کی عادی تھیں اور جب نرم کمبل سمجھ کر میرا  
اس پر پیر آ جاتا تو جہاں وہ میاؤں کرنی وہاں میں  
بھی ڈر کے مارے چاؤں کرتی اور پھر پرائیوی  
بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور آج کل تو اس کی حرکتیں  
بڑی عجیب و غریب ہو گئی ہیں ہر وقت حلق سے  
عجیب عجیب سی آوازیں نکالتی رہتی ہے بھی کشن  
بچوں سے کھرچنے لگتی ہے بھی بالکونی میں جا کر  
اوپچی اوپچی آواز میں میاؤں میاؤں کرنے لگتی  
ہے مجھے تو قسم سے بڑا ڈر لگتا ہے اور عمر بھی شاید

اس کی حرکتوں سے پریشان ہیں اور سوئی صاحبہ  
ن پریشانی میں میرا اداس چہرہ بھی نظر نہیں آتا،  
ویسے میری ذاتی رائے ہے کہ عمر کو شادی کی قطعی  
ضرورت نہ تھی اس کی تنہائی کو دور کرنے کے لئے  
سوئی جو ہمہ وقت موجود تھی نہ جانے جاوید بھائی  
کو یہ سب کیوں نظر نہیں آیا جولاہور واپس آ کر عمر  
کی شان میں اتنے رطب اللسان ہوئے کہ اماں  
ابا سے بیٹی کو اتنی دور بیاہنے کی ہاں کروا کر ہی  
چھوڑا اور مجھے یہاں لا پھنسیا بس دل بہت  
اداس اور ہر چیز سے بیزار ہو رہا ہے آپ کو بھی  
خواہ مخواہ پور کر رہی ہوں پھر کسی دن اس مسئلے کا  
حل ڈھونڈے گے میں ذرا یکن دیکھ لوں افطاری  
کی تیاری کرنے ہے عمر کھانے پینے کے کافی  
شوقین ہیں اور مجھے معدے کے ذریعے ان کے  
دل تک رسائی تو حاصل کرتی ہے مگر فائدہ کیا دل  
پر تو پہلے ہی سے میاؤں کا قبضہ ہے۔

☆☆☆

بس بہت ہو گیا اب میری برداشت جواب  
دے گئی ہے میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں یہ گھر  
بلکہ ملی خانہ چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں  
کوئی ایسا بھی کرتا ہے بھلا، ارے آپ مجھے  
کمرے میں یوں بیٹھے دیکھ حیران ہو رہے ہیں کیا  
ماتھے پر باندھا دوپٹہ اور سوچی آنکھوں سمیت کافی  
ڈراؤنی لگ رہی ہوں جو یوں ہے مجھے تک رہے  
ہیں پتہ ہے ساری رات میں نے رد کر گزاری  
ہے پہلی بار، پہلی بار اس منحوس بھی کی وجہ سے  
میری اور عمر کی اچھی خاصی رات کو تو میں میں ہو  
گئی ہے شادی کو ابھی ایک مہینے کا عرصہ گزرا ہے  
اور لڑہم یوں رہے تھے جیسے ساٹھ سال کے بڑھا  
بڑھی۔

عمر نے اپنے چند دوستوں کو ان کی فیملی  
سمیت افطاری پر انوائٹ کر رکھا تھا (جنہوں  
نے ہمیں شادی کی خوشی میں اپنے گھروں میں

دعوتیں کھلائی تھیں حساب تو برابر کرنا تھا ناں  
حساب کتاب کے بغیر دنیا داری کہاں بخشی ہے)  
اور اس کی اطلاع مجھے بڑے آرام سے صاحب  
بہادر نے صبح سحری کے وقت فراہم کی تقریباً آٹھ  
دس لوگوں کا کھانا بنانا تھا (جو مجھے قطعی مشکل نہیں  
امی نے مجھے امور خانہ داری میں اچھا خاصا طاق  
کر رکھا ہے کسی بھابھی یا بھائی نے لاڈلی اور  
چھوٹی ہونے کی بنا پر حمایت کرنی تو اماں صاف  
منع کر دیا کرتی تھیں یہ کہہ کر کہ اگلے گھر بھابیوں  
نے یا اماں نے کام نہیں کرنا اس نے خود ہی کرنا  
ہے لہذا میں خواتین کے رسالوں میں شائع ہونے  
والے کسی بھی افسانے یا ناول کی ہیروئن کی طرح  
جن کی مانند اتنے لوگوں کے لئے چکن بریانی،  
تورمہ، شامی کباب، زردہ پلاؤ، فیرنی، کشرڈ جیسی  
مشکل اور دو دو گھنٹے میں تیار ہونے والی ڈشز کو  
چند ہی گھنٹوں میں تیار کر سکتی ہوں) میری دہائی  
دینے پر سودا خرید کر وہ مجھے دے کر آفس قدرے  
لیٹ روانہ ہوئے اور آفس سے جلدی آ کر میری  
ہیلیپ کرنے کا وعدہ کرنا بھی نہ بھولے۔

میں نے دوپٹہ کمر پر کسا (جواب ماتھے پر  
بندھا ہوا تھا) اور گھر کی تفصیلی صفائی کر ڈالی اس  
کے بعد کچن میں گھس گئی حالانکہ روزہ وہ بھی گرمی  
کے قدرے لمبے رکھنے کی بناء پر میری طبیعت  
قدرے ست ہو رہی تھی لیکن طبیعت کے بوجھل  
پن کو بھلائے میں مسلسل کام کرتی رہی ان کے  
آنے تک کو کافی حد تک کام سمٹ گیا تھا کمرے  
سے فریش ہو کر نکلے اور جو سوئی پر نظر پڑی تو پتہ  
چلا محترمہ کی طبیعت خراب ہے نہ جانے کیا کھا  
بیٹھی جو بیٹھے بٹھائے مصیبت بنا ڈالی اور عمر  
صاحب کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے بغیر مجھے  
بتائے بھی دوستوں کے گھر بیگم کی طبیعت خراب  
ہونے کا بہانہ بنا کر دعوت کیمنسل کرنے کی اطلاع  
دی اور معذرت بھی اور قریبی ویشری ڈاکٹر (ڈنگر



ڈاکٹر) کے کلینک سوئی کو لے کر روانہ ہوئے یہ سب بھی باہر دروازے کے پاس جلدی جلدی مجھے بتایا گیا اور میں جو سارے کام سے تھک چور کر ہونے کے باوجود اچھے سے کپڑے پہنے میک اپ کو فائل بچ دے رہی تھی مکی مکی لپ گلوں ہاتھوں میں پکڑے کھڑی رہ گئی اتنے عرصے بعد مجھے چند اور انسانوں کی صورتیں نظر آنے کا امکان ہوا تھا وہ بھی گیا، دکھ ہو رہا ہے ناں آپ کو بھی یہ سب سن کر ہونا بھی چاہیے بس پھر کیا تھا جب وہ واپس آئے اور بڑی ادا سے یہ اطلاع دی کہ شاید کوئی کیڑا وغیرہ کھانے کے باعث محترمہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی ڈاکٹر نے دوائی ملائی ہے افادہ ہے اب لو بھلا اتنے صفائی والے گھر میں کیڑا کدھر سے آ گیا ویسے ہی سوکھوں والے مکر ہیں بس پھر جو میں نے غصے میں آ کر سوئی کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالی تو عمر سنتے ہی رہ گئے اتنے دنوں کا جمع غبار سب نکال ڈالا اور غصے میں سب کی طرح میں بھی رہی سہی عقل سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہوں نہ جانے کیا کچھ کہہ ڈالا مقابل کے منہ میں بھی زبان تھی جو کافی لمبی تھی سو ہم دونوں کے بیچ خوب تو تو میں میں ہوئی اور وہ پچھلے کٹنی آنکھیں موندے کشن ہلکے ہلکے دم کو ہلاتی آرام فرماتی رہیں۔

اور اب تو مجھے چکر آرہے ہیں افطاری بھی ڈھنگ سے نہ ہو پانی اور صبح سحری بھی بس خانہ پری کی کل کے کھانوں سے میں تو بیڈروم میں آ کر منہ موڑے سو گئی اور خود نہ جانے کب تیار ہو کر آفس چلے گئے جگایا بھی نہیں اور بتایا بھی نہیں۔

”مائے اللہ اگر میں یونہی تنہا مر گئی تو، امی کو فون کرنی ہوں موبائل بھی نہ جانے کہا رکھا ہے اور اٹھا بھی نہیں جا رہا ہائے اللہ لگتا ہے میرا آخری وقت آ گیا ہے، پرسوں چاند رات ہے میری شادی کے بعد پہلی چاند رات شادی کے بعد

کراچی میں شاپنگ کے عمر کی سنگت میں یہ کیسے خواب دیکھے تھے سب چکنا چور ہو گئے۔“ ایک نئی ٹیلی دہن اپنے شوہر کی بلی کی وجہ سے کمرے میں بے یار و مددگار مردہ حالت میں پائی گئی (ایسی ہی خبر لگے گی ناں) گواہ رہیے گا آپ بھی اس بات کے اس دنیا میں نہ سہی روز محشر میں ہی میرا ساتھ دیجئے گا۔

”اف لگتا ہے میرا دل ڈوب رہا ہے اور آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا رہا ہے۔“

☆☆☆

”عید مبارک!“

”عید مبارک، سب کو بہت بہت عید مبارک ارے اس قدر حیران بلکہ ڈر کیوں رہے ہیں، میں عالم بالا سے آپ کو عید مبارک نہیں کہہ رہی بلکہ اس دنیا میں ہی آپ سے ماہین عمر مخاطب ہے، اس روز میں بے ہوش ہوئی تھی مری نہیں اور آپ لوگ مجھے مردہ سمجھ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے ناں خیر اس میں آپ کا بھی کیا قصور ہے جاری کمزور، ڈری بزدل پرسکون خوشحال زندگی کو رستی عوام سے ایسا ہی کرنے کی توقع رکھی جاسکتی ہے کوئی بھی اپنی روکھی زندگی کو مزید روکھا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا، آئی انڈاسٹینڈ۔“

”اس روز میں بچ کیسے گئی، بتاتی ہوں بتاتی ہوں صبر کیجئے (چھری نیچے دم لینے کا محاورہ نہیں بولوں گی اپنے حکمرانوں کے ہاتھوں ہم سب آگے ہی چھری تلے ہیں)، مختصر عرض کروں گی کیونکہ آج شادی کے بعد پہلی عید ہے اور عمر کے کچھ جاننے والے ہماری جانب مدعو ہیں اور پھر دوپہر کو ہمیں گاؤں بھی روانہ ہونا ہے اس لئے کافی مصروف ہوں لیکن اتنی مصروفیت کے باوجود میں آپ کو کیسے بھلا سکتی ہوں آپ نے واقعی میرا بڑا ساتھ دیا قارئین ہو تو ایسے یہ مختصر عرض ہے اور تو کیا۔“

جس وقت میں بے ہوش ہوئی عمر نے اسی وقت کمرے میں اینٹری دی اور پھر بوکھلا کر جلدی سے ڈاکٹر بلا لائے ڈاکٹر ڈاکٹر نہیں بھئی دراصل اس روز انہوں نے مجھے منانے کے لئے آفس سے چھٹی کر لی تھی اصل میں سوئی کے چکر میں یہ آپ پر واضح نہیں ہو پایا کہ عمر میرا خیال اور محبت کرنے والے شوہر ہیں اب وہ مجھ سے اتنے بھی لا پرواہ نہیں تھے جتنے مجھے سوئی کی وجہ سے نظر آتے تھے میں بھی سوئی سے پر خاش کھانے کی بناء پر اپنے بے ان کی الفت کو نظر انداز کیے ہوئے تھی خیر ڈاکٹر نے میرا ہلکا پھلکا چیک اپ کرنے کے بعد کسی فلم یا ڈرامے کے ڈاکٹر کے کردار کے مطابق وہی خوشخبری سنائی جسے سن کر ہیر و خوشی سے پاگل اور ہیروئن بغیر اکیسپریشن کے شرمائے لجائے جاتی ہے۔

”آپ سمجھ گئے ناں (آپ تو بہت سیانے ہیں میری طرح) ہم اللہ کی مہربانی سے دوسرے مہینے ہونے جا رہے ہیں وہ جو میں آپ سے کہتی تھی ناں کہ طبیعت بو بھل اور ست ہے تو اسی وجہ سے، خیر مبارک۔“

چند دنوں میں امی بھی میرے پاس رہنے کو آ رہی ہیں ڈاکٹر نے ہر قسم کے سفر پر پابندی لگا دی ہے عمر نے ایک کل وقتی ملازمہ کا انتظام بھی کر دیا ہے اور سب سے بڑی حیرت ناک بات جسے سن کر آپ بیک وقت حیران اور خوش ہوں گے یہ کہ اگلے روز میرے سر صاحب عمر سے فون پر میری طبیعت کی خرابی کا سن کر چلے آئے اور جاتے جاتے عمر نے رونی صورت بنائے سوئی کو ان کے حوالہ کر دیا یہ کہتے ہوئے کہ ”ماہین کی طبیعت ٹھیک نہیں ملی سے ویسے بھی الرجی ہے آپ اسے ساتھ لیجئے اور اس کا خیال رکھنے کی بے شمار تاکیدیں کر ڈالیں، عمر نے میرے لئے چاند رات کو خوب عید کے حوالے سے شاپنگ کی

اسی خوش میں جوش میں آ کر میں جوان کا اداس چہرہ دیکھ کر ذرا افسردہ بھی اور بہلاتے ہوئے کہا کہ جب میری طبیعت سنبھل جائے گی تو وہ سوئی کو گاؤں سے واپس لے آئے گا کہنے پر بولے کہ محض میری وجہ سے نہیں بلکہ سوئی کو بھی اس ماحول کو بدلنے کی ضرورت تھی اصل میں گاؤں میں ابا میرے سر جی نے ایک پالتو بلا پال رکھا ہے (باپ بیٹے کی ایک سی عادتیں ہیں) اور میں اپنی محبت اور اداسی کی وجہ سے سوئی کے جیلی تقاضوں کو تو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا یہ اس پر ظلم ہوتا اور روز محشر مجھ سے جواب دہی اب جب ہماری اور سوئی کی میلی بڑھ جائے گی تو میرے بچے سوئی کے بچوں کے ساتھ خوب مل جل کر رہیں گے تمہاری طرح انہیں بلی کی الرجی میں مبتلا نہیں ہونے دوں گا۔

”اوہ تو۔“ آپ کی طرح میں نے بھی یونہی سر پکڑ کر کہا تھا۔

☆☆☆

## ہماری مطبوعات

قواعد و ضوابط مولوی عبدالحی

انتخاب کلام میر

مادہ مجتہد قندتہ اللہ شہادہ

تیاخذہ

نام داجہ { ریسرچ احمد جعفری

رام طبع نمک

اسلام کے معارف و ادب میں سید امجد جعفری

میرا دلچسپ کائنات: میوزک الیو

لاہور الیو { سید امجد جعفری - لاہور



## پرچمائیاں

طیبہ ہاشمی

پاکستان کی تقسیم یوں تو بہت سے مسلمانوں کے لئے ایک خوش آئند پیغام لائی تھی مگر وہیں اس تقسیم نے کچھ ایسے کرداروں کو جنم دیا یا یوں کہہ لیں کہ کچھ کرداروں کی راہ اس طرف موڑ دی جہاں صرف تباہی تھی۔

میں راشدہ انصاری، سیالکوٹ کے ایک نواحی گاؤں میں واقع ایک سکول کی ہیڈ مسٹریس ہوں، زندگی میرے لئے بھی پل پل مرنے کا دوسرا نام ہے، ہاتھوں میں تیلیوں کی طرح آئی خوشیاں اچانک پھر کر کے اڑ جائیں اور زمانے بھر کی تمام مایوسیاں سمٹ کر دروازے میں آن کھڑی ہوں تو زندگی کسی طور جینے کے قابل نہیں رہتی، لیکن پر بھی زندہ رہنا پڑتا ہے۔

یہ تقسیم پاکستان سے تقریباً 64 سال بعد کا زمانہ ہے اک زمانہ ہو چلا ہے پاکستان کو وجود میں آئے مگر وہ لوگ جنہیں اس تقسیم نے راہ کی دھول بنا دیا وہ آج بھی وہی خاکے سر پر ڈالے الم نائیوں کی تصویر بنے ہیں۔

یہاں میں جس شخص کا ذکر کرنے جا رہی ہوں دراصل وہ اس دنیا کا ایسا چلتا پھرتا کردار ہے جو دیکھنے میں لوگوں کو ایک پاگل اور دیوانے کے علاوہ کچھ نہیں لگے گا، گندے اور پٹھے ہوئے کپڑوں میں ملبوس، بڑھی ہوئی داڑھی، لینے لینے اچھے بھرے بال، ناخنوں میں اندر تک دھنسی ہوئی منی، یوں کہہ لیں کہ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بھی نارمل انسان رہا ہوگا، یا اس نے کبھی بھی ہوش میں اس دنیا کی خوبصورتی کو محسوس کیا ہے۔

☆☆☆

جہوں و کشمیر کی وادی جو اپنے ہندو راجہ کی بے ایمانیوں کی نذر ہو گئی اور اس کے ہاسی چاہتے ہوئے بھی اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ مل کر نہ جی سکے، اس بے ایمانی کا نتیجہ آج بھی بھارت کو بھگتنا پڑ رہا ہے اب نہ وہ راجہ ہے نہ وہ ریڈ کلف مگر ان کی بے ایمانیوں کی سزا وہاں پر بسنے والے ہر شخص سہہ رہا ہے۔

اس کردار نے پاکستان کے وجود سے آنے سے تقریباً پندرہ سال پہلے جہوں کی حسین وادی میں جنم لیا، وہ وادی جہاں بھی بہاریں گیت گایا کرتی تھیں، شریہ جھرنے اپنی مستیوں میں اچھلتے کودتے اپنی راہ کو اپنے قہقہوں سے سجایا کرتے تھے، جہاں چنار پیار کی گرمی برساتے تھے، وہی وادی اب گولیوں کی جھنکار سے گونجتی رہتی ہے، وہی چنار اب آگ اگلے ہیں، انہی شریہ جھرنوں کا پانی اب سرخی مائل ہو چکا ہے۔

☆☆☆

بشیر فیروز، اونچا لمبا، گندمی رنگت پر اٹھے ہوئے نقوش کا مالک، بچپن میں میں نے اسے دیکھا تھا کیونکہ وہ ہمارے ہی گاؤں کا رہنے والا تھا مگر جب سے میں پڑھائی کی وجہ سے سیالکوٹ شفٹ ہوئی تھی تب سے میں نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا، مست ملنگ بندہ تھا بھی یہاں اور بھی جانے کہاں۔

لیکن جس دن میری شادی تھی پتہ نہیں اچانک وہ کہاں سے آ گیا، میں دلہن بنی ہوئی تھی وہ میرے ابا کے ساتھ کمرے میں آ گیا، بچپن سے میں سنتی آرہی تھی کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے، ابا نے بتایا کہ وہ تمہیں پیار دینے آیا

ہے میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس سے پیار لینے کے لئے سر اس کی طرف جھکایا، پیار دینے کے بعد اس نے ایک روپے کا سکہ میری پگھلی پر رکھ دیا اور بولا۔

”اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا پیسے کی کمی نہیں ہوگی۔“ میں اس کی بات سن کر مسکرا دی اور اس کی طرف دیکھا وہ بہت غور سے مجھے ہی دیکھے جا رہا تھا، ابا بھی قریب ہی کھڑے تھے، جانے اسے کیا ہوا چہرے کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بدل گیا، اس نے ٹیٹھ ڈوگری زبان میں مجھے مخاطب کیا۔ ”تمہارے ماتھے پر شوہر کا سکہ نہیں لکھا۔“ میرا رنگ فق ہو گیا، یہ کیا کہا اس نے میں نے بڑے سہمے ہوئے انداز میں ابا کی طرف دیکھا میری حالت وہ بھانپ گئے، انہیں جیسے غصہ آ گیا کہ وہ تو یہاں اس سے اپنی بیٹی کے مستقبل کے لئے دعا میں لینے کے لئے لائے تھے، وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر باہر لے گئے۔

اور پھر وہی ہوا، میری پیدائشی طور پر ایک پانچ کمرہ گھر جس کی وجہ سے میں لنگڑا کر چلتی تھی، پورا ایک سال میں اس کے ساتھ رہی اور وہی بات جو پہلے دن سے وہ جانتا تھا اسی کو میرے خلاف ہتھیار بنا کر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ یہ میرے ساتھ چلتی ہوئی اچھی نہیں لگتی۔

میں ایک عدد بیٹی لے کر پھر اپنے ابا کی دہلیز پر آن کھڑی ہوئی اس کے دیئے ہوئے سکے نے پیسے کی کمی تو نہ آنے دی مگر پیار اس سے میں پورا سال محروم ہی رہی۔

اس نے یہ سب کیسے جان لیا، مجھے اس بات کا علم نہیں مگر اس نے دوبارہ ملنے کے جتن ضرور کرنے لگی تھی۔

ہمارے گاؤں میں ایک عورت تھی بیگیاں





نام کی تو بہت بوڑھی مگر جو کام ذمے لگا دو بڑی پھرتی سے پورا کرتی تھی اسے میں نے اس کام پر لگا دیا۔

”اس کے بارے میں جان کر کیا کرو گی، وہ تو پاگل ہے جانے کہاں پڑا ہو گا۔“ اس نے پہلے تو مجھے یہ سب کہہ کر ٹالنا چاہا مگر میں بھی بضد تھی۔

”جاننا چاہتی ہوں وہ کون ہے، کیا تم جانتی ہو اس کے بارے میں۔“ میں نے اشتیاق سے پوچھا پھر اس نے بتایا کہ قیام پاکستان کے دوران جموں سے ہجرت کرنے والے قافلوں پر سکھوں نے حملہ کیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے مال باپ بہن بھائیوں کے ٹکڑے کر ڈالے، یہ تو سب دیکھ کر بے ہوش ہو کر گر پڑا مگر جب یہ خوش میں آیا تب سے دیوانوں کی سی حالت ہو گئی ہے، اس کی بھری گرمیوں میں بھی کبیل لپیٹ کر سوتا ہے بلکہ ہر وقت کبیل اوڑھے رہتا ہے آتے جاتے موسموں کی سفاکیوں سے بے نیاز۔

ہوش کے ایوانوں اس پر بند ہو چکے تھے، نیم دیوانوں کی سی حالت میں کچھ نہ کچھ گنگناتا رہتا، دھول اور مٹی سے یوں دور بھاگتا جیسے وہ اس کے اچلتے بچے کو گرد آلود کر دیں گی۔

☆☆☆

اتنے جتن کرنے کے بعد وہ جانے کہاں سے اسے ڈھونڈ کر لائی تھی، وہ دھانی رنگ کا میلا سا کبیل اپنے گرد لپیٹے ہوئے تھا، گزرتے وقت نے بالوں میں چاندی بھری تھی، حلیہ اس کا بہت ہی گندا لگ رہا تھا جیسے نہائے ہوئے ایک زمانہ ہو چلا ہے، میری طرف دیکھ کر پہلے تو وہ مسکرایا پھر دوسرے ہی پل سنجیدہ ہو گیا اور بڑی جانی پہچانی نظروں سے میری طرف دیکھتا ہوا میرے قریب آ گیا اور انہی مخصوص ڈوگری زبان میں بولا۔

”کہاں تھاناں اور وہی ہوا، اپنے ماتھے پر لکھے ہوئے سے ٹکر لو گی تو ایسا ہی ہو گا۔“ میرا رنگ زرد ہو گیا، میری برباد ہوئی زندگی میرے لئے ایک اذیت بن گئی تھی۔

اپنی دھن میں مست سا وہ بیگاں کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور ہولے ہولے اپنے جسم کو کسی خیال کے تحت ہلاتے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ جانے وہ کیوں ٹھیک ٹھیک کہہ رہا تھا، میں نے جواب دے جتنوں سے اسے بلوایا تھا اب سمجھ نہیں آرہی تھی بات کہاں سے شروع کروں اپنے غم کو بھولنے کی سعی کرنی میں پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئی، میرے بولنے کا وہ انتظار ہی نہیں کر رہا تھا۔

”کہانی ختم ہوئی۔“ وہ خود سے گویا تھا۔

”کون سی کہانی، کیا میری۔“ میں نے خود سے سوال کیا۔

”کوئی بات نہیں اس اک نئی کہانی جنم لے گی۔“ وہ پھر پونہ ماہری زبان میں بولا۔

میں اس کی بات پر ٹھٹھک گئی، اب کون سی کہانی، اس کی باتیں بار بار میری برباد ہوئی زندگی کی طرف ہی اشارہ کر رہی تھیں، اس کی باتوں میں کتنی سچائی ہوتی ہے، اتنا تو میں جان ہی گئی تھی کچھ خاص لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو خدا اپنی طرف سے کچھ خاص علم و ولایت کر دیتا ہے شاید وہ انہی میں سے تھا اس کے پاس دنیا کی آسائش نہیں تھی ہاں مگر کچھ تو تھا جو صرف اسی کے پاس تھا میں بڑی ہمت کر کے اس کی طرف بڑھی وہ اب بھی اپنی رو میں کچھ گنگناتا رہا تھا اور بیگاں پاس کھڑی اس کی حرکتوں سے محفوظ ہو رہی تھی۔

میں جو اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی اس کے لئے خود کو تیار کرنے لگی۔

”پتہ ہے یا پاکستان کو بنے کتنی دیر ہو گئی ہے۔“

”پتہ ہے یا پاکستان کو بنے کتنی دیر ہو گئی ہے۔“

گنگناتے ہوئے ہونٹ یکدم خاموش ہو گئے جیسے اس کے گلے میں سرخمد ہو گئے ہوں، آنکھوں میں تحیر ابھر آیا جیسے وہ مجھے سے اس سوال کی توقع نہیں کر سکتا تھا اس کی آنکھوں میں پھیلی سرخی یکدم گہری ہو گئی، اپنے کبیل کو اپنے گرد جنگ کرتے ہوئے اس نے ایک اچھتی نگاہ اپنے اس ہاتھ پر ڈالی جو گنگناتے سے مسلسل حرکت میں رہتا تھا۔

”جتنا عرصہ ہوا مجھے برباد ہوئے۔“ بات کرتے ہوئے اس نے سرسری سا میری طرف دیکھا لیکن اس کے دیکھنے میں اتنی قیامت تھی کہ میں لرز گئی، اس کا غم اپنے غم سے بہت بڑا بہت عظیم لگا مجھے، وہ ابھی تک اسی واقعہ کے زیر اثر تھا جو 64 سال پہلے گزرا تھا۔

وقت گزر گیا تھا مگر اس کی تباہ کاریاں ابھی بھی اس کی آنکھوں کے گوشوں میں قید تھیں، وہ تلواریں جنہوں نے اس کے خاندان کو کاٹا تھا وہ ابھی بھی نشتر بنی اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی تھیں، آنکھوں کے کناروں پر ڈولتا سرخ سیال کسی بھی وقت باہر اُڑ سکتا تھا۔

گزرے وقت نے ابھی تک اس کے زخموں کو مرہم نہیں بخشا تھا بلکہ یوں کہہ لیں کہ انہیں مزید کرید تھا۔

”بہت تکلیف دے ہوتا ہے ناں کسی اپنے کو مرتے دیکھنا۔“ میں نے اپنے سینے کو شش کی تھی کہ شاید اس کے اندر تہہ در تہہ جی اس برف کو پگھلا سکوں جس نے اس کی ہستی کو منجمد کر رکھا تھا۔

وہ دوبارہ میری بات پر چونکا اور جیسے کچھ سوچنے لگا، وقت گزرے درتوں کو اپنی سوچ سے الٹ پلٹ کر رہا تھا وہ خاموش تھا شاید وہ پتا تلاش کر رہا تھا اس کی آنکھیں غم تھیں، وقت کی لگائی چوٹ پر سے ہولے ہولے گرد سر کی تھی، وہ اپنے

اور پھر جب ہوش کے ایوان کھلے تب منظر بدل چکا تقسیم ہو چکی تھی جسم کی بھی اور ملک کی بھی مگر اس تقسیم کی زد میں آئے ٹکڑے چاہے وہ جسم کے تھے یا ملک کے دونوں ہی لہو لہاں تھے ان ٹکڑوں سے برستا خون 64 سال بعد اس کی آنکھوں سے رواں ہو گیا تھا چوٹ ہی اتنی گہری تھی، زخم ہی ایسا ملا تھا جس میں پیپ پڑ گئی تھی اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی وہ زخم رس رہا تھا کوئی مرہم کوئی دوا کام نہ آئی۔

دنیا کے نقشے پر ہندوستان کا نقشہ ہی بدل گیا اور اس بدلے ہوئے نقشے نے ہر انسانی سوچ کو بدل ڈالا مگر وہ لوگ جو اپنے اپنے دلوں میں اس واقعہ کی گھناؤنی تصویر بسا چکے تھے ان کے ذہن وہیں اسی دھول میں اور مٹی میں اٹے ہوئے تھے جو ہجرت کرتے وقت راہ نے ان کے سروں میں ڈالی تھی۔

بھگی پگلوں کے ساتھ اس نے میری سمت دیکھا اور پھر کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ کون کہتا ہے کہ وہ پاگل ہے وہ تو بس اس پاگل پن کے لبادے میں اپنے دکھ کو چھپائے رکھتا ہے۔

بھلے ہی 64 سال ہونے کو آئے گزرتا وقت جسمانی لحاظ سے اپنے اثرات اس پر مرتب کرتا رہا مگر ذہنی طور پر وہ وہیں اٹکا ہوا تھا، وہ ان پرچھائیوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا کیوں کہ گزری یادیں آسیب کی طرح ہوتی ہیں بھی نہ پیچھا چھوڑنے والی۔

میں نے اک سرد آہ بھری اس کا اپنے بارے میں کہا ہوا جملہ یاد آ گیا۔

”کوئی نئی کہان جنم لے گئی اور میں سوچ رہی ہوں بھلا اب کون سی کہانی جنم لے سکتی ہے۔“

☆☆☆



بھی ہوتی ہے، جس گھر میں ایک دفعہ طبلہ یا گھنگھروں بج گئے، اس گھر کے سامنے ایک نہ ایک دن دوا لے اور قرتی کا ڈھول بجنا لازمی ہے وہ گھر اجڑے ہی اجڑے، اسے میری وصیت جانو۔“

وصیت کے احترام میں میاں احسان الہی اس مترنم نحوست کا اہتمام عاجز کے گھر کرواتے تھے، لیکن الحمد للہ مرحوم کی پیشین گوئی کے مطابق ہمارے گھر کے سامنے بھی قرتی کا ڈھول نہیں بجا، کسی بھی گھر کے سامنے نہیں بجا، جب کہ اس عرصے میں ہم نے (کرائے کے) نو گھر تبدیل کیے۔

میاں احسان الہی اپنے گھر میں موسیقی صرف تین صورتوں میں جائز و مباح سمجھتے تھے، اول ”گانے والی زندہ حالت میں نہ ہو، مطلب یہ کہ گانے کا صرف ریکارڈ یا ٹیپ ہو، دوم ان کے گھر میں گانے والا بالکل تنہا گائے، یعنی نہ طبلے کی سنگت ہو اور نہ ان کے علاوہ کوئی اور سننے والا موجود ہو، نیز یہ اندیشہ نہ ہو کہ گانے کے بول سمجھ میں آجائیں گے، یعنی راگنی پکی ہو، سوم گانے والے کو داد کے سوا کچھ اور نہ دینا پڑے، مطلب یہ گانے والی فی سبیل اللہ گلوکاری کرے، مرزا کہتے ہیں ان پاکیزہ شرائط و قیود کے ساتھ جو شے ظہور میں آئے گی وہ والد مرحوم کی وصیت تو ہو سکتی ہے موسیقی ہرگز نہیں۔

افشاں زینب، شیخوپورہ

### واحد منزل

انسان ہمیشہ تبدیلی کی خواہش رکھتا ہے، اس دنیا میں کچھ ایسا اچھا نہیں جو ہمیشہ رہ سکے، تعلیم، ملازمہ، بیوی، بچہ، گھر، ہم ان منزلوں کے سہارے زندہ رہتے ہوئے بھی تبدیل کے خواہاں رہتے ہیں اور بڑھاپے کو جا پکڑتے ہیں، جہاں پہنچ کر آخری ایک ہی منزل رہ جاتی ہے، موت! ساری منزلوں کی واحد منزل۔ ☆☆☆

کتنی مبارک ہے وہ زندگی جو تیرے وجود میں شعلہ زن ہے، خدا کی قسم! میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ انسان ایسی لطیف ایسی نادر اور ایسی بے بہا چیزوں کو بے جان اور زائل ہو جانے والی دولت کے بدلے کیسے فروخت کر سکتا ہے۔“ (خلیل جبران)

فرح راؤ، کینٹ لاہور

### برسات

اک رات ہوئی برسات بہت  
میں روئی ساری رات بہت  
ہر دم تھارے مانے کا لیکن  
میں تنہا ہی اس رات بہت  
پھر آنکھ سے ایک ساون برسا  
جب سحر ہوئی تو خیال آیا  
وہ بادل کتنا تنہا تھا  
جو برس ساری رات بہت

نبیلہ نعمان، گلبرگ لاہور  
آتش اور سمندر

ریت گھر وندے، ابرو باد کی سازش اور سمندر  
دونوں آئینے سامنے تھے، کل آتش اور سمندر  
کوئی مجھے تفصیل بتائے لہروں اور بوندوں کی  
میں صحرا سے دیکھ رہا ہوں بارش اور سمندر  
پیار بھرے دریا، ساگر سے گہرے ہو جاتے ہیں  
عشق بغیر نہیں ملتی گنجائش اور سمندر  
شاہینہ یوسف، عمرکوٹ

### وصیت

فون پر سارنگی سنوانے کا قصہ یہ ہے کہ ان  
کے والد مرحوم حاجی محمد یعقوب صاحب اپنے گھر  
میں، تاش پر پرانی عورتوں کے فونو (مراد  
ایکٹرسوں سے تھی) اور پاندان رکھنے کے خلاف  
تو تھے ہی گانے کی محفل کے بھی روادار نہ تھے۔  
”بیٹا جی! موسیقی حرام تو ہوتی ہے، منحوس

گے جبکہ دیگر لوگ حساب کی سختی میں مبتلا ہوں گے۔“

نوشین اقبال نوش، گاؤں بدرمرجان

### اقوال زریں

☆ خوشی وہ ہے جس کا اعتراف دشمن بھی  
کریں۔

☆ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس کا انجام  
ضرور سوچ لو۔

☆ زندگی کو سادہ اور خیالات کو بلند رکھو۔

☆ مسکراہٹ خوب صورتی کی علامت ہے۔

☆ جاہل، دماغ سے زیادہ زبان استعمال کرتا  
ہے۔

☆ زندگی کے جواز تلاش نہیں کیے جاتے، صرف  
زندہ رہا جاتا ہے، زندگی گزارتے چلے جاؤ،  
جواز مل جائے گا۔

☆ فرحین ملک، دھوریہ

انداز نظر

ایک شخص اپنے کھیت میں کھدائی کر رہا کہ  
اسے سنگ مرمر کی خوب صورتی مورتی نظر آئی وہ  
اسے لے کر ایک ایسے شخص کے پاس گیا جو پرانی  
چیزوں کا دل و جان سے عاشق تھا، اس نے ایک  
خطیر رقم دے کر وہ مورتی خرید لی اور دونوں اپنی  
اپنی راہ چلے گئے، بیچنے والا گھر جاتے ہوئے اپنے  
دل میں کہہ رہا تھا۔

”کتنی جان اور کتنی زندگی ہے اس دولت  
میں، سچ مچ بڑی حیات ہے کہ عقل مند انسان اتنی  
بڑی رقم ایک گونگے اور بے جان پتھر کے ٹکڑے  
کے عوض کیسے دے سکتا ہے، جو ہزاروں برس سے  
زمین میں دبا پڑا ہو، جو کسی کے خواب و خیال میں  
بھی نہ آیا ہو۔“

اور عین اسی لمحے خریدنے والا مورتی کو غور  
سے دیکھتا جا رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا۔  
”کتنا مقدس وہ حسن جو تجھ میں ہے اور

جواہر پارے

☆ آپ جنہیں بیوقوف سمجھ رہے ہوتے ہیں وہ  
دراصل آپ کی حرکتیں نظر انداز کر رہے  
ہوتے ہیں۔

☆ یقین کے ساتھ سوتے رہنا، شک کے ساتھ  
نماز پڑھنے سے نہیں بہتر ہے۔

☆ بعض لوگ انڈوں کی طرح ہوتے ہیں ان  
میں کسی اور کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

☆ ہزار دوستوں کی دوستی ایک شخص کی عداوت  
کے بدلے نہ خریدو۔

☆ چہرے نہیں روئے اجنبی ہوتے ہیں۔

☆ مارنا ہے تو جڑ پر مارو شاخیں خود بخود گر جائیں  
گی۔

☆ ناہید غفور، گنگاپور

### سوچنے کی بات

زندگی میں ایسے مقام بھی آتے ہیں۔  
جب بیوقوفی بہتر ہوتی ہے عقلمندی سے۔  
جھوٹ بہتر ہوتا ہے سچ سے۔  
سونا بہتر ہوتا ہے چاگنے سے۔  
بے ہوشی بہتر ہوتی ہے ہوش سے۔  
بولنا بہتر ہوتا ہے خاموشی سے۔  
یہ بہت مشکل مراحل ہوتے ہیں، خدا کی  
پناہ!

مہوش ملک گنگاپور

### توبہ کے تین انعامات

حضرت سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ  
تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رحمت اللعالمین صلی  
اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان عالی شان ہے کہ۔  
”توبہ کرنے والے جب اپنی قبروں سے  
نکلیں گے تو ان کے سامنے سے مشک کی خوشبو  
پھیلے گی، وہ جنت کے دسترخوان پر آکر اس میں  
سے کھائیں گے اور وہ عرش کے سائے میں ہوں



# بیاض

تسليم غلام

قرۃ العین رائے ---- شیخوپورہ  
میں کسی اور سے مانگوں یہ میرے مزاج کے خلاف ہے  
تو اپنے سے خلی لٹا دے یہ تیرے عاجز کے خلاف ہے  
صبح تو شام آخر یہ سب زمان و مکاں کا چکر ہے  
کائنات بھر جلے یہ بات تیرے ہونے کے خلاف ہے  
حمیرا باب چندا ---- سرگودھا  
جس دلیں کو سینے لاکھوں جوانوں کا لہو  
اس سر زمین کو بھی زوال نہ ہو  
پنج دریاؤں سے مل کر بنا ہے پاکستان  
یہ دھرتی ہے ایسی جس کی کوئی مثال نہ ہو  
زمین بٹ ---- گوجرانوالہ  
بارش کی رم جھم جدائیوں کا موسم ہے  
منتظر نگاہوں میں پانیوں کا موسم ہے  
خواب بن کر آنکھوں میں کوئی نہیں آئے گا  
ان جزیروں میں اب رتجوں کا موسم ہے

تو نے نفرت سے جو دیکھا تو مجھے یاد آیا  
کتنی چاہت تیری خاطر یونہی توڑ آئی ہوں  
کتنے دھندلے ہیں یہ چہرے جنہیں اپنا پایا  
کسی اجلی تھیں وہ آنکھیں جنہیں چھوڑ آئی ہوں  
کنول فریاد حسین ---- جلالپور جٹاں  
اپنی مٹی پہ جلنے کا ہنر سیکھو  
سنگ مرمر پر چلو گے تو پھسل جاؤ گے

اک مکمل خواب کی  
ادھوری تعبیر ملی ہے ہم کو  
بانی سوچتا ہو گا کہ  
میرے وطن کو یہ کیا ہو گیا  
مریم غزل ---- جلالپور جٹاں

کوئی یاد کوئی بات کوئی راز ہو تم  
میری سانس، میری سوچ، میری آس ہو تم  
آنکھوں کے پاس نہیں نہ سہی  
ہاں مگر دل کے بہت پاس ہو تم !  
لگتا نہیں کہ ساتھ نبھائے دیر تک  
لیکن وہ مجھے بھول نہ پائے گا دیر تک  
جو بھی قریب آئے گا اس کے اسے ضرور  
وہ میری داستان سنائے گا دیر تک  
کبھی آکر مجھ سے مل، میرا حال مجھ سے پوچھ  
غیروں کے کہنے سننے پہ یوں بدگماں نہ ہو  
تسليم چوہدری ---- میرپور آزاد کشمیر  
یہ میرا ہنر تیری خوشبوؤں سے وابستہ  
میرے سارے لفظوں پر تیری حکمرانی ہے

یہ خواہش تھی کہ ہم کچھ دور تک تو ساتھ چلتے  
ستاروں کا مگر کوئی اشارہ ہی نہیں ہے  
بہت سے زخم کھائے، دل نے آخر طے کیا ہے  
تمہارے شہر میں اپنا گزارا ہی نہیں ہے  
عائشہ مصطفیٰ ندیم ---- لاہور  
ریت کا آشیانہ بنا کر توڑ دیا ہم نے  
کہ دلوں کو بھی لوگ یونہی توڑا کرتے ہیں

کبھی کبھی زندگی آنسو دے جاتی ہے  
غم دے کر خوشیاں ساتھ لے جاتی ہے  
ٹوٹ کر چاہا جس کو بھی چاہا میں نے  
میری یہ عادت ہر بار عذاب دے جاتی ہے

کچھ سوال ادھورے ہی رہنے دو  
کچھ خواب ادھورے ہی رہنے دو  
زندگی بھر ساتھ چلنا چاہو تو چلو پر  
تدموں کے نشاں ادھورے ہی رہنے دو  
شاہزیہ چوہدری ---- شیخوپورہ  
بانی میں عکس دیکھ کر خوش ہو رہی تھی میں  
پھر کسی نے پھینکا تو منظر بدل گیا  
عکس خوشبو ہوں نہ بکھرنے سے روکے کوئی  
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی  
کبھی چھپانے سے چھپتا ہے دل کا حال کہیں  
ہر ایک بات کی کرتا ہے مجھری چہرہ  
تصویر العین ---- اوکاڑہ  
پلکوں کے بند ٹوڑ کے دامن پر آگرا فراز  
اک آنسو میرے ضبط کی ٹوہین کر گیا

چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے  
پیر کرتا ہے تو آ جاتے ہیں آریے لے کر  
نورین الطاف ---- نیورا جوہندی باغاں  
گلاب کے پھول بھی کسی موسم میں کھلا کرتے ہیں  
پچھڑے ہوئے لوگ قسمت والوں موٹا کرتے ہیں  
وہ شخص کیوں ملا جس نے پچھڑ جانا تھا  
وہ پیار کیوں کیا جس نے ٹوٹ جانا تھا

اے دوست اب لوٹ آ تجھے میری قسم  
کہ تیرے بنا یہ دل دیران ہے  
ناہید غفور ---- گنگاپور  
تیری کج ادائی سے ہار کے، شب انتظار چلے گئے  
میرے ضبط حال سے روٹھ کر، میرے غمگسار چلے گئے  
نہ سوال وصل، نہ عرض غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں  
تیرے عہد میں دل زار کے کبھی اختیار چلے گئے

جن کو چھو لے زمین افلاک نہیں ہو سکتے  
جو ستارے ہوں بھی خاک نہیں ہو سکتے  
جب بھی چاہے تو بدل دے کسی اور کی خاطر  
ہم تیرے جسم کی پوشاک نہیں ہو سکتے  
جن ناؤ کو سمندر پناہ دے دیں  
ان کے ڈوبنے کو کنارہ بہت ہے  
مہوش ملک ---- گنگاپور

دل وفا کا امین ہوتا ہے  
زخم تازہ ترین ہوتا ہے  
ہار کر بھی وہ جیت جائے گا  
اس کو پختہ یقین رہتا ہے  
مجھ کو کنارے کی کب تمنا  
تجھ کو ہے دریا کے پار جانا  
ہم شجر تھے شجر ہی رہے  
وہ بدلتا رہا موسموں کی طرح

بات تو عام سی ہے لیکن اتنی بھی عام نہیں  
سب کو خوشیاں مل جاتی ہیں میرا حصہ کھو جاتا ہے  
ناصر حسن ---- خانیوال  
سدا ہے جکڑے قسمت کی جو زنجیروں میں  
ہمارا نام بھی شامل ہے ان اسیروں میں  
وہ جس کے ساتھ کی خواہش اڑاں بھرتی ہے  
اسی کا نام نہیں ہاتھ کی لکیروں میں

اس شہر میں ایسی بھی قیامت نہ ہوئی تھی  
تنہا تھے مگر خود سے تو وحشت نہ ہوئی تھی  
اب سانس کا احساس بھی اک بار گراں ہے  
خود اپنے خلاف ایسی بھی بغاوت نہ ہوئی تھی  
سعدیہ وہاب ---- سرگودھا  
بہت بے چین رہتی ہے طبیعت ایک مدت سے  
دل و جان کو نہیں مل پائی راحت ایک مدت سے  
بہت مجبور ہوں ورنہ بہت محسوس کرتا ہوں



میری جاں تم سے ملنے کی ضرورت ایک مدت سے

محبت کا اثر ہو گا غلط فہمی میں مت رہنا  
وہ بدلے گا چلن اپنا غلط فہمی میں مت رہنا  
تمہارا تھا، تمہارا ہوں، تمہارا ہی رہوں گا میں  
میرے بارے میں اس درجہ غلط فہمی میں مت رہنا  
عاصمہ سلیم

آپ دل میں میرے قیام کریں  
گھر میں تو سب قیام کرتے ہیں

جو موتیوں کا طلب نے کبھی اداس کیا  
تو ہم بھی راہ سے منکر سمٹ لائے بہت  
وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت  
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت  
سیدہ نسبت زہرا

رت بدل رہی ہے جیون سراب ہے  
آنکھوں میں ایک بار پھر ہوا کا خواب ہے  
ڈھونڈ رہی ہے رہنمائی اک ہمسفر شام و سحر  
کتنا کٹھن تنہائی کا عذاب ہے

بہت پہلے سے ان کے قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں  
مجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں  
طبیعت اپنی گھبرائی ہے جب سنان راتوں میں  
ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں  
نبیلہ طارق

جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو  
اے جان جہاں یہ کوئی تم سا ہے کہ تم ہو  
یہ عمر گریزاں کہیں ٹھہرے تو یہ چالوں  
ہر سانس میں مجھ کو ہی لگتا ہے کہ تم ہو

میرا سارا سفر اس کی خوشبوؤں میں کٹا  
مجھے تو راہ دکھائی تھیں چاہئیں اس کی  
میں بارشوں میں جدا ہو گئی اس سے مگر  
یہ میرا دل، میری سانسیں، امانتیں اس کی

افشاں اشرف  
توڑ دے ہر اک آس کی ڈوری آسوں میں کیا رکھا ہے  
عشق محبت باتیں ہیں سو باتوں میں کیا رکھا ہے  
قسمت میں جو لکھا ہے، وہ آخر ہو کر رہتا ہے  
چند لکیریں ابھی سی اور ہاتھوں میں کیا رکھا ہے

وفا کا نام بھی زندہ ہے، میں بھی زندہ ہوں  
اب اپنا حال سنا مجھ کو بے وفا میرے

مجھ سا جہاں میں کوئی نادان بھی نہ ہو  
کر کے جو عشق کہنا ہے نقصان بھی نہ ہو  
رونا یہی تو ہے اسے چاہتے ہیں ہم  
سعد جس کے ملنے کا امکان بھی ہو  
شازیہ نواب

وہ پاس تھا تو اس حیات کے عنوان تھے بہت  
خوش رہنے اور بننے کے سامان تھے بہت  
جدا ہوا تو دل مطمئن کا اطمینان نہ گیا  
مجھ خوش فہم کو پلٹ آنے کے گمان تھے بہت

کوشش کے باوجود بھی تو بھولتا نہیں  
تیرے بغیر کیا کروں کچھ سوچتا نہیں  
ہوئی ہے صبح و شام مگر اس کے باوجود  
ہے چاند تیری یاد کا جو ڈوبتا نہیں

یوں ہی امید دلاتے ہیں زمانے والے  
لوٹ کر کب آتے ہیں جانے والے  
تو نے دیکھا ہے بھی صحرا میں جھلتا ہوا درخت  
اس طرح جیتے ہیں دفاؤں کو نبھانے والے  
علینہ طارق

اتنی آزادی نہ رہے حد سے گزر جاؤں نہ میں  
اڑتے اڑتے ان فضاؤں میں ہی مر جاؤں نہ میں  
اک نظر نفرت سے مجھ کو دیکھنے والے کہیں  
آنکھ کے رستے ترے دل میں اتر جاؤں نہ میں

کب پاؤں فگہ نہیں ہوتے کب سر میں ڈھول نہیں ہوتی  
تری راہ میں چلنے والوں سے لیکن کبھی بھول نہیں ہوتی  
ہر رنگ جنوں ٹھہرنے والو، شب بیداری کرنے والو  
ہے عشق وہ مزدوری جس میں محنت وصول نہیں ہوتی

میری بزم دل تو اجڑ چکی، میرا فرش جاں تو سمٹ گیا  
بھی جا چکے میرے ہم نشین، مگر ایک شخص گیا نہیں  
غم زندگی تیری راہ میں شب آرزو تیری چاہ میں  
جو اجڑ گیا وہ بسا نہیں، جو پکھڑ گیا وہ ملا نہیں  
افشاں زینب

ہوا چلی تو خوشبو میری بھی پھیلے گی  
میں چھوڑ آئی ہوں درختوں پر اپنے ہاتھ کے رنگ  
میرے خوابوں کے گلشن میں خزانیں قفس کرتی ہیں  
میرے ہونٹوں کی گزشتہ میں وفا کی قفس کرتی ہیں  
مجھے وہ لاکھ تر پائے مگر اس شخص کی خاطر  
میرے دل کے اندھیروں میں دھما میں قفس کرتی ہیں

بے اختیار وقت پر جھنجھلا کے رو پڑے  
کھو کے بھی اسے تو بھی پا کے رو پڑے  
خوشیاں ہمارے پاس کہاں مستقل رہیں  
باہر بھی بنے بھی تو گھر آ کے رو پڑے  
شاہینہ یوسف

م کو احساس ندامت ہو تو بس اتنا کرنا  
ہر اس طرح سے نہ کسی اور کو رسوا کرنا

پہلے تو بارشوں میں بدن بھگتا تھا  
پھر اس کے بعد ٹوٹ کے نیند آ گئی مجھے

کیسے زندہ ہیں ان سازشوں کے موسم میں  
ب کوئی خواب نہیں خوابوں کے موسم میں  
سے مجھ سے محبت بھی اس طرح کی جیسے  
ملی سی دھوپ ہو بارشوں کے موسم میں  
بہ نعمان

خود کو سبز ہی رکھا آنسوؤں کی بارش سے  
ورنہ ہجر کا موسم کس کو راس آتا ہے

اسے بارشوں نے چرا لیا کہ وہ بادلوں کا مکین تھا  
بھی مڑ کے یہ بھی تو دیکھتا کہ میرا وجود زمین تھا  
کبھی ساحلوں پر پھریں گے تو ہمیں سپیل ہی بتائیں گی  
میری آنکھ میں جو سمٹ گیا وہ شخص سب سے حسین تھا  
فرحین ملک

سفر یہ نکلے تو سامنے وہی تھا دریا، وہی گھرے تھے  
ہماری قسمت میں یہ ہجر کی بیشکی کب تک رہے گی

لب خاموش چشم خشک کیا سمجھائیں گے تجھ کو  
جو بارش دل میں ہوتی ہے جو دریا دل میں بہتا ہے  
مجھے تجھ سے جدا رکھتا ہے اور دکھ تک نہیں ہوتا  
میرے اندر تیرے جیسا یہ آخر کون رہتا ہے

خلوص کوئی خلوص ہے کو دلوں میں ربط ہم نہیں  
تہیں اعتراف ستم نہیں مجھے اعتبار کرم نہیں  
یہ فقط غرور کی بات ہے کہ زباں سے اپنی تم نہ کہو  
تہیں ورنہ اس کی خفش تو ہے کہ تہلہ بزم میں ہم نہیں  
گلینہ بسم

جو چیز میری ہے اسے کوئی اور نہ دیکھے  
انسان محبت میں بچوں کی طرح سوچتا ہے

اپنے چہرے پہ خوشی سجا کے رکھیں گے  
ہر ایک سے درد اپنا چھپا کے رکھیں گے  
شاید کسی روز آ جائے وہ کچھ مانگنے  
اسی واسطے زندگی یہ بچا کے رکھیں گے

پھول وفا کے کھل سکتے تھے  
دل کے زخم بھی سل سکتے تھے  
تم نے چاہا ہی نہیں ورنہ  
ہم دونوں یہاں مل سکتے تھے  
☆☆☆



پیشہ ورانہ اخلاق

ہندو پریس میں ایک خبر چھپی کہ کل شام جب مہاتما گاندھی برلا مندر میں پراٹھنا کر رہے تھے تو وہاں ایک بڑا سانپ نکل آیا تھا، اس بات کو مہاتما جی کی عقیدت مندانہ کرامت اور روحانی فضیلت کے طور پر خوب اچھالا گیا، یہاں تک کہ ایک پریس کانفرنس میں ایک ہندو صحافی نے قائد اعظم کو بھی گھیرا۔

”سر! مہاتما جی کی پراٹھنا میں ایک سانپ کے عقیدت مندانہ آنے کی خبر آپ نے پڑھی ہو گی؟“

قائد اعظم نے جواب دیا۔

”جی ہاں، پڑھی ہے۔“  
”تو آپ کا کیا خیال ہے، ایسا ہو سکتا ہے کہ سانپ آئے اور مہاتما جی سے کچھ تعرض نہ کرے؟“

”جی ہاں، یہ بھی ممکن ہے۔“ قائد اعظم نے اطمینان سے جواب دیا۔

صحافی نے حیرت سے کہا۔  
”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یعنی کیسے؟“  
”پیشہ ورانہ اخلاق کی بات ہے۔“ یہ کہہ کر قائد اعظم آگے بڑھ گئے۔

کنول فریاد حسین، جلاپور جٹاں قدر

ایک نئی نویلی دلہن نے اپنے دوست سے کہا۔  
”واقعی لوگ درست کہتے ہیں، شادی کے بعد عورت کی قدر نہیں رہتی، اب یہی دیکھ لو جب

سے شادی ہوئی ہے اسلم نے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔“

سہیلی نے تشویش سے پوچھا۔  
”پھر تو تمہیں اسلم سے طلاق لینے کے متعلق سوچنا چاہیے۔“

دلہن نے جواب دیا۔  
”لیکن میں اسلم سے طلاق کیسے لے سکتی ہوں، کیونکہ میری شادی اس سے ہوئی ہی نہیں۔“

ثناء حیدر، ملتان

نہلے پہ دھلا

مریض ہاسپٹل میں نرس سے کہتا ہے۔  
”I love you“ تم نے میرا دل چرا لیا ہے۔“

نرس آگے سے کہتی ہے۔  
”چل جھوٹے ہم نے دل نہیں گردہ چرا لیا ہے۔“

فریدہ جاوید فری، لاہور

فیشن

دادی اماں نے فیشن کے شوق سے بال بوائے کٹ کروالیے اور خوشی خوشی اپنی پوتی سے پوچھا۔

”میں ان بالوں میں کیسی لگ رہی ہوں؟“  
”آپ بالکل بھی میری دادی نہیں لگ رہی۔“ بچی نے دیکھ کر جواب دیا۔

”اچھا۔“ دادی اماں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
”تو پھر میں کیا لگ رہی ہوں؟“

”آپ..... آپ بالکل دادا ابا لگ رہی ہیں۔“ معصومیت سے جواب ملا۔

نزمین بٹ، گوجرانوالہ

رونے دو

بچہ کافی دیر سے رو رہا تھا شوہر نے بیوی سے کہا۔

”تم اسے لوری دے کر سلا کیوں نہیں دیتیں؟“

بیوی بولی۔  
”لوری دے کر سلانے لگی کہ پڑوس سے آواز آئی بہتر ہے کہ بچے کو ہی رونے دو۔“

مریم غزل، جلاپور جٹاں

”میری محبت“

وہ روشنی ہے جیسے تم کبھی جھانہ سکو گے

میری محبت

وہ سات رنگ ہے جس کے ایک رنگ کو بھی الگ نہ کر سکو گے۔

میری محبت

وہ اہل حقیقت ہے جسے تم کبھی جھٹلا نہ سکو گے۔

میری محبت

وہ تاریخ ہے جو بار بار داہرے جائے گی۔

میری محبت

میاں، بیوی کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک گدھا کھڑا دکھائی دیا، گدھے کو دیکھ کر شوہر بیوی سے بولا۔

”وہ سامنے تمہارا رشتے دار کھڑا ہے اسے سلام کرو۔“

پہلے تو بیوی نے غصے سے شوہر کی طرف دیکھا، پھر اچانک آگے بڑھی اور مسکرا کر بولی۔

”سلام جیٹھ جی۔“

ناہیدہ غفور، گزنگاپور

مشورہ

ایک صاحب کو ڈاکٹر نے بتایا کہ خطرناک بیماری کے سبب ان کی زندگی صرف چھ ماہ کی رہے گی ہے۔

مریض نے تقریباً روتے ہوئے پوچھا۔  
”ڈاکٹر صاحب! کیا کوئی ایسی ترکیب ہے کہ میری زندگی بڑھ جائے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔  
”ہاں ایک ترکیب ہے یوں کرو کہ اپنی ساری دولت اور جائیداد کو بانٹ دو پھر پانچویں منزل پر ایک فلیٹ خرید لو اور اس کے بعد ایک ایسی عورت سے شادی کر لو جس کے نو بچے ہوں۔“

”اچھا ڈاکٹر صاحب! کیا اس طرح میری زندگی کے دن بڑھ جائیں گے؟“

”نہیں زندگی تو وہی چھ ماہ رہے گی لیکن یہ وقت پھر تمہیں اتنا طویل لگے گا کہ تم ہر روز دعا مانگو گے کہ تم پیدا ہی نہ ہوتے۔“

فرحین ملک، دھوریہ

معصومیت

ایک مشہور سائنس دان ایک بار بس میں سفر کر رہے تھے، سفر کے دوران وہ کچھ کاغذات پڑھنا چاہتے تھے انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی عینک گھر بھول آئے ہیں،

لیطفہ

ابنامہ 341 حنا



”دیکھا تم لوگوں نے ثابت ہوا کہ بھوک

وہوں نے کیا جانا ہے بیدہ اسر کووں کو سرف

booksfree.pk

تم بیٹھو، میں ابھی تمہارے لئے جوس لاتی ہوں۔“

☆☆☆



## میری ڈائری سے

صائمہ محمود

نوشین الطاف: کی ڈائری سے ایک نظم  
تم جاؤ ہم سے دور تو اک کام کر جانا  
پچھ پل اپنے ہمارے نام کر جانا  
اگر آجائے موت تمہارے آنے سے پہلے  
تو آکر میرے جنازے کا احترام کر جانا  
نہرونا اس قدر کہ تکلیف ہو ہمیں  
موت کو بھی مذاق سمجھ کر انجان بن جانا  
میں ایک دن سو جاؤں گی سدا کے لئے  
پھر مجھے بے وفا کہہ کر بدنام کر جانا  
جو گزرو میری قید سے تو نظریں نہ پھیرنا  
مہمان ہی سمجھ کر دعا سلام کر جانا

زار احمد: کی ڈائری سے ایک غزل  
اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا  
رج راحت فزا نہیں ہوتا  
بے وفا کہنے کی شکایت ہے  
تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا  
تم ہمارے کس طرح نہ ہوئے  
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا  
نارسائی سے دم رکے تو رکے  
میں کس سے خفا نہیں ہوتا  
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا  
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا  
کیوں نے غرض معطر ب مومن  
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

حمیرا باب چندا: کی ڈائری سے ایک نظم  
اے مجاہدو! تمہیں کیا خبر تم "اقبال" کی تعبیر ہو  
روشن کرن ہو "قائد" کی تم اور وطن کے واسطے

خاص ہو  
گر مشکل میں ہو تو اٹھاؤ ہاتھ کرو لب سے ذکر  
"رہی" ادا  
بس یہ آسرا تیرے ساتھ ہو بس یہ آسرا تجھے راس  
ہو  
تم لڑو جو راہ اسلام پر اور مانگو مدد اس "غفور" سے  
بے مقرر تیرا کامل رخ اور دشمن کا ستیا ناس ہو  
کرو عزتیں سب بڑوں کی تم اور چھوٹوں کو دو  
شفقت ذرا  
تو میرا راستہ "جنت" کا ہے گزرا تمہیں احساس ہو  
جو وطن میں کرتا ہے خون بہا اور کچلے جو ماؤں کے  
جگر  
وہ ضمیر دل ہو مرا اور زندوں میں مردہ وہ لاش  
ہو

یہ ڈی میرا شدت سے جو کر ملے وقت مرگ  
نہ بھی ہو دولت کی ہو بس نہ کسی کو فکر معاش ہو  
جس نے ماؤں کے پھلنی دل کیئے اور بیٹیاں کیں  
بے آسرا  
اسے انعام میں ملے ہاویہ جو گناہوں کی پاداش ہو  
ہے یہ دعویٰ میرا بڑھ لے اگر ہر انس جو کلمہ حق  
نہ کسی کی خستہ ہو نظر نہ خون جگر کی پیاس ہو  
جس کے ارادے حوصلے ہوں بلند اور وہ دل سے  
سچا مومن بھی ہو  
اس کی آغوش میں کریں تارے رقص اور ہاتھوں  
میں آکاش ہو  
ہو مومن جو اترے وقت جنگ تو وہ توڑ دے دشمن  
کے بند  
چاہے کر بلا کا "حسین" ہو یاں کہ احد کا "معاذ"  
ہو

شاز یہ چوہدری: کی ڈائری سے ایک غزل  
نہ بجھ رہی ہے نہ اب کے بھڑک رہی ہے ہوا  
ہمارے دل کی طرح سے سرخ رہی ہے ہوا  
رکھی ہوئی ہے ہر اک گھر کے حن میں میت  
سو وقتے وقتے سے جیسے سک رہی ہے ہوا  
رکھی تھی شہر کی بنیاد کیسے لوگوں نے  
یہ کون لوگ ہیں جن میں بھٹک رہی ہے ہوا  
سحر کچھ اور تھا اور اب یہ حال باغ کا ہے  
کہ پاؤں رکھتے ہوئے بھی ٹھٹھک رہی ہے ہوا  
بریدہ جانی پہ بھی شہر سانس لیتا ہے  
بہت سے لوگوں کے دل بھی کھٹک رہی ہے ہوا

کنول فریاد حسین: کی ڈائری سے  
"وطن سے اظہار محبت"  
رحمت رب جہاں 14 اگست  
عزم و ہمت کا نشان 14 اگست  
راہ منزلت کا کارواں 14 اگست  
عظمتوں کا کارواں 14 اگست  
ہے یہ منبع ارتقاء فکر کا  
سوچ کی آزادیاں 14 اگست  
مسلم و ہندو الگ قومیتیں!  
اگلی کی داستاں 14 اگست  
قتل و غارت، ظلم و استبداد میں  
پرچم امن و امان 14 اگست  
چار صوبوں سے مزین جسم پاک  
اور ہے روح رواں 14 اگست  
اس پہ پیری کا اثر ہوتا نہیں  
ہر زمانے میں جواں 14 اگست  
لیجے پھر جائزہ کردار کا  
احتساب و امتحاں 14 اگست  
فکر قائد سے ہو کر کوکب نمو  
پھر جہاں جاوداں 14 اگست

شاز یہ اعجاز شازی: کی ڈائری سے ایک غزل

دریاؤں سا گہرا لگا تھا  
جب وہ پہلی بار ملا تھا  
خوشبو خوشبو سا رستا تھا  
جب وہ میرے ساتھ چلا تھا  
اس کی خوشبو کہاں گئی ہے  
رستے میں جو پھول کھلا تھا  
ایک تھکا ہارا سا آنسو  
چاہت کا خاموش صلہ تھا  
کیسے بھلا دوں اس کو ارشد  
وہ تو میرا آئینہ تھا

ماریہ عباسی: کی ڈائری سے یاور عظیم کی ایک غزل  
محبت کا نگر آباد رکھنا  
بلا خوف و خطر آباد رکھنا  
محبت میں کوئی آساں نہیں ہے  
وفا کی رہگذر آباد رکھنا  
شکستہ ہیں در و دیوار اس کے  
بڑا مشکل ہے گھر آباد رکھنا  
نئے افکار سے میرے خدایا!  
مرا شہر ہنر آباد رکھنا  
اداسی کہہ رہی ہے شہر جاں کی  
ہمارے بام و در آباد رکھنا  
تم اپنی جاگتی آنکھوں میں جاناں!  
کوئی خواب سحر آباد رکھنا  
کسی کی یاد میں دن رات یاور!  
دیار چشم تر آباد رکھنا

مریم غزل: کی ڈائری سے ایک نظم  
بے سبب تو نہ تھیں تیری یادیں  
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا  
ضبط کا حوصلہ بڑھالینا  
آنسو کو کہیں چھپالینا  
کانپتی ڈولتی صداؤں کو  
چپ کی چادر سے ڈھانپ کر رکھنا  
بے سبب بھی بھی بھی ہنسنا



جب بھی کوئی ہوا بات تلخی کی  
تو! موضوع گفتگو بدل دینا

عائشہ مصطفیٰ ندیم: کی ڈائری سے ایک غزل  
یونہی بے سبب سڑکوں پہ پھرا نہ کرو  
پھر ہیں راہ میں برہنا پاؤں چلا نہ کرو  
چاہئیں تو مل جاتیں ہیں بہت سی مگر  
صدمہ جان کر سب کو گلے ملا نہ کرو  
رولا میں گئے ہاتھ کے زخم اک دن تم کو  
پھول سمجھ کر ہر بار کانٹے توڑا نہ کرو  
عادتا نہیں میں بات اڑا دیتے ہیں لوگ  
ہر کسی سے یونہی گلے کیا نہ کرو  
شکستہ دلی بجھا نہ دے آنکھوں کے چراغ  
ہر کسی سے دل کے رشتے جوڑا نہ کرو  
بھی تھک جاؤ تم تو واپس گھر لوٹ آنا  
تمہارے ہیں ہم ہمیں غیر سمجھا نہ کرو  
مہوش ملک: کی ڈائری سے ایک نظم  
”بے خبر تو نہیں“

تمہاری یاد کی خوشبو مجھے رونے نہیں دیتی  
کسی درد بھرے گیت کی صورت  
اداسی پھیل جاتی ہے  
”تمہاری یاد“ شام غم میں آنسوؤں کے گلے لگ  
کر

پہروں بیٹھی رہتی ہے  
سانسوں میں جی درد کی وحشت  
بوسیدہ ڈائری میں بچے اجنبی لفظ  
ادھوری رات کا پورا چاند  
تیری یاد کے بستر پر تجھے سونے نہیں دیتا  
پلکوں پہ سجے نوخیز خواب  
بے تلک انتظار میں گم آنکھیں  
تیری ہی کھوج میں رہتی ہیں  
اڑتے بادلوں کے سینے میں بھیگی ہوئی سوچیں  
ہر طرف پھیلی ہوئی، اپنے ہی خول میں کٹی ہوئی

انتظار کی گرد میں پنا ہوئی مدھم تصویریں  
میں چاہوں بھی تو مجھے کھونے نہیں دیتیں  
صدیوں سے جاگتے لمحے  
چپکے سے کہتے ہیں میرے کان میں آکر  
بدلتے موسموں میں  
انتظار کی اس شدت سے  
کوئی بے خبر تو نہیں

ناہید غفور: کی ڈائری سے ایک انتخاب  
”ساون“  
ساون کا پہلا قطرہ جب مجھ کو بھگوتا ہے  
تو میں کیف مستی میں ڈوب جاتی ہوں  
اتنی مدہوش، اتنی بے خود ہو جاتی ہوں  
کہ بارش کی اک اک بوند  
مجھے چھو کر تیری داستان سناتی ہے  
تب میرا روم پر دم مہک اٹھتا ہے  
میرے گرد روشنی کا بالہ سا بن جاتا ہے  
کچھ ادھورے لفظ  
ٹوٹی چوڑیاں  
شوخی لہجے کی کھنک

سب یاد آتا ہے، سب اچھا لگتا ہے  
تب ساون کی یہ بوندیں  
آنکھیں جل بھل کر جاتی ہیں  
مجھ کو پاگل کر جاتی ہیں

ضویا آصف: کی ڈائری سے ایک نظم  
”پکارے اپنا پاکستان“  
لوگو!

دیس پکارے آج  
گھر آگن کو سجانا ہوگا  
ماتھے سورج، آنکھوں تارے  
پوروں دیپ جلا نا ہوگا  
اجیالوں کو آنا ہوگا  
اپنی دھوپ اور اپنی چھاؤں  
اپنے کھیت اور اپنے گاؤں

مریم ماہ منیر: کی ڈائری سے ایک نظم

بارشوں کا موسم  
بارشوں کا موسم اداس نہیں ہوتا  
ہاں اگر دل میں اداسی کا ڈیرا ہو  
تو بارش کا ہر قطرہ دل کو  
اک کپکپ اک درد اک سوز دیتا ہے  
روح کو نشلی کا احساس دیتا ہے  
اور دل میں خوشیوں کا بسیرا ہو  
تو بارش کے ہر قطرے کی زمین پر  
گرنے سے جو صدا سنائی دیتی ہے  
اس صدا کے سنگ دل جھومنے کو کرتا ہے  
تو پھر یہ کیوں کہنا کہ  
بارشوں کا موسم اداس ہوتا ہے

حنانہ حنیف: کی ڈائری سے ایک غزل  
پہلے ہوتا تھا جو انسانوں میں پیار  
وہ الفت کا پیکر انساں اب کیوں نہ رہا  
ہوتے تھے انسان ایک دوسرے کے غمگسار  
وہ ہمدرد و سادھی انسان کیوں نہ رہا  
کیوں کاٹنے لگے انسان ایک دوسرے کی گردنیں  
وہ خوف خدا دل انساں میں اب کیوں نہ رہا  
کیوں پھیلا ہے علم کی روشنی میں جہالت کا اندھیرا  
وہ علم کی شمعیں جلانے والا انساں اب کیوں نہ رہا  
کیوں چل پڑا ہے سلسلہ قتل و غارت گری کا  
وہ امن و امان پھیلانے والا انسان اب کیوں نہ رہا  
کیوں بھول گیا انسان اپنی انسانیت کو  
اشرف المخلوقات کا مرتبہ انسان میں اب کیوں نہ رہا  
شاید کھودیا انساں نے خزانہ علم اپنے آباؤ اجداد کا  
اسی لیے یہ ممکن ہوا کہ انساں انساں کیوں نہ رہا  
کو کب رفیق: کی ڈائری سے ایک نظم

سمجھوتہ  
اگلے موڑ پر ہم تم ساتھی

جب اک دو بجے سے پھڑپھڑیں گے  
سارے خواب اپنے سہانے  
ساری باتیں سارے وعدے  
ہم آدھے آدھے کر لیں گے  
اپنے اپنے حصے کے پھر  
اس انمول خزانے کو  
بنتے لب اور دکھتے دل سے  
اشکوں میں بہا دیں گے  
پاسینوں میں دفن دیں گے  
پھر جب جیون کے رستے میں  
اک دو بجے کا سامنا ہوگا  
باتھ ملا کے دامن بچا کے  
ہم اپنی راہ پر ہو لیں گے  
تم اپنی دنیا میں خوش رہنا  
ہم تم کو یاد نہ آئیں گے

اسماء بدر: کی ڈائری میں تحریر پروین شاکر کی نظم  
وہ جو ایک خواب سی رات تھی  
میرے بخت میں  
یونہی اک پل میں گزر گئی  
وہ گزر گئی تو پتہ چلا  
وہی ایک کام کی چیز تھی  
میری زندگانی کے رفت میں  
نادیہ الیاس شیخ: کی ڈائری سے پروین شاکر کی

ایک نظم  
تیرا کہنا مجھے تسلیم ہے  
میں مانتی ہوں  
اس نے میری ذات کو بے حد نوازا ہے  
خدائے بزرگ و برتر کے سامنے  
میں بھی دعا گو ہوں، سر اپا شکر ہوں  
اس نے مجھے اتنا بہت کچھ دے دیا لیکن  
تجھے دے دے تو میں جانوں!!!



## حنا کی محفل

عین غین

کنول فریاد حسین ----- جلاپور جٹاں  
س: السلام علیکم! کیا پہلی دفعہ حاضری کی اجازت ہے؟

ج: وعلیکم السلام خوش آمدید اس میں اجازت والی کیا بات ہے۔

س: میں آپ سے کیا سوال پوچھوں؟  
ج: جو دل میں آئے۔

س: کیا آپ کو میری آمد اچھی لگی؟  
ج: بری بھی نہیں لگی۔

س: اچھا اب اجازت چاہوں گی؟  
ج: اللہ حافظ۔

س: آپ کو سوالوں کے جواب دینا کیسا لگتا ہے؟  
ج: اچھا بلکہ بہت ہی اچھا۔

س: ہر گھڑی ہے حادثوں کا ایک نیا ہی سلسلہ لڑکھڑائی خواہشوں کا، کارواں ہے زندگی

ج: کچھ لمبے گزارنے ہیں ہمیں کچھ لمبے گزارہ کرتے ہیں کچھ زندگی گزارنی ہے ہمیں کچھ زندگی سے ہم گزارہ کرتے ہیں

محمد ندیم ساجد کھوکھر ----- پاکپتن شریف  
س: تمہاری یاد آتے ہی نکل پڑتے ہیں آنسو یہ وہ برسات ہے جس کا کوئی موسم نہیں ہوتا

ج: جنہوں نے ہمارے بھی نہیں دیکھی ہوئی عمر بھر ایسوں کو تو چھوٹی سی اک مات رلا دیتی ہے

س: یادوں کی باتوں کا یقین کر لیا میں بھولوں میں چھپا ہوا خیر نہیں دیکھا

ج: محبتیں تو فقط انتہا میں ملتی ہیں محبتوں میں بھلا اعتدال کیا کرنا

س: جانے والے کو بھلا کون روک سکا ہے تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں ہے

ج: اس نے روکا بھی نہیں

اور میں ٹھہرا بھی نہیں  
س: اچھا ہوا جو راہ میں ٹھوکر لگی ہمیں

ہم گر پڑے تو سارا زمانہ سنبھل گیا  
ج: راستے بھر کی رفاقتیں بھی بہت سے اے دوست

ورنہ منزل پہ پہنچ کر کون کس کا آشنا  
س: ہم نے تجھ کو لاکھ پکار لیکن تم خاموش رہے

آخر ساری دنیا سے ہم تیرے بہانے روٹھ گئے  
ج: آپ کے ہوتے ہوئے کس چیز کی خواہش کریں

آپ کے ہوتے ہوئے دونوں جہاں موجود ہیں  
سعدیہ رحیم ----- ملتان

س: جنگل میں مورنا چاکس نے دیکھا؟  
ج: بھلا کس میں اتنی ہمت ہوگی کہ وہ مور کو ناچتا

دیکھنے کے لئے جنگل کا رخ کرے۔  
س: یہ شوہر لوگ کب شادی شدہ ہوتے پر

پچھتاتے ہیں؟  
ج: جب سامنے والی کھڑکی کھلے اور بند ہونے

لگے۔  
س: عقل بڑی یا بھینس؟

ج: بھینس کیونکہ وہ اپنے فائدے کے لئے دودھ بھی خالص نہیں دیتی۔

لائیہ رضوان ----- فیصل آباد  
س: انسان کن لحات میں چونک اٹھتا ہے؟

ج: جب کسی حسینہ سے ٹکرا جائے۔  
س: لوگ خوبصورت چہروں کو چاند سے کیوں

تشبیہ دیتے ہیں سورج سے کیوں نہیں؟  
ج: چاند رات کے وقت جو نکلتا ہے۔

س: یہ دنیا والے شکل صورت اور پیسے پر کیوں مرتے ہیں؟

ج: صرف پیسے پر کہیں، شکل صورت تو بعد کی

بات ہے۔

س: جب خواب ہی چکنا چور ہو جائیں تو کیا کرنا چاہیے؟

ج: خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔  
شاہ زیب احسن ----- سرگودھا

س: کوئی کہتا ہے محبت زندگی ہوتی ہے اور کوئی اسے روگ کہتا ہے؟

ج: شادی سے پہلے زندگی اور بعد میں روگ بن جاتی ہے۔

س: کنوارے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ شادی شدہ فرار چاہتے ہیں؟

ج: یہ بور کے لذت جس نے کھائے وہ بھی پچھتاوے جس نے نہ کھائے وہ بھی پچھتاوے۔

س: عشق خلل ہے دماغ کا کہاں تک ج ہے؟  
ج: سنا تو میں نے بھی ہے۔

س: لوگ اپنی اوقات جلد ہی کیوں بھول جاتے ہیں؟

ج: کیونکہ ان کی گھڑی خراب ہو چکی ہوتی ہے۔  
مس رانا ----- ساہیوال

س: میں کسی کو تلاش کرتے کرتے خود کھو گئی ہوں کیا کروں؟

ج: مجھے تو تم پر ترس آرہا ہے۔  
س: میں بہت کمزور ہوں۔ ذرا صحت مند ہونے

کا راز بتائیں؟  
ج: پہلے اپنی سوچوں سے باہر تو نکلو۔

س: انسان کو خوشی میں کچھ یاد نہیں رہتا مگر دکھ میں فوراً یاد آ جاتا ہے؟

ج: خدا کے ساتھ ساتھ ماں بھی تو یاد آ جاتی ہے۔

س: ذرا میرے کان میں جلدی سے بتا دو میں تمہاری کیا لگتی ہوں؟

ج: ذرا کان کھول کر سن لو میں تمہارے چکروں میں آنے والا نہیں ہوں۔

ام ایمن ----- چارسدہ پشاور

س: عین غین جی محبت میں لوگ دیوانے کیوں ہو جاتے ہیں؟

ج: یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ آج کل لوگ کام نکال کر کہتے ہیں تو کون اور میں کون۔

س: کہتے ہیں کہ جدائی کیسی بھی ہو بری ہوتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: میں کون ہوتا ہوں اسے جھٹلانے والا۔  
س: شادی کے بعد بیوی کی پہلی خواہش؟

ج: بس میرے لئے دنیا تیاگ دو۔  
نازیہ زبیر ----- جہلم

س: وعدہ کیا ہے تو نبھانا بھی سیکھو؟  
ج: وعدے کے مطابق جواب تو دے رہا ہوں۔

س: دل کا دریا چھلک پڑے تو؟  
ج: آنکھیں کس لئے ہیں۔

س: پیچھی اور پردیسی کے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں؟

ج: دونوں ہی اڑ جاتے ہیں۔  
س: دل لینا آسان ہے یا دل دینا؟

ج: کام دونوں ہی مشکل ہیں۔  
نور انور ----- پاکپتن

س: اگر پیار سے پیار لکرا جائے تو؟  
ج: جو توں میں دال بننے لگ جاتی ہے۔

س: میں آپ کو کب یاد آتی ہوں؟  
ج: جب تمہارے بے تگے سوالوں کے جواب

دیتا ہوں  
س: دال میں کچھ کا اے کیا خیال ہے؟

ج: مت پکاؤ ایسی دال کس نے کہا ہے۔  
س: خوش و خرم زندگی گزارنے کا راز بتائیں؟

ج: کسی کی بات پر کان نہ دھرو۔  
س: اگر آپ کے آگن میں چاند اتر آئے؟

ج: ہم ایسے خوش قسمت کہاں۔  
☆☆☆



## خاموش رہو؟

جگن کاظم کا فلمی سفر شروع ہوا پہلی فلم ”خاموش رہو“ کا رزلٹ ایسا تھا کہ اگر جگن اپنے فلمی فیوچر کے بارے میں کچھ کہنا چاہے تو زوردار آواز میں کہنا چاہیے پلیئر خاموش رہو، مگر اعتماد سے مالا مال جگن کو فلم کی ناکامی سے کوئی فرق نہیں پڑا اور وہ چپ چاپ اپنی دوسری فلم ”چپ“ کی تیاریوں میں لگ گئی، پہلی کی طرح دوسری بار بھی جگن سے شان ہی روماس کرتا نظر آئے گا، اپنی دونوں فلموں کے ٹائٹل کے برعکس جگن نہ تو خاموش رہتی ہے اور چپ چاپ دوسروں کی سنتی ہے بلکہ وہ خوب بولتی ہے جیسا کہ اس نے کہا کہ اگر لولی ووڈ کو بچانا ہے تو ہمیں بالی ووڈ، ہالی ووڈ کے چکر سے بچنا ہوگا ہمیں یہ سوچ کر کام کرنا ہوگا کہ ہمیں اپنی فلم انڈسٹری کو بچانا ہے۔

جگن کی ان باتوں کے بعد کہنے کے لئے خاموشی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

## ٹوٹی کہاں کمند

فنکار ہو یا کھلاڑی وہ اپنے ملک اور قوم کا سفیر ہوتا ہے لوگ اس کو آئیڈل سمجھ کر اس جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں وہ کوئی بھی اچھا یا برا کام کرے ان کے چاہنے والوں پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے، کچھ دن پہلے پاکستانی فلم انڈسٹری کی شہرت یافتہ فنکارہ عتیقہ اودھو کے سلسلے میں جو خبر سامنے آئی اس نے نہ صرف عتیقہ کے مداحوں کو بلکہ شوہر سے وابستہ ہر شخص کو ہلا کر رکھ دیا، یہ سب اس وقت ہوا جب انیر پورٹ پر معمول کی چیکنگ کے دوران عتیقہ کے سامان سے شراب کی بوتل برآمد ہوئی، عتیقہ اودھو نے بھی حال ہی میں یرویز



## جیسا دیس

وینا ملک کی مثال ان لوگوں جیسی ہے جو شہرت کے لئے کچھ بھی کر گزرتے ہیں، بگ فور سیزن چونکہ پاکستان میں دیکھا گیا تھا، اس لئے ملک کے کونے کونے میں وینا ملک کا نام روشن ہوا، لیکن جس چینل کے لئے وینا نے ورلڈ کپ کے دوران پروگرام کیا اس کی نشریات پاکستان میں نہیں دکھائی جاتی، ورنہ اس بار تو وینا نے بگ باس میں بولڈس کا اپنا بنایا ریکارڈ خود ہی توڑ ڈالا تھا یہی نہیں بھارت کے ایک میگزین جرنل شوٹائم کے ٹائٹل پر وینا تو دیکھ کر خود بہاشا جیسی اداکارائیں بھی دنگ رہ گئیں لیکن اس وینا ملک اپنے کارناموں پر بے حد خوش دکھائی دیتی ہے کیونکہ ان کارناموں کی بدولت بولی ووڈ میں کا ملنے کا چانس بڑھ گیا ہے اور وینا ملک جیسا دیس ویسا بھیس کے محاورے پر خوب سرگرم عمل ہے۔

اب وہ پاکستان واپس آ کر کیا بیان داغتی ہے اس کے لئے وینا کے دورہ پاکستان کا انتظار کرتے ہیں۔

کی صلاحیتیں کسی گنتی میں نہیں آتیں، مگر جو نصیب کی کھائے اس سے کوئی نہیں چھین سکتا، کامیاب ماڈلنگ کے بعد تاثرات سے عاری اس ماڈل کو سلاخیں جیسی بڑی فلم کا ہیرو بنا دیا گیا، اس کے بعد بھی کچھ ناکام فلموں میں نظر آنے کے بعد احمد بٹ کو کچھ عقل آ ہی گئی کہ شوہر میں رہنے کے لئے اب بیگم خمیر ارشد کا سہارا نا کافی ہے چنانچہ کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا اور یہی کچھ کرنے کے چکر میں احمد بٹ گلوکار بننے جا رہے ہیں اور گلوکاری سکھائیں گی بیگم خمیر ارشد جس نے گلوکاری سکھاتے سکھاتے بہت سے گانے والوں کو سیدھا کیا اور اب باری ہے میاں احمد بٹ کی جس کا کہنا ہے کہ بیگم سے سیکھنے میں ڈانٹ بہت کھانا پڑی ہے۔

احمد بٹ جب بیوی کماؤ بھی ہو اور خوبصورت بھی تو شوہر کو ڈانٹ ہی نہیں اور بھی بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

☆☆☆



مشرف کی سیاسی جماعت آل پاکستان مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی تھی اور اس کا شمار کسی معمولی کارکن میں نہیں ہوتا، جماعت میں اسے ایک اہم حیثیت حاصل ہے مگر اس واقعہ نے عتیقہ اودھو کی شہرت کو شدید دھچکا لگایا ہے اور سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ عتیقہ کی پارٹی نے اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کی، حالانکہ اس نازک موقع پر جماعت کو بھرپور انداز میں عتیقہ کا ساتھ دینا چاہیے تھا، چاہے واقعہ سچا ہے یا پھر عتیقہ کسی سیاسی سازش کا شکار ہوئی ہے، کیونکہ عتیقہ جیسی ہوشیار اور سمجھدار اداکارہ سے اس قسم کی غلطی کا امکان؟ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔

## ڈانٹ میں بھی مزہ ہے

احمد بٹ کی تصویر بہت اچھی ہے اچھے مسلز کے ساتھ شوہر میں وارد ہونے والے اس فنکار کے پاس اس کے سوا کچھ نہ تھا ماڈلنگ کرنے کے لئے جی فیس ایکسپیریشن کیس ماڈل پلس ایکٹر



# حنا کا دسترخوان

شمیہ احتشام

قیمہ بھرے آلو

اشیاء  
قیمہ  
آلو  
نمک مرچ  
پیاز  
نار دانہ  
گھی  
بیسن  
ترکیب

آلوؤں کو اوپر سے تراش لیں، اب تیز چاقو کی نوک سے اس کا اتنا گودا نکال لیں کہ آلو کی یواریں موٹی رہیں اب پیاز سرخ کریں، جب پیاز سرخ ہو جائے تو نمک مرچ ڈال کر قیمہ اچھی طرح بھون لیں، اب قیمہ میں پانی ڈالیں جب فی خشک ہو جائے تو قیمہ بھون کر اتار لیں۔  
اب آلو جو پہلے سے کھوکھلے کیے ہوں ان میں قیمہ بھر دیں اور آلو کا منہ بیسن سے بند کر دیں، بیسن صرف آلو کے منہ پر لگانا ہے تاکہ قیمہ نکل سکے۔

اب علیحدہ کڑاہی میں گھی گرم کریں اور آلو ل کر تیل لیں، جب آلو سرخ ہو جائیں تو اتار لیں، اب سلا د کے ساتھ پیش کریں۔

مصالحے دار مرچیں

نیاء  
مرچیں بڑی  
بلی پنے

چھ عدد  
دو کھانے کے چمچے

پیاز

تھن

ادرک

ہری مرچ

برادھنیا

ہلدی پس ہوئی

لال مرچ

نمک

گھی

ترکیب

مرچوں کو دھو کر لمبائی میں خشکاف ڈال دیں، کالی چٹوں کو دو تین گھنٹوں تک پانی میں بھگوئے رکھیں، پیاز باریک کاٹ لیں لہسن، ادرک، ہری مرچ، برادھنیا، ہلدی، لال مرچ اور نمک ملا کر پیس لیں، پیاز چنے اور مصالحہ ملا کر تھوڑے سے گھی میں تلیں، اس مصالحے کو مرچوں میں بھر دیں، گھی گرم کر کے اس میں مرچیں رکھیے اور ہلکی آگ پر ڈھک کر پکائیں۔  
تھوڑا سا پانی کا چھینٹا بھی دیں، جب مرچیں گل جائیں تو تھوڑا سا گھی اور ڈال کر مرچوں کو تیل لیں۔

چکن رول

اشیاء

مرغ کا گوشت

گھی

انڈے

آلو

کالی مرچ پس ہوئی

دو عدد

چار جوئے

ایک انچ کا ٹکڑا

چھ سات عدد

ایک چھوٹی گڈی

پاؤ چائے کا چمچ

پاؤ چائے کا چمچ

حسب ذائقہ

دو کھانے کے چمچے

آدھا کلو

ایک پاؤ

دو عدد

آدھا پاؤ

حسب ذائقہ

سرخ مرچ

ایل روئی کا چورا

نمک

ترکیب

گوشت کے ٹکڑے کو کانٹے سے چھید کر اس پر نمک مرچ کالی مرچ مل دیں آلوؤں کو ابال کر پیس لیں، ایک صاف ستھرے کاغذ پر گھی لگا کر مصالحہ لگا گوشت اس پر رکھ دیں اور پے ہوئے آلوؤں میں نمک مرچ ملا کر گوشت کے ٹکڑے کو پلیٹ لیں اور رول بنا کر کچھ دیر کے لئے فریج میں رکھ دیں، جب رول سخت ہو جائے اسے نکال کر آدھا انچ موٹے ٹکڑے تیز چھری سے کاٹ لیں، ڈبل روئی کا چورا اور انڈا لگا کر گھی میں تلتے جائیں سرخ ہونے پر اتار لیں۔  
لنڈیز چکن رول تیار ہیں۔

انڈوں کے پکوڑے

اشیاء

بیسن

نخت ابلے انڈے

نمک، مرچ

آدھ (کالا)

ایک پاؤ ڈر

گھی

کالی مرچ

ترکیب

بیسن میں نمک، مرچ، بیلنگ پاؤ ڈر، کالی مرچ (پس ہوئی) اور زیرہ ملا کر تھوڑا سا پانی ڈال کر خوب پھینٹیں، آمیزہ درمیانہ سا ہو یعنی نہ سخت نہ ہلکا، آمیزہ زیادہ نرم، اب ابلے انڈوں کو چھیل کر گول قتلے کاٹ لیں پھر فرانی پین یا کڑاہی میں گھی گرم کر لیں اور انڈے کے قتلوں کو بیسن میں بوڑبو کر گھی میں مل لیں، اس لئے آپ ہلکے سرخ

ہونے پر نکال لیں لیکن کچے نہ ہوں، انڈوں کے گرم گرم پکوڑے آپ چائے کے ساتھ نوش کریں یا مہمانوں کی تواضع کے لئے پیش کریں۔

انڈے کا رول

اشیاء

میدہ

انڈے

دودھ

نمک

گھی

قیمہ پکا ہوا

بیلنگ پاؤ ڈر

ترکیب

میدہ، نمک اور بیلنگ پاؤ ڈر چھان کر اس میں دو انڈے پھینٹ کر شافل کر دیں، گھی دو (چھوٹے) چمچ ڈال کر خواب ملا لیں پھر تھوڑا تھوڑا دودھ ڈال کر میڈے کے آمیزے کو روئی پکانے کے قابل کوندھ لیں پھر آمیزے کا پیڑہ (ایک پاؤ) بنا کر روئی تیل لیں اور فرانی پان میں مل لیں، (ایک طرف سے) لیکن خیال رہے کہ روئی کو مکمل طور سے نہ تلیں بلکہ کچھ چارہ بنے دیں پھر نکال لیں، باقی انڈوں کا آلیٹ بنا کر اور قیمہ کو اچھی طرح آپس میں ملا دیں، روئی یا میڈہ کے تیلے ہوئے حصے پر انڈے اور قیمہ کا آمیزہ درمیان میں لمبائی سے رخ سے ڈالیں پھر روئی کو ایک طرف سے چپکا کر رول کرتی جائیں، آخر میں دوسری جانب سے بھی میڈہ لگا کر بند کر دیں، اب رول کو دوبارہ فرانی پین میں موجود گھی میں مل لیجئے، مزیدار ایک رول تیار ہے، اب آپ حسب پسند ثابت یا گول گول رول قتلے کر کے نوش فرمائیں۔

پالک کے پکوڑے



اشیاء

پالک

بنیں

نمک

مرج

دھنیا (ثابت)

میٹھا سوڈا

کالی مرچ (پسی ہوئی)

پیاز (باریک کٹی ہوئی)

پہاڑی مرچ (باریک کٹی ہوئی) ایک عدد

ترکیب

ایک پاؤ

ایک پاؤ

حسب ذائقہ

حسب ذائقہ

دو چمچے

آدھا چمچ

ایک چمچ

حسب ضرورت

ایک عدد

ایک عدد

اشیاء

بنیں

سرخ مرچ

نمک

زیرہ سفید

لہسن

پیاز

دھنیا سبز

پودینہ

سیاہ مرچ

انڈہ

عمدہ دہی

ترکیب

ایک پاؤ

حسب ذائقہ

حسب ذائقہ

ایک تولہ

ایک بڑی پوتھی

دو چھٹانک

دو تولے

دو تولے

دو ماشے

ایک عدد

ایک کلو

ترکیب

پیاز کو باریک تراش لیجئے اور تمام چیزوں کو

باریک پیس کر بنیں میں ملا لیجئے اور پانی ڈال کر

بنیں کو اس قدر پھینٹ لیجئے کہ سفید ہو جائے

پیاز بھی ڈال دیجئے اور دہی یا تیل میں پھلکیاں

تلیں، پانی میں تھوڑا سا نمک ڈال کر پہلے پاس رکھ

لیجئے اور پھر پھلکیوں کو کڑھائی سے نکال کر پانی

میں ڈالیے، جب سب پھلکیاں ملی لیں تو پانی سے

نکال کر انہیں نچوڑ کر دہی میں ڈال دیجئے،

ضرورت ہو تو مزید نمک اور سرخ مرچیں پیس کر

چھڑک لیجئے۔

آلو کی کچوریاں

اشیاء

آلو

اور چھلکا اتار کر بھرتہ بنالیں

پیاز

سبز کٹی ہوئی

ہر ادھنیا

کٹا ہوا

ہری مرچ

آدھا کلو (اہال لیں)

ایک عدد (درمیانہ)

ایک گھٹی (باریک)

چار عدد

لال مرچ

کالی مرچ (پسی ہوئی)

لیموں

نمک

آٹا

گڑ

میں اہال کر شیر بنالیں

اجوائن

گھی یا تیل

ترکیب

آٹے میں گڑ کا شیر، اجوائن، سوڈا اور نمک

ملا کر نرم گوندھ لیں، مزید پانی ملا کر آٹے کو نرم

کریں، جتنا نرم ہو گا کچوریاں اتنی ہی خستہ بنیں

گی، آلو کے بھرتے میں سارے مصالحے اور

لیموں کا رس ملا دیں چوبیس لہجے پر کڑا ہی میں تیز آج

پر تیل گرم کریں، جتنی دیر میں تیل گرم ہو، پوری

کے پیڑے کے برابر آٹا لے کر پانی سے ہاتھ گیلا

کر کے پیڑے کو ہاتھ پر پھیلائیں پھر اس میں

مصالحے ملے ہوئے تھوڑے سے آلو رکھ کر دوبارہ

ہاتھ گیلا کر کے چاروں طرف سے اٹھا کر بند کر

دیں، گیلے ہاتھ سے ذرا سا دبا کر دوبارہ پھیلا

لیں، پھر ہلکی آج پر تلنا شروع کر دیں، جب اچھی

طرح مل جائے تو نکال کر پلیٹ میں اخبار بچھا کر

رکھ دیں تاکہ تیل اچھی طرح جذب ہو جائے۔

پھلوں کی فرنی

اشیاء

کیلے

ناشیاتی

سنگترے

سبب

شکر قند

کنو

شکر

تین عدد

ایک عدد

دو عدد

ایک پاؤ

ایک پاؤ

دو عدد

حسب ذائقہ

ایک چائے کا چمچ

آدھا چائے کا چمچ

چار عدد

حسب ذائقہ

آدھا کلو

ایک چھوٹا کٹرا (پانی)

چوتھائی چائے کا چمچ

حسب ضرورت

ترکیب

آٹے میں گڑ کا شیر، اجوائن، سوڈا اور نمک

ملا کر نرم گوندھ لیں، مزید پانی ملا کر آٹے کو نرم

کریں، جتنا نرم ہو گا کچوریاں اتنی ہی خستہ بنیں

گی، آلو کے بھرتے میں سارے مصالحے اور

لیموں کا رس ملا دیں چوبیس لہجے پر کڑا ہی میں تیز آج

پر تیل گرم کریں، جتنی دیر میں تیل گرم ہو، پوری

کے پیڑے کے برابر آٹا لے کر پانی سے ہاتھ گیلا

کر کے پیڑے کو ہاتھ پر پھیلائیں پھر اس میں

مصالحے ملے ہوئے تھوڑے سے آلو رکھ کر دوبارہ

ہاتھ گیلا کر کے چاروں طرف سے اٹھا کر بند کر

دیں، گیلے ہاتھ سے ذرا سا دبا کر دوبارہ پھیلا

لیں، پھر ہلکی آج پر تلنا شروع کر دیں، جب اچھی

طرح مل جائے تو نکال کر پلیٹ میں اخبار بچھا کر

رکھ دیں تاکہ تیل اچھی طرح جذب ہو جائے۔

پھلوں کی فرنی

اشیاء

کیلے

ناشیاتی

سنگترے

سبب

شکر قند

کنو

شکر

عرق گلاب یا کیوڑہ

پستے، بادام، شمش

ترکیب

ناشیاتی اور سیب کے ٹکڑے کر لیں، سب

پھلوں کو دھونے کے بعد چھیل کر ہاتھ سے مسل کر

دودھ میں ڈال دیں اور دھیمی آگ پر رکھ دیں،

دبکنے کے بعد شکر ڈال کر ملا لیں، اتارنے سے

پہلے عرق گلاب یا کیوڑہ ڈال کر اتار لیں، پلیٹ

میں ڈالنے کے بعد ورق لگا کر بادام اور لے

باریک کاٹ کر ڈال دیں، ٹھنڈی ہونے پر پیش

کریں، خوش ذائقہ فرنی تیار ہوگی۔

امرود کی جیلی

اشیاء

امرود

چینی

لیموں کا رس

ترکیب

امرود چھیل کر موٹے موٹے ٹکڑے کر

لیں۔ دہی میں اتنا پانی ڈالیں کہ اس میں

سارے امرود کے ٹکڑے ڈوب جائیں، اب

اسے اتنا پکا میں کہ امرود گل جائیں پھر باریک

کپڑے میں اس آمیزے کو باندھ لیں، نیچے

برتن رکھیں تاکہ رس ٹپک کر اس میں جمع ہو جائے

حاصل ہونے والے رس میں چینی ملا کر چوبیس لہجے پر

چڑھا دیں، ایک اہال آجائے تو اس میں لیموں کا

عرق شامل کر لیں، ہر اہال پر جھاگ چمچے سے

اتار لی جائیں جب گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں،

ٹھنڈے ہونے پر جیلی تیار ہے۔

☆☆☆



## کس قیامت کے یہ نامے

فوزیہ شفیق

الغرض حنا ایک معیاری ڈائجسٹ ہے، اسکی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، اس کی تقریباً ہر کہانی ایسی ہوتی ہے جسے پڑھ کر سبق حاصل ہوتا ہے، فریدہ جاوید فرنی کی بیماری کا جان کر دکھ ہوا، اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔

سیما انصار اس محفل میں پہلی مرتبہ تشریف لائی ہیں خوش آمدید حنا کی تحریروں کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کا افسانہ مل گیا ہے قابل اشاعت ہوا تو انشاء اللہ ضرور شائع ہوگا آئندہ بھی آپ کی محبتوں اور تحریروں کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

عبارت کاظمی: ذریعہ اسماعیل خان سے لکھتی ہیں۔

جولائی کا شمار بے حد پسند آیا احمد و نعت پڑھ کر انشاء نامہ سے لطف اندوز ہو کر ہلیدی سے اپنے پسندیدہ ناول ”میرے ساحر سے کہو“ کی طرف بڑھے صد شکر کہ رائیل کو ”قل آئی، آئی“ پریشے کو مت ماریے گا اور اب طارق کی انا کو قسم کر دیں، فوزیہ غزل کا ناول ”وہ ستارہ صبح امید کا“

بہت اچھا ہے، ”محبتوں میں حساب کیسا؟“ مدیجہ آئی کی بلاشبہ ایک زبردست تحریر ہے، سندس جنہیں نے بھی بہت اچھا لکھا اس دفعہ حنا کی جان مبشرہ ناز کا ناولٹ ”عین سے عورت“ تھا ”لاج“

سب اس گل واقعی لڑکیوں کو گھر چھوڑتے ہوئے اپنے والدین کی عزت کا ضرور سوچنا چاہیے، مستقل سلسلوں میں حاصل مطالعہ، میں سب نے اچھا لکھا، رنگ حنا میں حیدر رضا کا انتخاب لاجواب تھا، آپ سے شکایت ہے کہ آپ تبصرے بہت کم شامل کرتے ہیں۔

عبارت کاظمی اس محفل میں خوش آمدید،

اگست کے شمارے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں، آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور ہمارے اس پیارے وطن کو ہمیشہ خیر و عافیت سے رکھے اور ہماری مشکلات کو دور کرے، آمین۔

آئیے اب آپ کے خطوط کی طرف چلتے ہیں یہ پہلا خط منظر گڑھ سے سیما انصار کا بلا ہے، وہ لکھتی ہیں۔

جولائی کا شمار بے حد پسند آیا، ناول ”میرے ساحر سے کہو“ کی طرف بڑھے صد شکر کہ رائیل کو ”قل آئی، آئی“ پریشے کو مت ماریے گا اور اب طارق کی انا کو قسم کر دیں، فوزیہ غزل کا ناول ”وہ ستارہ صبح امید کا“ بہت اچھا ہے، ”محبتوں میں حساب کیسا؟“ مدیجہ آئی کی بلاشبہ ایک زبردست تحریر ہے، سندس جنہیں نے بھی بہت اچھا لکھا اس دفعہ حنا کی جان مبشرہ ناز کا ناولٹ ”عین سے عورت“ تھا ”لاج“ سب اس گل واقعی لڑکیوں کو گھر چھوڑتے ہوئے اپنے والدین کی عزت کا ضرور سوچنا چاہیے، مستقل سلسلوں میں حاصل مطالعہ، میں سب نے اچھا لکھا، رنگ حنا میں حیدر رضا کا انتخاب لاجواب تھا، آپ سے شکایت ہے کہ آپ تبصرے بہت کم شامل کرتے ہیں۔

عبارت کاظمی: ذریعہ اسماعیل خان سے لکھتی ہیں۔

جولائی کا شمار بے حد پسند آیا احمد و نعت پڑھ کر انشاء نامہ سے لطف اندوز ہو کر ہلیدی سے اپنے پسندیدہ ناول ”میرے ساحر سے کہو“ کی طرف بڑھے صد شکر کہ رائیل کو ”قل آئی، آئی“ پریشے کو مت ماریے گا اور اب طارق کی انا کو قسم کر دیں، فوزیہ غزل کا ناول ”وہ ستارہ صبح امید کا“

بہت اچھا ہے، ”محبتوں میں حساب کیسا؟“ مدیجہ آئی کی بلاشبہ ایک زبردست تحریر ہے، سندس جنہیں نے بھی بہت اچھا لکھا اس دفعہ حنا کی جان مبشرہ ناز کا ناولٹ ”عین سے عورت“ تھا ”لاج“ سب اس گل واقعی لڑکیوں کو گھر چھوڑتے ہوئے اپنے والدین کی عزت کا ضرور سوچنا چاہیے، مستقل سلسلوں میں حاصل مطالعہ، میں سب نے اچھا لکھا، رنگ حنا میں حیدر رضا کا انتخاب لاجواب تھا، آپ سے شکایت ہے کہ آپ تبصرے بہت کم شامل کرتے ہیں۔

عبارت کاظمی اس محفل میں خوش آمدید،

سرخ مرچ  
لوگ  
کالی مرچ  
سبز الائچی  
ہرا دھنیا  
گھی یا تیل  
سفید زیرہ  
کھانے کا سوڈا  
لہسن  
ترکیب

ٹھوڑے سے تیل میں ایک پیار فرائی کریں اور اس میں قیمہ شامل کر دیں، لہسن اور گرم مصالحے پیس کر اور نمک مرچ ڈال کر اتنا پانی ڈالیں کہ قیمہ گل جائے پھر اس میں منٹ تنگ کیجئے دیں، اس کے بعد اچھی طرح بھون کر اتاریں اور اس میں ہرا دھنیا کاٹ کر شامل کر دیں، اب میدہ اور سوڈا چھان کر اس میں تھوڑا سا گھی ڈالیں اور نمک، زیرہ اور پانی ڈال کر گوندھ لیں، پانی آہستہ آہستہ اور تھوڑا ڈالیں تاکہ میدہ گیلانہ ہو، میدہ قدرے سخت رہیں پھر گوندھے گئے میدے کے پیڑے بنالیں اور پوری طرح تیل لیں پھر نوکیلی چھری کی مدد سے درمیان سے کاٹ کر دو حصے کر دیں پھر ایک حصے پر پکا ہوا قیمہ مناسب مقدار میں رکھ کر ٹکونا سموسہ بنالیں، اسی طرح تمام میدہ اور تمام قیمہ کے سموسے بنالیں پھر کڑاہی میں تیل گرم کر لیں اور گنجائش کے مطابق سموسے ڈالتی جائیں اور ہلکے سنہرے ہونے پر نکال لیں، گرم گرم سموسے اٹلی کی چٹنی کے ساتھ نوش فرمائیں، افطار کا مزہ دو بالا ہو جائے گا۔

☆☆☆

چائیز پکوڑے

اشاء  
بند گوتھی  
سبز پیاز  
گاجر  
انڈے  
پیاز  
سبز دھنیا  
سبز مرچیں  
نمک  
میدہ  
چائیز نمک  
کارن فلور  
دکنی مرچ پاؤڈر  
سرکہ  
سویا ساس  
بیلنگ پاؤڈر  
تیل  
ترکیب

تمام سبزیوں کو کاٹ لیں، انڈے پھینٹ کر ان میں میدہ، کارن فلور اور تمام مصالحے ملا لیں، اچھی طرح یک جان کر لیں پھر سبزیاں ملا کر یک جان کر لیں، تیل گرم کر کے پکوڑوں کی طرح دونوں جانب سے فرائی کر لیں۔

قیمے کے سموسے

اشاء  
میدہ  
قیمہ  
پیاز  
دھنیا (پسا ہوا)  
نمک

ڈیڑھ پاؤ  
ایک پاؤ  
ایک عدد  
چائے کا ایک چمچ  
حسب ضرورت



جولائی کے شمارے کی پسندیدگی کا شکریہ، ہم آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔  
فریدہ جاوید فری: لاہور سے لکھتی ہیں۔

حناملا ٹائل اچھا لگا فوزیہ جی حنا کے ٹائل ہمیشہ ہی بے حد اچھے ہوتے ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک اس مرتبہ تو کمال ہی ہو گیا اس قدر بہترین ناول اور افسانے واہ حنا پڑھ کر مزا آ گیا، مکمل ناول ”کچھ خواب دل میں“ صبا جاوید کا دو مرتبہ پڑھا ہے صبا جاوید بھی جونئی ہیں مگر لکھنے کا انداز لفظوں کا چناؤ اور جس طرح انہوں نے لکھا ہے اس طرح کے ناول ہمیں بے حد پسند آتے ہیں اگر ایوارڈ دینا ہوتا تو میں پہلا ایوارڈ ان کو ہی دیتی، ویلڈن صبا جی خوش کر دیا، ان کے افسانوں اور ناول کا بیقراری سے انتظار رہے گا اور ہماری پیاری سی دوست کا افسانہ ”راج“ بھی بے حد پسند آیا، یعنی سب اس گل کا۔

طیبہ ہاشمی کی تحریر تو رسالے کی جان تھی یہ سب رائٹرز اتنا اچھا کیسے لکھ لیتی ہیں، طیبہ جی میں نے پہلے بھی آپ کی تحریریں پڑھی ہیں کمال کا لکھتی ہو ”اک نا تمام خواب“ بہت بہترین، فوزیہ احسان رہنا سے تو ہم واقف ہیں اور کچی اور رسائل میں بھی لکھتی ہیں اور بہت ہی اچھا لکھتی ہیں ”ع سے عورت“ مبشرہ ناز نے بھی خوب لکھا، کس کس کی تعریف کروں، عقیلہ ہاشمی تو لکھتی ہی اچھا ہیں اور مجھے گاؤں کے پس منظر میں لکھنے گئے ناول بہت متاثر کرتے ہیں مزید ار ناولٹ ہے، ”مجھے مکمل کر دو“ سندس جنہیں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

ان افسانے اور ناول تو بے حد شاندار ہوتے ہیں ان کا ناول میں آخر میں شروع ہوں کیونکہ میں شروع ہی سے لکھ رہی ہوں اپنی آخر سے شروع اور اینڈ شروع ہوں یہ میری خامی ہے، مگر میں تو ایسا ہی کہتا ہوں بقول ایک

کزن کے کہ فری تمہاری کون سے کل سیدھی ہے مگر ہم ہیں ہی ایسے غزالہ جلیل راؤ آج کل حنا میں کیوں نہیں لکھ رہی اور سب سلسلے بھی شاندار ہیں۔

فریدہ جاوید فری جولائی کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچانی جا رہی ہیں اپنی رائے اور محبتوں کے ساتھ حنا میں باقاعدگی سے شرکت کرتی رہا کریں شکریہ۔  
ثمینہ شیخ: فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے آپ اور حنا کا تمام شاف بالکل ٹھیک ہونگے۔  
میں ایک بار پھر آپ کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے حنا کے پلیٹ فارم پر مجھے خوش آمدید کہا، آپ کا یہی ساتھ اور یہی حوصلہ افزائی شاید مجھے کسی مقام تک پہنچا دے۔  
گزشتہ ماہ امتحانوں کی مصروفیت کی وجہ سے آپ کو شکریہ کا خط بھی نہ لکھ سکی جس کا مجھے بہت افسوس ہے، اب پھر حاضر ہوں اگر آپ کی محفل میں حاضری لگ جائے تو بڑی مہربانی ہو گی۔

آپی ایک گزارش تھی پچھلے جو بھی میرے افسانے ماہنامہ حنا میں شامل اشاعت ہوئے وہ شمارے میرے پاس نہیں ہیں اگر آپ کے آفس میں ہیں تو پکیز بھجوا دیں شکریہ۔

ثمینہ اس محفل میں خوش آمدید حنا کو پسند کرنے کا شکریہ آپ لکھتے لکھتے کہاں غائب ہو جاتی ہیں جن افسانوں کی آپ نے بات کی ہے ہم معذرت چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے پاس موجود

Scan & PDF  
FIAZ AHMED

Friends Korner.com